ماہنامہ
بیسویں صدی
نئی دہلی
ہندوپاک ادب نمبر ۱۹۸۹ء
کی
خصوصی اشاعت
جنوری
۱۹۸۹ء
20/

ہندو پاک ادب نمبر ۱۹۸۹ء
بیسویں صدی نئی دہلی ۲
ایڈیٹر
ضیاء الرحمن نیّر

ہندو پاک ادب نمبر ۱۹۸۹ء
بیسویں صدی
نئی دہلی
- ایڈیٹر -
ضیاء الرحمن نیّر

ھند و پاک ادب نمبر

اشاریہ

فن اور فنکار

حمد و نعت

انٹرویو

مضامین

نظم، گیت و رباعیات

انشائیے

طنز و مزاح

غزلیں

ھند و پاک ادب نمبر

افسانے

حرفِ اوّل

قارئینِ بیسویں صدی کو نیا سال مبارک

"بیسویں صدی" کا ہند و پاک ادب نمبر ۱۹۸۹ء آپ کے ہاتھوں میں ہے

"بیسویں صدی" کی ۵۲ سالہ ادبی تاریخ میں یہ ایک ضخیم ترین نمبر ہے

دراصل بیشتر قارئین کے پیہم اصرار پر یہ نمبر شائع کیا جا رہا ہے،

قارئین کو یہ شکوہ تھا کہ

"بیسویں صدی" کے خاص نمبروں کے محدود صفحات اُن کے ادبی ذوق کو سیراب نہیں کر پاتے۔

ہمارا ذاتی خیال ہے کہ اردو کے تمام قاری مالی اعتبار سے اتنے ضخیم اور قیمتی نمبروں کے متحمل نہیں ہو سکتے،

اس لیے یہ خصوصی اور ضخیم ——

"ہند و پاک ادب نمبر ۱۹۸۹ء"

"بیسویں صدی" کے بارہ عام شماروں کے علاوہ

تجرباتی طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔

قارئینِ "بیسویں صدی" نے اگر اس سلسلہ کو پسند کیا تو،

ضخیم ترین نمبروں کے اس سلسلہ کو جاری رکھا جائے گا ——

ہمیں قارئین کی آراء کا انتظار ہے!

ادارہ
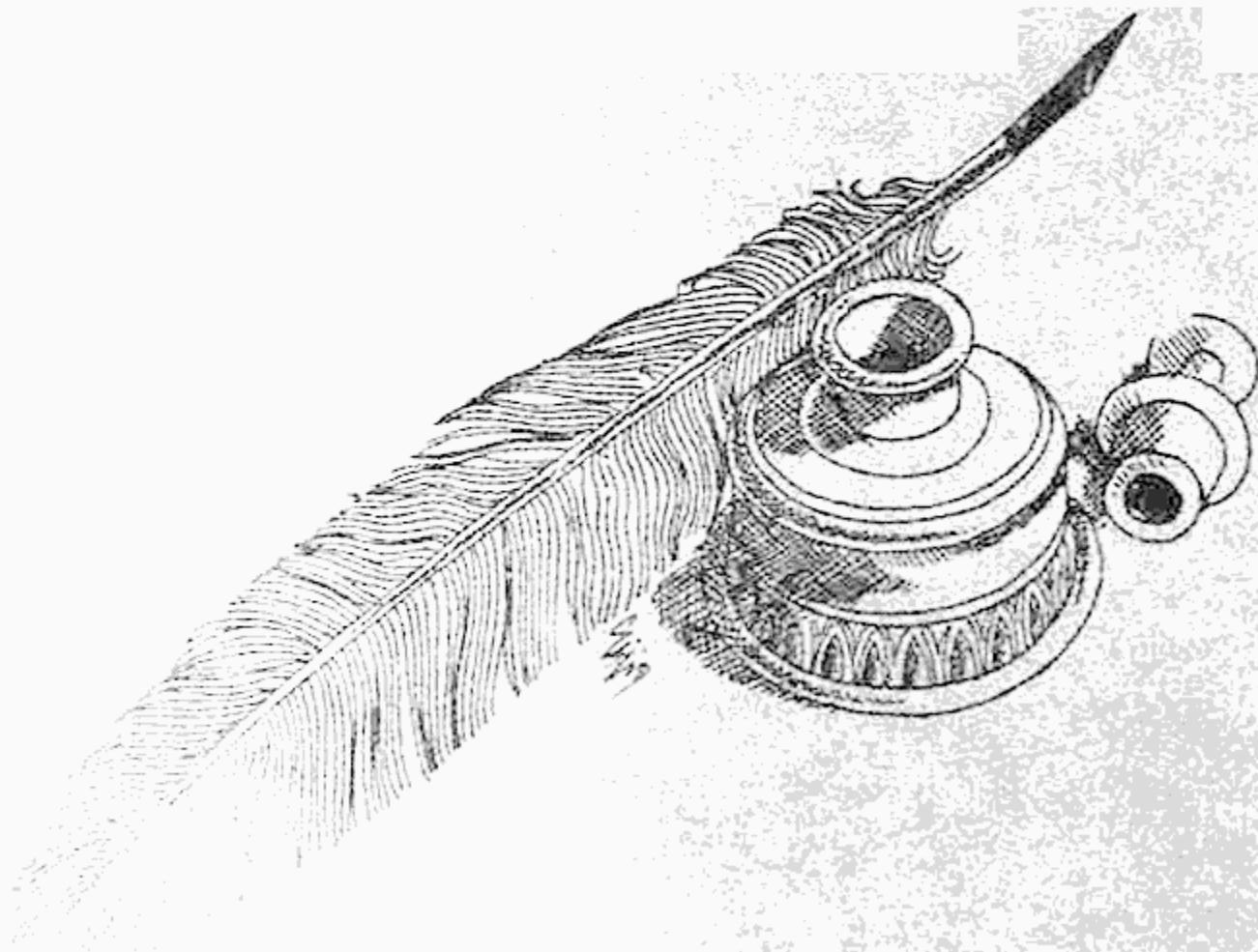
والی آسی
مکتبہ دین و ادب امین الدولہ پارک لکھنؤ ۲۲۶۰۱۸

حمد

★

اُسی کا نغمہ یہاں ہر طرف سنائی دے　　اُسی کا عکس ہر آئینے میں دِکھائی دے

اُسی کی شان کے شایاں ہے ظاہر و باطن　　کبھی وہ چھپ کے رہے اور کبھی دِکھائی دے

جزا سزا کا وہ مالک ہے اُسکی مرضی ہے　　کسے اسیر کرے اور کسے رہائی دے

وہی تو ہے جو پہاڑوں سے برف پگھلائے　　وہی تو ہے جو پرندوں کو خوشنوائی دے

لطیف خوشبوئیں پھولوں کو بخشنے والے　　مجھے بھی حرف عطا کر غزل سرائی دے

میں لکھنا چاہتا ہوں مجھ کو رہنمائی دے　　مرے خدا مجھے تھوڑی سے روشنائی دے

ترے سوا نہ کروں میں کسی کی حمد و ثنا　　مجھے وہ جراتِ اظہار و لب کُشائی دے

وہ روشنی مری آنکھوں کو دے مرے مالک　　کہ پھر کچھ اور نہ ترے سوا دِکھائی دے

سماعتوں کو مری اعتبار دے اِتنا　　مجھے ضمیر کی آواز بھی سُنائی دے

جہاں جہاں کوئی ظالم کسی پہ ظُلم کرے　　وہاں وہاں مری آواز کو رسائی دے

مرے لئے کسی زنجیر کی ضرورت کیا؟
میں چاہتا ہی کہاں ہوں کہ تو رہائی دے

علقمہ شبلی

۸۹/۵ ربن اسٹریٹ، کلکتہ-۱۶-۷۰۰۰

حمد

★

مرے حرفِ دُعا کی ابتدا تو ہے
مری ہر آرزو کی انتہا تو ہے

رُخِ امکاں پہ نقشِ زندگی تیرا
دلِ عرفاں میں رنگِ روشنی تیرا
زمیں تیری، مکاں و لامکاں تیرے
فلک تیرا، زماں ولازماں تیرے
جہاں تیرا ہے، بحروبر بھی تیرے ہیں
فضا تیری ہے، خشک وتر بھی تیرے ہیں
کتابِ زندگی کا ہر ورق تیرا
نصابِ آگہی کا ہر سبق تیرا
حرم تیرا ہے، سجدے تیرے سر تیرا
شعورِ بندگی تیرا ہے، در تیرا
جبیں تیری ہے، تیرا آستاں بھی ہے
یقیں تیرا ہے، تیرا ہی گماں بھی ہے
قلم تیرا، قلم کی ہر انا تیری
شکستہ، نسخ، طغرا ہر ادا تیری
تو ہی اوّل بھی ہے، آخر بھی ہے تو ہی
تو ہی باطن بھی ہے، ظاہر بھی ہے تو ہی
تو ہی صبحِ ازل، شامِ ابد بھی تو
تو ہی نازِ جنوں، رشکِ خرد بھی تو

زبان و نطق سب تیرے، مرا کیا ہے
میں کیا جانوں تیری حمد و ثنا کیا ہے

احمد ظفر

معرفت مقبول احمد دہلوی ۱۲ نسبت روڈ، لاہور پاکستان

حمد

پھول نے لکھا کبھی دستِ صبا نے لکھا
بہتے پانی پہ ترا نام ہوا نے لکھا

آسماں نور ترا، تجھ سے زمیں روشن ہے
حرفِ مہتاب کہ سورج کی ضیا نے لکھا

تو سمندر میں ہے صحرا میں ہے کہسار میں ہے
خامشی نے تجھے دیکھا تو صدا نے لکھا

پھول ہنستے ہیں، مہکتے ہیں بکھر جاتے ہیں
فیصلہ جو بھی لکھا، تیری رضا نے لکھا

ہم گنہگار عنایت کے سزاوار ہوئے
جب مقدر کو ترے حسنِ عطا نے لکھا

محسن بھوپالی

محسن منزل-۴۰، الف ۵/۳ اے ناظم آباد کراچی ۱۸- پاکستان

نعت

★

لازم ہے اس سے پہلے کہ نعتِ نبیؐ لکھوں
جو کچھ لکھا ہے، کچھ نہیں لکھا، یہی لکھوں

ق

پاسِ ادب میں جنبشِ لب کی کہاں مجال
اور شوقِ مدح اس پہ مُصر ہے، ابھی لکھوں
وہ کائناتِ علم ہیں، وہ عِلمِ کائنات
منجملۂ صفات لکھوں تو یہی لکھوں

جو اُن سے آشنا ہُوا، حق آشنا ہُوا
آگاہیٔ نبیؐ کو خدا آگہی لکھوں
یارب عطا وہ ذہنِ رسا ہو کہ نعت میں
جو ماورائے فکر ہے، وہ بھی کبھی لکھوں
اس جزوِ نورِ کل سے ہے تابندگی تمام
میں کیوں نہ اس کے سائے کو بھی روشنی لکھوں

سید قیصر محمود

پوسٹ بکس نمبر ۳۳۵۳ - مسقط، سلطنت عمان

نعت

وہ جس کی راہ میں گل کم تھے اور خار بہت اسی کے دونوں جہاں میں ہیں اختیار بہت

سلام کرنے میں کرنا تھا جو پہل اس پر سلام بھیجنے والے ہیں بے شمار بہت

وہ جس کی لاکھوں دلوں پر ابھی حکومت ہے تھا اس کی فطرتِ عالی میں انکسار بہت

جو بیٹھ جاتا تھا محفل میں جاکے آخر صف سب انبیاؑ میں وہ ہادی ہے ذی وقار بہت

نہ پہونچے ہانڈی جو ہمسایہ یہودی کو یہ بات ہوتی رسالتؐ کو ناگوار بہت

اسی کے کہنے پہ ہم نے خدا کو مانا ہے کہ اس کی بات کا ہم کو ہے اعتبار بہت

درِ بہشت پہ رضواں سے بس یہ کہہ دینا کہ میرے تھوڑے عمل کو کرے شمار بہت

وہ اہلِ دل کہ جو اس کو عزیز رکھتے ہیں ہیں اصطلاحِ شریعت میں دیندار بہت

شعورِ موت، سلیقہ حیات کا دے کر کسی نے کر دیا اُمّت کو قرضدار بہت

شمیم آئی ہے قیصرؔ اسی کے گیسو کی
کہ ہے فضائے چمن آج خوشگوار بہت

نقاد

شاعر

صحافی

افسانہ نگار

سوانح نگار

ایک ہمہ پہلو شخصیت

ڈاکٹر وزیر آغا سے انٹرویو

ہم لوگوں کے مشترکہ دوست مشفق خواجہ کا خیال ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا لکھنے والوں کی اس صف سے تعلق رکھتے ہیں جو اپنے عہد کی شناخت بن جاتے ہیں۔ ہماری خوش بختی ہے اور رحمٰن نیر صاحب کی عنایت بھی کہ اس وقت "بیسویں صدی" کے دفتر میں جناب وزیر آغا صاحب تشریف فرما ہیں۔ میں اپنی جانب سے اور قارئین بیسویں صدی کی جانب سے ان کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہتا ہوں۔

ڈاکٹر صاحب! آپ سے شاید ۱۹۸۰ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے میر تقی میر سیمنار یا غالباً فکشن سیمنار کے دوران ملاقات ہوئی تھی۔ اس کے تقریباً دو سال کے بعد غالب سیمنار میں شرکت کے لیے آپ تشریف لائے تھے۔

آج پھر آپ سے ملاقات کا شرف حاصل ہو رہا ہے۔ اس بار آپ کی آمد ہندوستان میں کس سلسلے میں ہوئی؟

وزیر آغا: مجھے بلایا تو تھا اردو عالمی کانفرنس والوں نے بھی اور غالب سیمنار والوں نے بھی۔ لیکن یہاں آکر میں نے مناسب یہ سمجھا کہ میں غالب سیمنار میں شرکت کروں۔ کیوں کہ دونوں کی ایک ہی تاریخ تھی تو یہ مجھے زیادہ اچھا لگا۔

مظفر حنفی: یعنی مشاعرے میں آپ شرکت نہیں کر سکے۔

وزیر آغا: جانا تو مجھے وہاں بھی تھا اور ان کو مجھے ایوارڈ بھی دینا تھا لیکن میں وہاں نہیں گیا اور ایوارڈ بھی نہیں لیا۔

مظفر حنفی: میرے خیال میں یہ اس ادارے کی محرومی ہے کہ انھیں یہ شرف حاصل نہیں ہو سکا یا ہوتے ہوتے رہ گیا۔

وزیر آغا: دیکھیے ایوارڈ تو میرے لیے کوئی اہمیت کا حامل نہیں ہوتا۔ اصل میں "کنٹری بیوشن" آپ کی کیا ہے...."

مظفر حنفی: بے شک۔ میں تو اس ادارے کی محرومی کی بات کر رہا ہوں جو اس اعزاز سے محروم رہ گیا کہ ڈاکٹر وزیر آغا کو ایوارڈ نہ دے سکا۔ حالانکہ وہ ہندوستان میں تھے۔ یوں تو ظاہر ہے کہ یہ تمام چیزیں ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب! یہ جو چند سیمنار آپ نے ہندوستان میں "اٹینڈ" کیے ان کی روشنی میں اور عالمی سیمنار میں اگر آپ نے شرکت نہیں بھی کی تو کم از کم اس سلسلے کی کچھ خبریں چونکہ آپ یہاں مقیم تھے،

آپ تک پہنچی ہی ہوں گی، تو اس بارے میں میں یہ جاننا چاہوں گا کہ کیا اس پیمانے کے سیمینار اور ادبی جلسے اُدھر ہوتے ہیں؟

وزیر آغا: جی ہاں ..... پاکستان میں بھی بالکل ہوتے ہیں۔ ہاں نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ بعض میلے کی جیسی نوعیت اختیار کر جاتے ہیں۔ لوگوں کا ملنا جلنا اور بعض میں افہام و تفہیم کی باتیں ہوتی ہیں اور ادب کے موضوعات زیر بحث آتے ہیں۔ ہمارے یہاں بھی مختلف قسم کے سیمینار ہوتے ہیں جو چھوٹے پیمانے پر ہوتے ہیں، میں سمجھتا ہوں، زیادہ مفید ہوتے ہیں اور جو بڑے پیمانے پر ہوتے ہیں وہاں نشستند و گفتند و برخاستند نہیں بلکہ نشستند و خوردند و برخاستند ہوتی ہے!

منظفر حنفی: جی۔ وہاں تو رکھ رکھاؤ پر اور نمائش پر زیادہ دھیان دیا جاتا ہے۔ لیکن جناب، میرا سوال دراصل اس پہلو کی طرف تھا کہ عالمی پیمانے پر ... یعنی فکشن سیمینار میں جب آپ تشریف لائے تھے تو آپ نے شاید غور فرمایا ہو، اس میں کہاں کہاں سے لوگ آئے تھے۔ انگلینڈ سے تھے، امریکہ سے تھے، ناروے سے تھے، سعودی عرب سے تھے۔ آپ حضرات پاکستان سے تشریف لائے تھے تو اس طرح کیا عالمی پائے کے سیمنار بھی ہوتے ہیں پاکستان میں؟

وزیر آغا: پچھلے دنوں ایک تجویز تھی کہ ایک عالمی اردو کانفرنس بھی ہو۔ اب تو اردو کی حیثیت اس اعتبار سے عالمی ہو گئی ہے کہ ہندوستان میں بھی اور پاکستان میں بھی یہ برادری موجود ہے۔ کچھ باہر سے آجاتے ہیں۔ لندن سے اور دوسری جگہوں سے۔ میں انھیں اردو برادری کہتا ہوں.... اردو برادری تو آجاتی ہے۔ کچھ سیمنار خاص طور سے غالب کے سلسلے میں اقبال کے سلسلے میں جو ہوئے اس میں کچھ اور لوگوں کو بھی مثلاً

مستشرقین کو بھی بلایا گیا تو اس اعتبار سے وہ عالمی سیمنار کہا جا سکتا ہے.... اور کیونکہ دنیا کے بیشتر اردو میں لکھنے والے دراصل انھیں دونوں ممالک سے تعلق رکھتے ہیں۔ باقی لوگ تو یہیں کے یا یہاں کے مہاجرین ہیں جو دوسرے ممالک میں ہیں۔

منظفر حنفی: یہ جان کر واقعتاً خوشی ہوئی کہ وہاں بڑے پیمانے پر سیمنار ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہاں اردو سرکاری زبان ہے۔

وزیر آغا: نہیں۔ ابھی سرکاری زبان تو نہیں ہے۔ کوشش کر رہے ہیں کہ سرکاری زبان ہو جائے۔ لیکن یہ ہے کہ اردو کے سلسلے میں ہم لوگ بہت سنجیدہ ہیں، حکومت بھی سنجیدہ ہے .... اردو کے سلسلے میں قسمت یاوری کرے اور سب سطحوں پر یہ ہو جائے تو بڑی اچھی بات ہے۔

منظفر حنفی: پاکستان میں کیا سرکاری زبان نہیں ہے اردو؟

وزیر آغا: نہیں۔ ابھی تو دیکھیے نا مثلاً یونیورسٹیز میں پبلک سروس کمیشن کے جو امتحانات ہیں وہ سب انگریزی میں ہوتے ہیں۔ اور کوشش کی جا رہی ہے کہ سرکاری دفاتر میں اردو آجائے لیکن کوشش ہی کی جا رہی ہے ابھی رائج نہیں کیا گیا ہے۔ تو میں نے ایک دفعہ لکھا تھا کہ میں اس دن کے انتظار میں ہوں جب میں صبح اٹھوں اور میرا بیٹا اخبار لے کر آئے اور کہے

کہ لیجیے پاکستان میں اردو کو سرکاری زبان قرار دے دیا گیا ہے۔

مظفر حنفی: ... ہم لوگ اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ وہاں سرکاری زبان اردو ہے۔

وزیر آغا: ویسے حکومت کو ہمدردی ہے۔ لیکن یہ ہے کہ بعض چیزیں ہیں اس کے لیے تیاریاں بہت ضروری ہوتی ہیں۔ مثلاً ہم نے بہت بڑا ادارہ قائم کیا ہے مقتدرہ، جو بہت اچھا کام کر رہا ہے کیونکہ یہ کام صرف ادبی زبان کو رائج کرنے کا نہیں ہے۔ بہت سے شعبے ہیں اس ترقی پذیر دور کے، طبیعیات ہے، فلکیات ہے، اب کس کس کا نام لیا جائے۔ ان کی لغظیات اور اصطلاحات تیار کرنی ہیں اور پھر یہ ہے کہ جو بہت نچلی سطح کی کلاسیں ہیں، ان میں اسے رائج کرنا چاہیے تاکہ جو TERMINOLOGY ہے وہ ساری کی ساری آئے اب گڑبڑ جو ہے وہ یہ ہوتی ہے، میں سمجھتا ہوں ہندوستان میں بھی ہوتی ہے، پاکستان میں بھی ہوتی ہے کہ دونوں زبانوں کو جو ایک مضبوط زبان ہے اور ایک نسبتاً کمزور زبان ہے یعنی کہ انگریزی اور اردو دونوں زبانوں کو بیک وقت ایک مقابلے کی فضا میں لایا گیا ہے۔ اب ہم کیا کریں؟ چیزیں باہر سے آ رہی ہیں۔ جو چیز خود تخلیق کریں گے اس کو آپ نام بھی خود دیں گے جو باہر سے آئیں گی وہ اپنا نام لے کر آئیں گی۔ اب آپ دیکھیے کئی دفعہ سیمناروں میں بھی میں نے اس بات کی نشاندہی کی ہے کہ دفاتر اور دکانوں پر بورڈ جو لگے ہیں وہ اردو میں ہیں لیکن وہ سارے انگریزی میں ہیں۔ الفاظ انگریزی کے ہیں۔ صرف اردو رسم الخط میں لکھا گیا ہے۔ مستری لوگ ہیں۔ اب مثلاً کار آتی ہے۔ کار کے اب جتنے پرزے ہیں بجز اس کے کہ وہ تلفظ کی تھوڑی سی غلطی کر دیں۔ وہ سب انگریزی ہوں گے۔

مظفر حنفی: گویا کہ وہ سارے نام انگریزی کے ہیں جو آلات اور کل پرزوں کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔

وزیر آغا: اتنے بڑے پیمانے پر انگریزی زبان کی یلغار ہوتی ہے کہ یہ مسئلہ وہاں پاکستان میں بھی اردو زبان اور علاقائی زبانوں کا نہیں ہے۔ سب سے بڑا مسئلہ جو ہے وہ اردو زبان کا اور انگریزی زبان کا ہے۔

مظفر حنفی: ڈاکٹر صاحب کچھ دن پیشتر غالباً میں نے سید عبداللہ مرحوم کا مضمون پڑھا تھا۔ "پاکستان کی جناتی زبان" اور اس میں غالباً اس پہلو کی جانب اشارہ کیا گیا تھا کہ اردو پر انگریزی کی جو یلغار ہے اور عوامی سطح پر اردو جس طرح انگریزی سے ضرورت سے زیادہ متاثر ہے تو اردو والوں کو اس طرف توجہ دینی ہوگی۔

وزیر آغا: جی جی جی۔ اس کے اوپر انھوں نے لکھا تھا... اور میں نے خود بھی۔ ان سے پہلے کہا تھا کہ جناتی زبان تخلیق ہو رہی ہے۔ مولانا صلاح الدین احمد نے بھی اس پہلو کی طرف اشارہ کیا تھا کہ ہمیں زیادہ سے زیادہ اردو کا استعمال کرنا چاہیے ویسے بھی یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے ہم آسانی کے لیے انگریزی کا لفظ استعمال کر لیتے ہیں حالانکہ اردو کا لفظ ہمارے پاس موجود ہوتا ہے جو مترادف یا متبادل لفظ نہیں ہے اس کے لیے تو ہونا چاہیے لیکن جو لفظ اردو میں موجود ہے اس کے لیے انگریزی لفظ لانا ٹھیک نہیں ہے۔ مثلاً میں آپ کو ایک مسئلہ بتاتا ہوں جو ہمارے سامنے ادبی سطح پر آیا اور ہم نے اس پر احتجاج بھی کیا۔ وہ یہ ہے کہ پنجابی کے الفاظ بے تحاشہ استعمال ہو رہے ہیں۔ اب یہ وہی مسئلہ ہے انگریزی کے الفاظ کا۔ ہم ان سے کہتے ہیں آپ بیشک پنجابی کے الفاظ، سندھی کے الفاظ، پشتو کے الفاظ لائیے لیکن وہ جن کے مترادف اردو میں موجود نہیں ہیں لیکن یہ بڑے ظلم کی بات ہے....

مظفر حنفی: ... کہ اردو میں ہیں وہ لفظ آپ ان کی جگہ انگریزی لفظ

کا استعمال کر رہے ہیں۔

وزیر آغا: اچھا پھر ایک بات ہم نے یہ کہی کہ اکبر الہ آبادی نے جب انگریزی کے الفاظ استعمال کیے تو ان کا مقصد انگریزی کے الفاظ کا مذاق اڑانا ہی تھا....

مظفر حنفی: بطور طنز یا مذاق کے لیے... تضحیک و تمسخر کے طور پر...

وزیر آغا: پنجابی ہماری مادری زبان ہے، سندھی ہماری مادری زبان ہے، پشتو ہماری مادری زبان ہے۔ ان زبانوں کے الفاظ ہم استعمال کرتے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ مضحکہ اڑانے کے لیے نہیں کریں گے ______

لیکن ایک روش بن گئی ہے کہ اس طرح مزاح پیدا کیا جائے۔ یہ غلط ہے میں نام نہیں لیتا لیکن ٹیلی ویژن کے لیے وہاں لوگ اس طرح لکھ رہے ہیں۔

مظفر حنفی: ڈاکٹر صاحب، یہ تمام امور اپنی جگہ، لیکن ایک پہلو جس کی طرف ہمارے اہلِ نظر ادیب اور شعرا اکثر توجہ دلاتے رہے ہیں، یہ بھی رہا ہے کہ اردو کے مختلف جو علاقائی لہجے ہیں مثلاً بمبیّا اردو، مثلاً بہاری اردو، مثلاً پنجابی اردو۔ میں نے جانا ہے، مثال کے طور پر ظفر اقبال نے اس کا تجربہ کیا ہے۔ "گلافتاب" میں اور مختلف لوگوں نے جہاں تک افسانے کا تعلق ہے وہاں پنجابی لہجہ اچھا لگتا ہے بیدی کے یہاں ہو یا منٹو کے افسانوں میں۔ شاعری میں کیا ہم اسے روا رکھ سکتے ہیں؟

وزیر آغا: جی میرا خیال ہے یہ تو آئے گا مثال کے طور پر پنجابی جس کی مادری زبان ہے تو جب اردو وہ لکھے گا تو اس کا لہجہ بھی آئے گا، محاورہ بھی آئے گا، یہ ساری کی ساری چیزیں آئیں گی....

مظفر حنفی: کیا شاعری بطور خاص غزل میں بھی؟

وزیر آغا: پنجابی لکھنے والوں میں جو شاعری آئی ہے اس کا لہجہ یا آواز بلند ہے۔ دلی میں تو کم تر مگر لکھنؤ میں .... یا آگے آپ جائیں گے تو دیکھیں گے کہ لفظ پر لفظ کی تراش خراش پر اس کی لطافت پر زور دیں گے لیکن ہمارے یہاں امیج IMAGE پر۔ اور ...... حرکی کیفیت بہت زیادہ ہے آواز بلند ہے۔ اقبال کی آواز دیکھ لیجیے....

مظفر حنفی: یقیناً بلند آہنگی ہے لیکن فیض کی آواز نرم ہے جوش کی آواز بھی بلند ہے لیکن اس میں وہ بات نہیں.... تصنع سا آگیا ہے۔

وزیر آغا: اپنے علاقے کے اندر زبان کی جڑیں پھیلی ہوتی ہیں۔ وہیں سے وہ غذا لیتی ہے۔ اور اگر اس کا رابطہ جڑوں سے منقطع کر دیا جائے تو پھر یہ گڑبڑ ہو جاتی ہے۔ میں بڑی سیدھی سی بات آپ کو بتاتا ہوں کہ اردو زبان جو ہے اس وقت زیادہ تر شہروں میں ہے۔ مثلاً پاکستان میں اسے لیں تو شہروں میں بھی ایک پڑھا لکھا طبقہ اسے بولے گا۔ باقی تو پنجابی بولیں گے۔ اب ہمارے بہت سے مدارج ہیں جو پنجابی میں ہو رہے ہیں۔ میں کھیتی باڑی کرتا ہوں۔ اب گندم کو کاشت کرنے سے لے کر اس کو اگانے تک اور اس کے دانے نکالنے تک کے مدارج ہیں وہ تو لوگ پنجابی میں کر رہے ہیں۔ اس لیے ان کے تمام الفاظ پنجابی کے ہیں۔ اب ہم کیا کریں وہ جو اردو کے تھے وہ تو یہیں رہ گئے۔ وہ تو ہمارے استعمال میں نہیں آتے...

مظفر حنفی: یہ آپ کے ساتھ مسئلہ ہے وہاں جس سے مفر نہیں لیکن ہمارے کاشتکار تو اپنے اردو کے الفاظ، اصطلاحات اور اپنا محاورہ اور روزمرہ ہی برتیں گے نا۔

وزیر آغا: وہ تو ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ صرف پنجابی یا وہاں کی جو علاقائی زبانیں ہیں وہی نہیں بلکہ انگریزی کے الفاظ اور انگریزی زبان کا محاورہ اور لہجہ بھی اردو پر بہت زیادہ اثر انداز ہوتا ہے اور ہمیں پتہ بھی نہیں چلتا کہ کیسے ہو رہا ہے مثلاً ایک دن میں نے کہا کہ یہ بات غالب کے حق میں کہی جاتی ہے تو میرے مخاطب ہنسنے لگے۔ کہنے لگے ______

It Goes to the Credit of Ghalib اس طرح بے شمار الفاظ ہمارے اخبارات میں بھی آ رہے ہیں۔

مظفر حنفی: مثلاً۔ جیسے الفاظ اور

جاندار زبانوں میں ــ قبولیت کا مادہ بہت زیادہ ہوتا ہے ـــ زندہ زبان کے لیے یہ ایک فطری چیز ہے۔

تراکیب ہیں.... مگر میں یہ سمجھتا ہوں یہ ہماری زبان کی توسیع ہے بشرطیکہ اس کے مضر اثرات نہ ہوں۔ جاندار زبانوں میں تو قبولیت کا مادہ بہت ہوتا ہے۔ یہ ایک فطری چیز ہے... زندہ زبان کے لیے۔

وزیر آغا: لیکن یہ الفاظ کا آنا اس بے دردی سے۔ اور اس میں دو قسم کے کلچر ہیں۔ پاکستان میں بھی ہیں، یہاں ہندوستان میں بھی ہیں۔ ایک کو ہم سیول لائن کلچر کہتے ہیں۔ ایک کو عوامی کلچر کہتے ہیں اب یہ ایک طرح سے میں یہ کہوں گا۔ POLERISATION میں انگریزی کا لفظ استعمال کروں گا، ایک قسم کا کلچر پیدا ہو رہا ہے جو اپنے بچوں کو انگریزی اسکولوں میں بھیج رہے ہیں۔ اب وہ ممی ڈیڈی تہذیب کے نمائندے بن رہے ہیں۔ دوسرے عام بچے ہیں اس سے ہمارے معاشرے کے اندر وہ جو آپ بات کرتے ہیں استحصال کی وہ ایک بہت کلچرل سطح پر ایک دو یا تین قومیں یا چار قومیں بنتی ہیں زبان کے اعتبار سے یہ جو ہے... یعنی ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے ہم آہنگی نہیں ہے۔

منظر حنفی: جی ہاں۔ یہ مسئلہ ہمارے یہاں بھی ہے۔ ہم بیک وقت دو طرح کی ذہنیتوں کو جنم دے رہے ہیں۔

وزیر آغا: یہ فرق عجیب و غریب ہے مثلاً میں دیہات میں رہتا ہوں۔ وہاں کے جو بچے ہیں وہ چٹائیوں پر بیٹھتے ہیں اور گندے کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ وہاں سے ہم شہر میں آتے ہیں تو وہ باقاعدہ ...ٹائی سوٹ میں... کاروں میں آتے ہیں۔ اب یہ جو فرق آ رہا ہے یہاں بھی آ رہا ہے وہاں بھی آ رہا ہے۔ تو یہ تو حکومتوں کو چاہیے کہ کوئی انتظام کریں تبھی ایک یونیفارم معاشرہ آئے گا...

... ورنہ....

منظر حنفی: قطع کلام کے لیے معذرت لیکن آغا صاحب! آپ نے اصل گفتگو کو اس خوش اسلوبی سے ایسے گہرے پانی کے سمندر میں کھینچ لیا ہے جس کی سمتھاہ نہیں ملے گی اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ آپ گفتگو میں زیادہ تر احتیاط برتتے ہیں کہ مرکز گفتگو آپ نہ ہوں بہر حال میں نے تو آپ کے بارے میں بہت کچھ پڑھا ہے مگر "بیسویں صدی" کے قارئین کی خاطر کچھ سوالات جان بوجھ کر کروں گا۔ آپ کے علم میں جو "بیسویں صدی" کا مزاج ہے وہ بھی لے آؤں۔ یہ ادبی پرچہ ہے مگر عوامی ادبی پرچہ ہے۔ اس لیے اس پرچے میں وہ گاڑھا ادب جو خالصتاً ادیبوں کے کام آتا ہو عام طور پر جگہ نہیں پاتا اور نہ وہ سطحیت جو فلمی پرچوں میں ہوتی ہے۔ اس طرح اوسط ذہن کا جو قاری ہے اس کے لیے یہ پرچہ ہے اس لیے ایسے سوالات بھی میں کروں گا جن کے جوابات مجھے معلوم ہیں۔

ڈاکٹر صاحب آپ سے گفتگو کرنے میں بڑی دشواری یہ پیش آتی ہے کہ آپ نے بیک وقت اتنے بہت سے میدانوں میں فتوحات کے جھنڈے گاڑے ہیں، تنقید اور تحقیق کے سلسلے میں آپ کی کتابیں اہمیت کی حامل ہیں۔ "اردو ادب میں طنز و مزاح" آپ کی کتاب ہے "اردو شاعری کا مزاج" "تخلیقی عمل" "اقبال اور تصور عشق و خرد"، "نظم جدید کی کروٹیں" "مجلسی تنقید" "تنقید و احتساب" ایک سے ایک اچھی کتاب ہے۔ اگر تخلیق میں دیکھیے تو چھ شعری مجموعے ہیں۔ دو غزلوں کے چار نظموں کے۔ شاید ایک آدھ میں نظمیں اور غزلیں دونوں ہیں "نردبان" "شام اور سائے" "گھاس میں تتلیاں"۔ انشائیوں کے تین مجموعے ہیں۔ سفرنامہ آپ کا ابھی سرگودھا کے "اردو زبان" میں پڑھ کر محظوظ ہوتا رہا۔ ترتیب و تدوین کا کام ہے۔ آپ بیتی کا تو آپ کی جواب نہیں۔ "شام کی منڈیر سے" میں آپ نے اتنی جہات پیدا کر لیں کہ ایک عام خود نوشت سوانح عمری میں ان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا پھر طویل نظمیں ہیں آپ کی۔ "آدھی صدی کے

بعد" آپ کی طویل نظم تو سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس فیلڈ میں گفتگو پہلے کی جائے اس لیے آپ ہی کے کورٹ میں بال پہنچا رہا ہوں۔ یہ فرمائیے کہ آپ کا بنیادی میدان کون سا ہے؟

وزیر آغا: بنیادی میدان میں یہ کہوں گا جو بچپن سے ہی میرے لیے ایک سوالیہ نشان بنا ہوا ہے وہ ہے کہ یہ کائنات ایک اسرار ہے۔ میں اس اسرار کو جاننے کا متمنی ہوں اور یہ ذرائع ہیں یعنی انشائیہ یا شاعری ہے یا تنقید ہے۔ یہ ذرائع ہیں اس چیز کو جاننے کے لیے میں سمجھتا ہوں جسے کانٹ کے NOMINUM کہا تھا جسے جانا نہیں جا سکتا واقعتاً جانا نہیں جا سکتا اس کے اندر سفر تو کیا جا سکتا ہے میں تو اس کے اندر سفر کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ میرا غزلوں کا جب مجموعہ چھپا تھا...

مظفر حنفی: جی ہاں کیئی منزلہ عمارت کی طرح تعبیر کیا تھا آپ نے تخلیقی ذہن کو۔

وزیر آغا: تو میں نے ایک منزل پر دوسری کو ترجیح نہیں دی بلکہ میں نے اندر سے پوچھا کس لہجہ میں کس زبان میں آپ بات کریں گے کس صنف سے کریں گے تو جو صنف پسند کرے گا۔ اندر والا تو اس صنف میں بات آجاتی ہے بس یہ بات مظفر حنفی صاحب!

اب میں محسوس کرتا ہوں کہ وہ جو ایک تھکاوٹ ہمارے یہاں آجاتی ہے لکھنے والوں میں بہت جلد آجاتی ہے۔ کچھ ایسا ہوا ہے کہ میرے یہاں وہ نہیں آئی۔ پتہ نہیں کیوں نہیں آئی۔ جسمانی طور پر تو یقیناً قویٰ مضمحل ہو رہے ہیں لیکن مجھ سے یہی سوال کیا گیا تھا۔ بی بی سی میں۔ وہاں انٹرویو ہوا تو پوچھا گیا 'کیا تھکاوٹ محسوس کرتے ہیں آپ' تو میں نے کہا مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے لکھنے کا وقت اب آیا ہے تو... یہ اصل میں ایک تجسس ہے جاننے کا، میں تو کتاب کو بھی اسی طرح دیکھتا ہوں جس طرح پھول کو دیکھتا ہوں... جس طرح ستارے کو دیکھتا ہوں۔ یہ اسرار ہیں اور اس کے اندر آپ جائیں گے تو کچھ نہ کچھ ملے گا ضرور...

مظفر حنفی: اس سلسلے میں مجھے آپ کے چند مضامین کی یاد آتی ہے جو غالباً آشوبِ آگہی کے نام سے شائع ہوئے تھے (جی جی وزیر آغا) اور آپ کا خیال تھا کہ انھیں کتابی شکل میں شائع کریں۔ کچھ فلکیات کا معاملہ (جی جی۔ وزیر آغا) اسرارِ کائنات کا معاملہ... (جی ہاں۔ وزیر آغا) پھر وہ کتاب کہاں رہ گئی؟

وزیر آغا: یہ ہوا کہ ایک کتاب میں لکھ رہا تھا تقریباً اسّی صفحات لکھے تھے پھر جو اقبال کی صد سالہ تقاریب ہوئیں اس میں حکومت پاکستان نے مجھ سے کہا کہ آپ تصورِ عشق و خرد پر لکھیں۔ اچھا اب وہ جو مطالعہ آپ نے کر رکھا تھا وہ ایک طرح سے اس شہر میں چلا گیا۔ وہ اس کا ایک اسٹرکچر STRUCTURE بن گیا۔ پھر میرے اندر ایک داراتی سطح بھی تو تھی یہ جو کتاب سوانح عمری میں نے لکھی ہے اس میں وہ چیز آئی... دیکھیے... دیکھیے مظفر حنفی صاحب! ایک عجیب و غریب بات ہوئی۔ اس طرف توجہ دلائی میرے دوستوں نے اور میں اس پر غور کرتا رہا میری بات کچھ غلط بھی ہو سکتی ہے لیکن جہاں تک میں نے مطالعہ کیا یہ عجیب اتفاق ہوا کہ میں نے "آدھی صدی کے بعد" شعر میں، نظم میں اپنی سوانح عمری لکھی اور پھر اس کے بعد میں نے نثر میں اپنی سوانح عمری لکھی" شام کی منڈیر سے" ورلڈ لٹریچر WORLD LITERATURE میں کم از کم میری نظر میں کوئی ایسی بات نہیں آئی کہ شعر میں اور نثر میں بیک وقت دونوں میں سوانح عمری لکھی گئی ہو... نثر اور نظم دونوں میں مظفر حنفی صاحب، یہ عجیب و غریب PHENOMINA ہے اگر کوئی اس پر کام کرے۔ میں تو نہیں کہہ سکتا۔ ایک چیز دوسرے کو کہاں تک آتھنٹک AUTHENTIC قرار دے رہی ہے یا ایک کروٹ دوسرے سے

میں تو کتاب کو بھی اس طرح دیکھتا ہوں جس طرح پھول کو دیکھتا ہوں جس طرح ستارے کو دیکھتا ہوں۔

کیسے مل رہی ہے تو یہ ایک عجیب و غریب موضوع ہے جس پر کام ہو سکتا ہے۔

مظفر حنفی: یہ تو دراصل ایک تصویر کے دو رُخ ہیں ڈاکٹر صاحب! ایک بڑی چیز یہ ہے آپ کے سفرنامے میں ..... نہیں آپ کی خود نوشت سوانح عمری ہیں مختلف سوانح عمریاں آپ دیکھیے تو ان میں عام طور پر لوگ ایک سطح پر گفتگو کرتے ہیں یا تو سیاسی اور سماجی پہلو کو سامنے رکھتے ہیں یا روحانی ارتقا کی بات کرتے ہیں ورنہ کن کن شخصیتوں سے متاثر ہوئے، ان سے متعلق بات کرتے ہیں لیکن آپ نے "شام کی منڈیر سے" میں بیک وقت کئی جہات اور متعدد پہلوؤں کو پیش کیا ہے۔ تخلیقی شخصیت، سماجی شخصیت سبھی کچھ ایک ساتھ روشنی میں آئے ہیں۔

وزیر آغا: میرے ذہن میں جو ایک بات آئی کہ عام طور پر جو سوانح عمریاں لکھی جاتی ہیں۔ اس میں لکھنے والا خود کو مرکز دو عالم قرار دیتا ہے اور وہ اپنی بات کم کرتا ہے اور اس کے ارد گرد جو سیارے گھوم رہے ہیں، اُن کی بات زیادہ۔ وہ سورج ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اپنے ارد گرد جو سیارے ہیں ان کے بارے میں اگر بات کروں گا تو اپنی حیثیت بھی نمایاں ہوگی۔ میں اس طرح کی کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں تھا۔ میں نے تو ایک تیسری آنکھ سے ایک کونے میں بیٹھ کر دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس بڑی کائنات کے اندر (یہ بہت دشوار عمل ہے۔ مظفر حنفی) میں دیکھ رہا ہوں یہ کائنات ہے۔ اس کا میں بھی تو حصّہ ہوں میں اس کائنات کو دیکھ رہا ہوں تو گویا کائنات خود اپنے آپ کو دیکھ رہی ہے۔ یہ وہی احساس تھا جو اس کتاب کے پس منظر میں سے ابھرا تھا جس کا ہم ابھی ذکر کر رہے تھے۔ اگر میں اس ڈرامہ میں شریک ہو سکا تو یہ میری کہانی نہیں ہے۔ یہ آپ سب کی کہانی ہے اور آپ اس میں اسی طرح شریک ہو سکتے ہیں۔

مظفر حنفی: بھائی جان، سمندر سے موتی نکالنے کا عمل بڑا دشوار ہوتا ہے لیکن خوبصورت عمل ہے۔ میں بھی

ہمارے یہاں ایک یہ رویّہ ہے،

ہمیشہ سے ہے اور اب بھی ہے

کہ دوسروں کا تشخص جو ہے، اُس

کے لیے ایک ٹھپّہ اُس کے ماتھے

پر لگا دیا جائے۔

آپ کو کرید کرید کر کچھ ایسی باتیں نکالنا چاہتا ہوں جو آپ میرے خیال میں سب کے سامنے لانا نہیں چاہتے۔ مثلاً یہی مسئلہ کہ ہمارا جو اوسط ذہن کا قاری ہے وہ اب تک نہ سمجھ پائے گا کہ وہ بنیادی طور پر آپ کو نقاد سمجھے، شاعر سمجھے، شاعر بھی وہ غزل کا شاعر سمجھے یا نظم کا شاعر سمجھے۔ نقاد ہی سمجھے تو فکشن کے اوپر آپ نے اتنا کچھ لکھا، آپ نے سفرنامے پہ اتنا کچھ لکھا، انشائیے کو آپ نے بالکل نیا رُخ دے دیا۔ تنقیدی تحریروں سے بھی اور تخلیقی عمل سے بھی دکھایا تو ان تمام چیزوں میں آپ کا ایک واضح جواب چاہیے (میں میں۔ وزیر آغا) زیادہ اہم پہلو آپ کا کون سا ہے؟

وزیر آغا: میں عرض کرتا ہوں ہمارے یہاں ایک یہ رویہ ہے، ہمیشہ سے ہے اور اب بھی ہے کہ دوسروں کا تشخص جو ہے اس کے لیے ایک ٹھپّہ اس کے ماتھے پر لگا دیا جائے۔ نقاد کے خانے میں ڈال دیا جائے۔ شاعری کے خانے میں ڈال دیا جائے کہ انشائیہ کے خانے میں ڈال دیا جائے۔ میں کہتا ہوں کہ کسی ادیب کو جب آپ دیکھیں تو مجموعی طور پر دیکھیں کہ وہ کیا ہے۔ کچھ پتہ نہیں ہے کہ ایک صنف میں وہ جو اظہار کر رہا ہے میں نے تو اس پر کام کیا ہے کہ ہر صنف کا اپنا مزاج ہوتا ہے۔ اپنے مزاج کے مطابق، اپنے سانچے کے مطابق ہی آپ کی سائیکی کو ــ وہ اپنی گرفت میں لیتی ہے اگر آپ میں سکت ہے۔ اگر گرفت ہے۔ میں ہی کیا ہر شخص کو کرنا چاہیے ــ تو آپ دوسری اصناف کو بھی بروئے کار لا سکتے ہیں۔ آپ کی شخصیت کی جتنی پرتیں ہیں اس سے بھی زیادہ کائنات کی پرتیں آئیں گی۔ پر میں ذاتی طور پر یہ سمجھتا ہوں کائنات کے مقابلے میں ادیب جو ہے جیسے دو آئینے ایک دوسرے کے سامنے ہوتے ہیں۔ دو آئینے جو آجائیں تو عکسوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جائے گا اس... انداز میں کچھ ادب کو دے سکیں تو یہ بڑی بات ہوگی۔ آپ نے سوال کیا ہے میں اسے نظر انداز نہیں کرتا۔ ابتدا میری شاعری سے

مختلف دوسری چیزیں (جی ہاں۔
وزیر آغا) خواہ اس پائے کی نہ ہوں
ان تمام میدانوں میں کچھ نہ کچھ کرتا
رہا ہوں لیکن اپنے آپ کو پہچانتا
میں شاعر ہی کی حیثیت سے ہوں
وہ بھی غزل کے شاعر کی حیثیت
سے۔
ہوئی۔ شاعری میری سب سے بڑی
محبت ہے اور باقی اصناف میں جو
کچھ ہے ان میں تخلیقی عمل جو شعر کا
ہے وہ ان میں اخراج کرتا چلا گیا
مظفر حنفی: بہت بہت شکریہ ڈاکٹر
صاحب۔ اس واضح جواب کا۔ بہرحال
آپ نے جو کچھ فرمایا میں اس سے کلیتاً
اتفاق بھی کرتا ہوں اور اس کے
اوپر کاربند بھی ہوں۔ تنقید، تحقیق
اور فکشن، ادب اطفال، ترجمہ اور
مظفر حنفی: آغا صاحب یہ کوئی رسمی
قسم کا انٹرویو تو ہے نہیں جس میں
آپ سے تاریخ پیدائش اور جائے ولادت
معلوم کروں۔ ظاہر ہے یہ بات آپ
پچاسوں بار کہہ چکے ہیں، لکھ چکے ہیں
مجھے آپ کے حالاتِ زندگی پڑھتے ہوئے
آپ کے والد صاحب سے بھی جانے کیوں
والہانہ قسم کا ایک تعلق، ایک لگاؤ
پیدا ہو گیا ہے۔ پرکشش شخصیت
معلوم ہوتی ہے اُن کی۔ لیکن اصل
نام جاننا چاہا تو کہیں بھی نہ ملا۔ شاید
ہر جگہ و۔غ۔خ لکھا گیا ہے انھیں۔
کچھ ان کے بارے میں باتیں ہو جائیں۔
وزیر آغا: عرض کرتا ہوں۔ یہی تاثر
کچھ اور دوستوں کا بھی ہے بلکہ انھوں
نے مجھ سے شکایت بھی کی کہ آپ
نے ان کے بارے میں مزید کیوں نہیں
لکھا تو آپ تو جانتے ہیں کہ میری اپنی
جو اندرونی گروتھ GROWTH
ہے، اصل موضوع وہ تھا۔
مظفر حنفی: یعنی اپنی سوانح عمری میں
موضوع سے آپ نے زیادہ انصاف
کیا، والد صاحب سے نہیں۔
وزیر آغا: نہیں نہیں۔ میرا جی چاہے گا
تو ان پر الگ کتاب لکھوں گا۔ اصل
میں ان کا نام وسعت علی خاں
تھا۔
مظفر حنفی: وسعت علی خاں۔ خوب
اور غالباً ان کو تصوف اور ویدانت
سے بھی گہرا شغف تھا؟
وزیر آغا: جی ہاں۔ وہ سنسکرت

اور کتابیں بھی۔ وہ ویدانت پر بوریوں
میں بھر کر لاتے تھے۔ جلد تو ہوتی
نہیں تھی۔ سو وہ کہتے تھے کہ میں درمیان
سے دھاگہ توڑ دیتا تھا اور پڑھتا تھا
دیئے کی روشنی میں ـــــ

جانتے تھے، انگریزی جانتے تھے،
فارسی جانتے تھے اور پچاس سال
کی عمر تک وہ کہتے تھے کہ میں مطالعہ
کرتا رہا۔ کھوجتا رہا اور جہاں جہاں
کوئی پڑھا لکھا تھا اُس سے ملتا
رہا۔ اور کتابیں بھی وہ ویدانت
پر بوریوں میں بھر کر لاتے تھے۔ جلد
تو ہوتی نہیں تھی۔ سو وہ کہتے
تھے کہ میں درمیان میں سے دھاگہ
توڑ دیتا تھا۔ پڑھتا تھا دیے کی
روشنی میں۔ اور اذان کی آواز ہوتی
تھی تو مجھے پتہ چلتا تھا کہ رات گذر
گئی۔ لیکن پچاس سال کے مطالعے
کے بعد انھوں نے کہا کہ یہ سب
بیکار ہے۔ یہ سارا مطالعہ بیکار ہے۔
اور وہ کہنے لگے کہ بڑی سے بڑی بات
بھی بچوں کی زبان میں بیان ہونی
چاہیے۔ وہ اپدیش دیتے تھے۔ ہم لوگ
اپدیش لیتے تھے۔ تین تین گھنٹے۔
چار چار گھنٹے۔ تین مہینے چار مہینے میں
نے باقاعدہ ان سے اپدیش لیا ہے۔
انھوں نے کوئی بات تشنۂ تکرار نہیں
کیا نئی بات..... ہم نے تو روشنی
ان سے لی۔
مظفر حنفی: یہ آپ کی خوش بختی تھی۔
ڈاکٹر صاحب اس سے پیشتر آپ کی
جو خاندانی روایات تھیں ان کے تناظر
میں اگر دیکھا جائے تو غالباً انسسٹری
کی جو ایک بنیاد پڑتی ہے اور غور و فکر
کی اور روحانی تجربات کی، وہ غالباً
اسی ایک نسل پہلے سے آئی ہے آپ کے
خاندان میں؟
وزیر آغا: جو باتیں ہم نے سنیں وہ یہ
ہیں کہ دادا ایران سے آئے تھے۔ اس
وقت گھر میں فارسی بولی جاتی تھی۔
وہ لاہور میں آ کے گھوڑوں کا کاروبار
کرتے تھے۔ سلطان کی سرائے میں
انھوں نے گھوڑوں کا کاروبار شروع
کیا۔ پھر ہمارے والد صاحب پیدا ہوئے
اب ان کے ساتھ کیا ہوا، میں کہہ
نہیں سکتا۔ سوامی رام تیرتھ سے ان
کی ملاقاتیں ہوئیں۔ غالباً دوست
بھی تھے۔ اس کے بعد ان کے یہاں
تبدیلی آئی۔ یہ چلے جاتے کشمیر، چلے جاتے
کلو اور مطالعہ کرتے علوم کا، ویدانت
کا بھی۔
مظفر حنفی: سوامی رام تیرتھ سے
ملاقاتیں بھی اسی سفر کے دوران ہوئی

ہوں گی۔
وزیر آغا: جی ہاں۔ کالج میں جب وہ وہاں پر پڑھتے تھے۔ ان کا سارا کا سارا رویہ پھر اس طرف ہوا۔ خاندان میں اور کوئی مجھے نظر نہیں آتا۔ یہ ورثہ شاید مجھے وہیں سے ملا۔

مظفر حنفی: اور آپ کے دادا؟

وزیر آغا: وہ ذکر کرتے تھے کہ ان کی زندگی علمی سطح کی نہیں تھی۔ انگریزی کے ادیب رڈیارڈ کپلنگ RUDYARD KIPLING —— جو تھے ناوہ وابستہ تھے سول اینڈ ملٹری گزٹ یا ٹریبون اخبار سے۔ غالباً سول ملٹری CIVIL-MILITARY —— سے تھے۔ وہ میرے دادا کے دوست تھے تو ہر شام کو ظاہر ہے کہ گھوڑوں کی باتیں کرتے ہوں گے۔ یاد رکھتے ہوں گے کہ کون کون سے کردار وہاں پر آتے ہیں لیکن یہ ہے کہ ایک رابطہ ضرور تھا تو والد صاحب نے سرگودھا میں کچھ زمین لے لی۔ یہ زمین پہلے حکومت کی طرف سے ملی تھی گھوڑا پالی پر، ہماری ملکیت نہیں تھی لیکن یارانِ طریقت نے مجھے لارڈ LORD بنا دیا۔ پتہ نہیں کیا کچھ کہا۔ حالانکہ تھوڑی سی زمین تھی جو گھوڑا پالی پر ملی تھی۔ بعد میں میرے والد نے وہ خرید لی۔ پھر اس کے بعد وہ زرعی اصلاحات کی زد میں آ گئی۔ تھوڑی سی زمین اب میرے پاس ہے کاشت کا کام تو میں کرتا ہوں کیونکہ میرا تو رزق کا معاملہ ہے وہاں سے۔ لیکن یہ ہے کہ جب یہ زمین آباد ہوئی تو وہاں درخت لگائے گئے۔ ان میں چار یا پانچ مجھ سے عمر میں بڑے ہیں باقی سب میرے اپنے لگائے ہوئے ہیں۔ اب وہ میرے دوست ہیں... اور ساری فضا میں میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ وہ جو ایک انجمن ہوتی ہے جو گاؤں کے لوگ رہنے والے ہیں ان کے علاوہ درختوں سے، پرندوں سے اور پودوں سے....

مظفر حنفی: آغا صاحب وہ تو جب ہم آپ کی نظمیں پڑھتے ہیں، انشائیے پڑھتے ہیں، حتیٰ کہ جب آپ کی تنقید پڑھتے ہیں تو بخوبی اندازہ ہوتا ہے اس قربت کا جو آپ کو زمین سے ہے اور تخلیقی رنگ دینے کے باوجود تنقید لکھنا بڑا دشوار گزار عمل تھا جسے آپ نے اپنے یہاں بہر حال برقرار رکھا ہے۔

وزیر آغا: یہی تو میں ایک صاحب سے کہہ رہا تھا کہ کئی دفعہ شام میں خاص طور پر میری کئی کتابوں کے عنوان میں بھی شام شامل ہے....

مظفر حنفی: مثلاً "شام کی منڈیر سے" "شام دوستاں آباد" "شام اور سائے" وغیرہ۔

وزیر آغا: تو شام میرے لیے بہت پراسرار شے ہے۔ نہ وہ دن ہے نہ وہ رات ہے۔ وہ درمیان میں سنجوگ کی کیفیت ہے۔ سوتے جاگتے کی کیفیت ہے۔ میں سمجھتا ہوں۔ تخلیق بھی سوتے جاگتے کی کیفیت ہے ___

مظفر حنفی: بیشک وہ خوابناک خوابناک سی فضا جو قصبات میں خاص طور پر شام کو پائی جاتی ہے بلکہ میرے خیال میں تو دوپہر میں بھی وہاں خوابناک فضا آپ محسوس کر سکتے ہیں

وزیر آغا: اس میں اتنی تنہائی ہوتی ہے کہ کئی دفعہ میں محسوس کرتا ہوں کہ پوری کائنات میں میں ہی اکیلا ہوں۔ یعنی وہاں کوئی آدمی نہیں ہے شام کو سب اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے ہیں۔ اوپر آسمان ہے نیچے زمین ہے۔ درمیان میں میں تنہا کھڑا ہوں۔ تخلیقی اعتبار سے ایک ہم آہنگی کائنات کے ساتھ ہوتی ہے وہ ہمیں محسوس ہوتی ہے۔

مظفر حنفی: وہ امریکی نقادوں کے بقول جو DOWN TO EARTH والا سلسلہ ہے وہ بیک وقت آپ کی تحریروں میں اسی وجہ سے پایا جاتا ہے پھر تخلیق کار اور صوفی آپ کی ذات میں اس طرح آمیز ہوتے ہیں اور ایسے صحیح توازن کے ساتھ آگے بڑھتے ہیں جو خود ایک انتہائی دلچسپ عمل ہے ظاہر ہے کہ ہم لوگوں کے لیے ان انتہائی خوشگوار لمحات میں شرکت آپ کی تحریروں کے وسیلے سے ہی ممکن ہوتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب.... آپ کی تنقید پڑھتے ہوئے ابتدا میں کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ تخلیقی کائنات اور اس کے ارتقائی مراحل کا جو سلسلہ ہے مثلاً " اردو شاعری کے مزاج میں خاص طور پر برتا جا رہا تھا اور ابتدائی آپ کی جو تنقیدی تحریریں تھیں ان میں

تو شام میرے لیے بہت پُراسرار شے ہے۔ نہ وہ دن ہے نہ رات
وہ درمیان میں سنجوگ کی کیفیت ہے۔ سوتے جاگتے کی کیفیت۔

بڑھتا جا رہا تھا۔ آج کل آپ کی جو تنقیدیں ہیں وہ کچھ زیادہ ڈائریکٹ DIRECT براہِ راست سی محسوس ہوتی ہیں۔ آپ فرمائیں کہ کیا ہم غلط محسوس کر رہے ہیں یا واقعی آپ کچھ نئے زاویے سے ادب کو دیکھنے لگے ہیں۔

وزیر آغا: بالکل میں آپ کا سوال سمجھ گیا ہوں اکثر ہمارے یہاں یہ ہوا ہے کہ مختلف اور متفرق موضوعات پر کتابیں لکھی گئی ہیں۔ میں نے، آپ نے دیکھا کہ شروع میں ایک موضوع پر لکھی ہیں مثلاً مسرت کی تلاش، اردو شاعری میں طنز و مزاح، اردو شاعری کا مزاج۔ دو کتابیں میری ایک ہی موضوع پر آئی ہیں جس کی وسعت آپ کے سامنے ہے۔ جن علوم کا ان میں احاطہ کیا گیا ہے۔ پھر اس کے بعد تصورات عشق وخرد ہے۔

مظفر حنفی: غالباً آپ بھول گئے ایک اہم کتاب اور ہے نظم جدید کی کروٹیں۔

وزیر آغا: وہ اس پہلی صف CATEGORY میں ہے۔ وہ چونکہ متفرق مضامین ہیں اس لیے...

مظفر حنفی: حالانکہ وہ مستقل کتاب نہیں ہے پھر بھی اس میں ایک دور کے لکھنے والوں کے شعری مزاج کو سمجھنے کی کاوش ہے وہ ایک قدر مشترک ہے۔

وزیر آغا: لیکن وہ الگ الگ مضامین ہیں۔ 'تخلیقی عمل' میں نے پیش کی ہے۔ اس میں مختلف علوم، حیاتیات کو بھی میں نے لیا ہے۔ تاریخ کو MYTH کو خاص طور پر اساطیر کو لیا ہے۔ تو اس کا کینوس بھی جس کا ذکر آپ ابھی کر رہے تھے، بڑا وسیع رکھا ہے۔ اس کے بعد میں نے ایک کتاب لکھی ہے وہ تھی تصورات عشق وخرد اقبال کی نظر میں۔ پتہ نہیں یہ کتاب آپ کی نظروں سے گذری ہے کہ نہیں۔ یہ کتاب چھپی تھی ۱۹۷۷ء میں...

مظفر حنفی: بہت باریک ٹائپ میں جو اقبال اکیڈمی نے چھاپی تھی؟ اب یہاں ہندوستان میں بھی چھپی ہے۔

وزیر آغا: اب اس کا دوسرا ایڈیشن آیا ہے۔ اس میں آپ دیکھیں گے کہ تنقید کا فن کتنا وسیع ہوا ہے پھر اس کے بعد آپ نے ذکر کیا "آشوب آگہی" کے سلسلے کے مضامین۔ یہ بھی میں چاہتا تھا کہ تنقید کی سطح پر لاؤں لیکن بہت

> جدید اردو تنقید پر لکھنے سے پہلے ہمیں جدید تنقید کے بارے پوری جانکاری ہونی چاہیے... چنانچہ میں نے وہ پڑھا، عالمی پیمانے پر بھی میں نے پڑھا۔

سے دیگر راستوں کو اختیار کر گیا۔ اور ایک چیز جو ابھی آپ کے علم میں نہیں ہے جو میں اب پیش کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ وہاں کراچی میں عبدالحق میموریل لیکچر ہوتا ہے ہر سال۔ اس سال انھوں نے مجھے کہا کہ میں جدید اردو تنقید پر ایک مقالہ لکھوں جو وہ کتابی صورت میں چھاپیں گے۔ تو میں نے کہا اچھا۔ کوئی ایک سال ہوا انھوں نے مجھ سے یہ فرمائش کی تھی۔ لیکن میں نے کہا کہ جدید اردو تنقید پر لکھنے سے پہلے، ہمیں جدید تنقید کے بارے میں تو پوری جانکاری ہونی چاہیے تو اس سلسلے میں میں نے مطالعہ پھر شروع کیا پہلے پڑھا ہوا تھا لیکن اسے اپ ٹو ڈیٹ UPTO DATE کرنے کے لیے میں لندن گیا اور اس ارادے کے ساتھ گیا کہ وہاں... جا کر میں جو جدید ترین کام ہوا ہے اس کا جائزہ لوں چنانچہ میں نے وہ پڑھا، عالمی پیمانے پر بھی میں نے پڑھا۔ پھر میں نے جو اس کا تناظر وسیع ہوا ہے۔ مثال کے طور پر بیسویں صدی کے آخر میں علامت پسندی SYMBOLIC کی تحریک آئی ہے بیسویں صدی میں ۱۹۱۴ء کے لگ بھگ جو RUSSIAN FORMALISM کی تحریک آئی ہے بعد میں نئی تنقید جسے ہم کہتے ہیں اسٹرکچرل STRUCTURAL جس کے دو حصے ہیں ایک وہ ہے جسے ہم برطانوی کہتے ہیں ____

____ جس میں ایلیٹ بھی ہیں رچرڈسن بھی ہیں اور دوسرے وہ ایلن ٹیٹ وغیرہ امریکہ کے ہیں پھر تجزیاتی مطالعہ DESCRIPTIVE CRITICISM ہے اس کے بعد ۱۹۴۰ میں STRUCTURALISM آتا ہے اب STRUCTURALISM کیا ہے ____ کیا چیز ہوتی ہے۔ اس کے کیا امکانات ہوتے ہیں۔ اچھا اس کے بعد لسانیات LINGUISTIC کا اس کے ساتھ کیا تعلق ہے STATISTICS کے ساتھ کیا تعلق ہے اس کے بعد اگلا قدم DECONSTRUCTION کا ہے پھر اس کے بعد HUMANISTICISM کا ہے۔ جناب میں نے دیکھا کہ تنقید

ہر زمانے میں کسی بڑے شعبۂ علم پر
انحصار کر رہی ہوتی ہے۔ اب ہماری جو
تنقید ہے (کبھی نفسیات کبھی فلسفے پر۔
مظفر حنفی) اب جو کر رہی ہے وہ نظریۂ
اضافیت پر کر رہی ہے.... اب۔ جو
WHITEHEAD نے کہا تھا پہلے تو شے
MATTER جسے آپ کہیں گے وہ تھا، اب
MATTER اہم نہیں ہے۔ رشتہ اہم ہے۔
مظفر حنفی: دائرہ گھوم کر میرے
خیال میں "آشوبِ آگہی" کی طرف پھر
آ رہا ہے۔
وزیر آغا: جی آ رہا ہے اور یوں کہ ہم سب
انسان بھی رشتے کی گرہیں ہیں۔ گرہ
کھل جاتی ہے تو آدمی باقی رہ جاتا ہے
اسی طرح کائنات کی ہر شے CREATIVE
ہے..... اس کی روشنی میں جب ہم
نے تنقید کو دیکھا تو میں تو صرف اس
نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تنقید محض ایک
تخلیق کے تجزیاتی مطالعہ تک ہی محدود
نہیں ہے بلکہ جو قاری ہے وہ خود تخلیق
میں PARTICIPATE کر رہا ہوتا ہے۔ اب
اس اعتبار سے دیکھا جائے تو جدید تنقید
جو ہے اس کا فلسفے کے ساتھ علم الحیات
کے ساتھ، عمرانیات کے ساتھ..
...... نفسیات کے ساتھ، تمام علوم
کے ساتھ ایک گہرا تعلق ہے۔ اس میں
سے جو ایک ENTITY ابھرے گی،
جو آپ نے بات کی میں اب اس سطح پر
جا رہا ہوں، میں کوئی دعویٰ نہیں کرتا،
لیکن میں نے وہ کتاب لکھ دی ہے۔ آج
کل میں اسے FAIR کر رہا ہوں۔
بہت جلد وہ آپ کے سامنے آ جائے گی
مظفر حنفی: کیا ضخامت ہوگی ڈاکٹر صاحب
اس کی؟
وزیر آغا: زیادہ ضخامت کا میں قائل
نہیں ہوں.... تھوڑے سے تھوڑے
لفظوں میں بیان کیا جائے لیکن یہ ہے کہ
اس میں الجھاؤ نہ ہو ابہام نہ آئے،
بات واضح ہو جائے۔ اب میں نے یہ
کیا ہے کہ لکھنے کے بعد دو تین مہینے کے
لیے اسے چھوڑ دیا ہے۔ دو تین مہینے
کے بعد میں اسے بطور قاری کے پڑھوں
گا۔ جہاں جہاں میری بات سمجھ میں نہیں
آئے گی۔ اس کا میں از سر نو مطالعہ
کروں گا۔ اسے پھر یعنی دوبارہ لکھوں گا
میں سمجھتا ہوں تنقید اب بہت وسیع
ہو گئی ہے اور فلسفہ بھی طبیعات بھی
اور ANTHROPOLOGY بھی یہ

یہ سبز باغ اور یہ فرقہ پرستی جو
تنقید کے اندر ہے، میں تو اس
کے خلاف ہوں۔ وہ تو ایک فن پارہ
ہے۔ اس کی اپنی Entity ہے۔

تمام چیزیں منتج ہو رہی ہیں۔ میں تو
تنقید میں کسی تشخیص کا قائل نہیں رہا، یہ نفسیاتی
تنقید ہے۔ یہ مارکسی تنقید ہے...
مظفر حنفی: جی ہاں۔ اٹھارہ دبستان
انھوں نے کھڑے کر دیے ہیں۔
وزیر آغا: یہ سبز باغ اور یہ فرقہ پرستی
جو تنقید کے اندر ہے میں تو اس کے خلاف
ہوں۔ وہ تو ایک فن پارہ ہے۔ اس
کی اپنی ایک Entity ہے۔ آپ اس
کے ریڈر ہیں۔ آپ کی اپنی ENTITY
ہے۔ ان دونوں کے درمیان ہم آہنگی
پیدا ہو گی تب بات بنے گی۔
مظفر حنفی: آغا بھائی! اس میں
ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ ہمارے یہاں
طور پر تنقید کا فعل جو لوگ اختیار
کرتے ہیں۔ معاف کیجیے گا یہ 'فعل' واوین
میں ہے... (جی۔ وزیر آغا) ان کا
فیلڈ بڑا محدود سا ہوتا ہے۔ بیشتر تو
تخلیق کار ہی نقاد بھی ہوتا ہے۔ سچے
نقاد کے لیے ضروری ہے کہ وہ صرف
ادبیات سے الگ ہٹ کر اور چار چھ
آٹھ اہم ترین جو علوم ہیں ان پر
اس کی نگاہ ہو جو ہمارے یہاں بیشتر
نقادوں میں.... نہیں ہے۔ اس کے
باوجود آپ دیکھتے ہیں کہ تنقید کتنا لمبا
چوڑا ڈھول پیٹتی ہے اور ہدایت نامے
جاری کرتی ہے۔ ایک سوال اور جو مجھے
پریشان کرتا رہا ہے وہ بھی عرض کیے دیتا
ہوں۔ میں نے یہ دیکھا ہے کہ عام طور پر
ہمارے ناقدین میں جو تخلیق کار بھی ہوتے
ہیں تو جو صفِ اول کا تخلیق کار کہا
جا سکے ان میں سے وہ نکل کر نہیں آتا
مثلاً حالی غالباً نقادوں میں سب سے
بڑے تخلیق کار بھی ہیں۔ اور ہمارے
اہم ترین نقادوں میں سے ہیں لیکن ان کا
مرتبہ جب بطور شاعر ہم دیکھتے ہیں تو
تخلیقی ادب میں جو دوسری صف ہے اس
کے آدمی ہیں۔ محمد حسین آزاد جیسا نقاد
اور جو نثر میں شاعری کرتا ہے جب اس
کی شاعری کو ہم دیکھتے ہیں تو بہت پھیکی
سی ہے........ شبلی کی شعری
حیثیت بھی آپ جانتے ہیں واجبی سی ہے
..... آپ کے سامنے ہے.... خلیل الرحمٰن
اعظمی کسی حد تک اچھے شاعر ہیں لیکن
بہر حال ان میں کسی کو عمر ساز یا عہد ساز
شاعر نہیں کہہ سکتے۔ آپ کے یہاں
صورتِ حال کچھ مختلف ہے تو کیا؟ میں
دراصل روشنی اس بات پر چاہتا ہوں کہ

کہیں ایسا تو نہیں کہ چونکہ نقاد دو اور دو چار کہتا ہے اور تخلیق دو اور دو پانچ کہنے کا عمل ہے، خواب بنا کی کا عمل ہے۔ نقاد کے یہاں شعور حاوی رہتا ہے تخلیق میں لاشعور کی شمولیت ضروری ہے۔ اس لیے نقاد کی علمیت اور دانشمندی سے تخلیق متاثر ہونا شروع ہو جاتی ہے؟

وزیر آغا: جی بالکل صحیح ہے۔ میری تو جو کتابیں آپ کے سامنے آئی ہیں تقریباً بائیس کتابیں ان میں سے گیارہ کتابیں میں نے اندازہ لگایا تھا وہ تنقید کے بارے میں ہیں اور گیارہ کتابیں تخلیقی ہیں، بالکل تخلیقی ہیں۔

مظفر حنفی: واہ واہ۔ پلڑا تا حال آپ نے برابر رکھا ہے۔

وزیر آغا: عجیب بات ہے کہ یہ ساتھ ساتھ چلی ہیں اور درمیان میں وقفے آتے ہیں اصل میں تو تخلیق ہے جیسے میری تخلیق کاری درمیان میں جو وقفے آتے ہیں اس میں آدمی اپنا احتساب کرتا ہے اور چیزوں کو دیکھتا ہے اور سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔

مظفر حنفی: ڈاکٹر صاحب تخلیق کار کے لیے بہت ضروری ہے یہ چیز۔

وزیر آغا: بہر حال میں تو تخلیق کو زیادہ اہمیت دیتا ہوں۔ تنقید بھی تخلیقی سطح کی اگر ہو تو وہ آپ کو بہت مدد دیتی ہے اور دوسروں کو بھی مدد دیتی ہے۔ ان کے لیے راستے کھولتی ہے۔

مظفر حنفی: ہندوستان اور پاکستان میں تنقیدی صورتِ حال آپ کو کہاں بہتر نظر آتی ہے۔

وزیر آغا: مجھے بڑی خوشی ہوئی ہے کہ پاکستان کے مقابلے میں یہاں تنقید کی طرف رویہ بہت زیادہ مثبت ہے یہاں نقاد نے زیادہ مطالعہ کیا ہے اور وہ بہت زیادہ SERIOUS ہیں۔ SERIOUS ہونا میں سمجھتا ہوں بڑی بات ہے وہاں جو صورتِ حال ہے ...... وہ آپ کے سامنے ہے جو تخلیقی ادب وہاں ہے وہ بھی مضافات میں ہے کیونکہ لاہور جو خود مرکز ہے، وہاں کم تخلیقی کام ہوتا ہے۔ اردگرد زیادہ میں تو ایڈیٹر ہوں "اوراق" کا جس کا آپ شاید ذکر کریں گے۔ اس میں میں دیکھتا ہوں نوّے فیصد جو چیزیں ہیں، باہر سے آتی ہیں۔ دس فیصد بھی بمشکل لاہور سے۔ کیونکہ وہ ایک COSMOPOLITAN شہر بن گیا

صاحب، یہ اُردو برادری ہے میں کسی تخصیص کا قایل نہیں۔ ساری برادری ایک ہے۔ اپنے اپنے ملک میں ہماری وفاداریاں مسلّم ۔لیکن ہم اچھے انسان بھی ہو سکتے ہیں۔

ہے۔ لوگوں کی کاروباری ذہنیت ہو گئی ہے...... اصل تخلیقی کام باہر سے آ رہا ہے۔ یہ ایک صورت حال ہے۔ یہاں میں نے ہندوستان میں دیکھا ہے کہ خاص طور پر تنقید کے سلسلے میں، بہت سی یونیورسٹیز میں بھی گیا ہوں۔ لوگوں سے بات کی ہے، لوگوں نے سوالات کیے ہیں میں نے دیکھا ہے کہ لکھنے والے با خبر ہیں۔ اور UPTO DATE ہونا چاہتے ہیں۔

مظفر حنفی: ڈاکٹر صاحب تنقید کے تناظر میں آپ نے جو بات اور صورتِ حال ہندوستان اور پاکستان میں...... بیان فرمائی، تھوڑا سا میں تفصیل میں جانا چاہوں گا۔ عام طور پر تخلیق کاروں میں یہ احساس عام ہے اور پچھلے دنوں حسن نعیم سے میں گفتگو کر رہا تھا تو انھوں نے بڑی تفصیل سے اس طرف اشارہ کیا بلکہ شکایت کی۔ ایک طرف تو ہندوستان میں جب نقاد غزل یا کسی دوسری صنفِ ادب کا جائزہ لینے بیٹھتا ہے۔ فکشن کا یا کسی بھی صنف ادب کا، تو اس میں سرِ فہرست وہ پاکستانی شاعروں اور ادیبوں کو رکھتا ہے اور ایسی کوئی تفریق روا نہیں رکھتا کہ سرحد کے اس پار جو کچھ لکھا جا رہا ہے وہ دوسری زبان کا ادب نہیں ہے چونکہ وہ اردو زبان کا ادب ہے، نظریاتی فرق کے احترام کے باوجود زبان ایک ہے۔ اس لیے غزل کا شاعر چاہے وہ ہندوستان میں ہو یا پاکستان میں یا عرب میں یا انگلینڈ میں ہو، ان سب کا ذکر کرتے ہیں لیکن پاکستانی نقاد جب قلم غزل کے اوپر اٹھاتا ہے تو صرف پاکستان... فکشن میں بھی بہت سے لوگ یہاں ہیں لیکن انھیں مسلسل نظر انداز کیا جاتا ہے۔

وزیر آغا: میں اس بات کے خلاف ہوں آپ نے دیکھا ہوگا کہ "اوراق" میں بہت سے آپ کے ہندوستان کے لکھنے والے چھپتے ہیں۔ ہم ان کی کتابوں پر تبصرے کرتے ہیں۔ مضامین میں ذکر کرتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں یہی مثبت رویہ ہے۔ میرے ایک دوست مجھ سے پوچھنے لگے۔ ہندوستان اور پاکستان کے ادب میں آپ کیا فرق محسوس کرتے ہیں۔ میں نے کہا صاحب۔ یہ اردو برادری ہے۔ میں کسی تخصیص کا

ہماری حکومت کو بھی کچھ نرمی برتنی چاہیے تاکہ کتابوں اور رسائل کی آمد و رفت کچھ زیادہ ہو۔

قائل نہیں۔ ساری برادری ایک ہے۔ اپنے اپنے ممالک سے ہماری وفاداریاں مسلّم۔ لیکن اس کے ساتھ ہم ایک اچھے انسان بھی ہو سکتے ہیں۔

منظر حنفی: اردو زبان ایک ہے۔ زبان کبھی تقسیم نہیں ہو سکتی۔

وزیر آغا: میں آپ کی بات سے سو فیصدی متفق ہوں۔ یہاں کے لوگ مثلاً اب دیکھیے آج مجھے احساس ہوا۔ ان سے باتیں کرتے ہوئے کہ پاکستان کی کتابیں پڑھنا چاہتے ہیں۔ وہاں پر ایسا کوئی رویہ ہمیں نظر نہیں آیا۔ بہت کم لیکن یہاں بہت زیادہ ہے۔ یہ مثبت بات ہے۔ یہ دونوں طرف سے ہونا چاہیے اور اس میں سمجھتا ہوں ہماری حکومتوں کو بھی کچھ تھوڑی سی نرمی برتنی چاہیے تاکہ کتابیں اور رسائل کی آمد و رفت کچھ زیادہ ہو جائے۔ اس میں کوئی حرج نہیں ہے علم کے دروازے تو کھلے ہونے چاہئیں اور جہاں سے ملے اور اگر مغرب کی کتابیں آسکتی ہیں آسانی سے تو یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی کہ ساتھ والے ملک سے کتابیں نہ آئیں۔

منظر حنفی: ڈاکٹر صاحب! اس سلسلے میں موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک بات ریکارڈ میں لے آنا چاہتا ہوں تاکہ آپ کے وسیلے سے یہ شکایت یا یہ درخواست میری پاکستان بھی پہنچ جائے۔ ہمارے یہاں پچھلے دنوں عالمی بک فیئر، آٹھواں عالمی بک فیئر تھا۔ میں مسلسل چار پانچ دن اس بک فیئر میں بھٹکتا رہا حالانکہ میں بہت گوشہ گیر قسم کا انسان ہوں۔ استنے دنوں میں آپ نے مجھے کسی جلسے میں نہ دیکھا ہوگا۔ میں بک فیئر میں صبح سے شام تک بھٹکتا رہا اور جب پاکستانی اسٹال پر میں گیا تو معلوم ہوا کہ ایک اسٹال آنے والا ہے۔ کئی دن تک تو وہ آیا نہیں مگر جب وہ اسٹال آیا تو اس میں صرف مولانا مودودی کی کتابیں تھیں۔ ایک اور اسٹال ملا جو یہیں کا کوئی ہندوستانی ایجنٹ ہے جس نے کچھ پاکستانی کتابیں کسی طور پر حاصل کر لی تھیں تو اس کے ذخیرے میں چند ناول تھے۔ بانو قدسیہ کا ناول اور چند تفریحی چیزیں۔ زیادہ تر شعری مجموعے تھے جو بہت کم تر درجے کے تھے۔ سفرنامے زیادہ تھے۔ تنقید کی ایک کتاب اس کے اسٹال پر نہ تھی اور پاکستان کا کوئی باقاعدہ اسٹال نہ تھا جب کہ اور دنیا بھر کے ممالک اور اداروں کی کتابیں تھیں۔

وزیر آغا: اس بک فیئر میں میں جا نہ سکا۔ میرے پاس وقت نہ تھا ورنہ میں خود جا کر دیکھتا۔ لیکن ڈاکٹر جمیل جالبی آئے ہوئے تھے۔ مقتدرہ کی کتابیں وہ لائے تھے اور مجھے پتہ نہیں مگر اصولی طور پر میں سمجھتا ہوں کہ کتابیں ساری آنی چاہیے تھیں۔ نہیں آئیں تو یہ غلطی ہے اور آئندہ...

منظر حنفی: بالفرض FOR SALE نہیں ہوں پھر بھی DISPLAY تو کی جا سکتی ہیں؟

وزیر آغا: ہاں ہاں ضرور آنی چاہیے تھیں۔ کیونکہ ہمارے یہاں خاصا کام ہوا ہے اور لوگ پڑھنا چاہتے ہیں۔

یہ بک فیئر کتابی میلے وغیرہ ان کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ کتابیں سامنے آئیں اور پھر دونوں ملکوں میں ایک بڑا طبقہ ایسا موجود ہے جو اردو زبان کے رسم الخط کو بھی جانتا ہے۔ اردو زبان میں لکھتا بھی ہے، پڑھتا بھی ہے۔ اس کے لیے پاکستان کی کتابوں کا آنا بہت ضروری ہے۔ بلکہ یہاں سے بھی جو بہت سی کتابیں ہمیں نصیب نہیں ہوتیں وہاں پڑھنے کے لیے وہ بھی جانی چاہئیں تو یہ میلے جو ہیں کتابوں کے، وہاں ہماری کتابیں نہ ہوں پتہ نہیں کچھ ایسی عجیب سی چیز ہے کہ کتابیں سامنے آئیں ہم لوگ جو ادب سے تعلق رکھتے ہیں، بلاواسطہ ہے انھیں محروم رکھا جائے۔

منظر حنفی: اس میں ہر طرح خیر کا پہلو نکلے گا.... کیونکہ ادب تفریق تو سکھاتا نہیں، محبت اور آشتی کا پیغام دیتا ہے۔ جذبے کی تہذیب و تطہیر کرتا ہے۔ ارباب اقتدار کو تھوڑا سا اس پہلو پر سوچنا چاہیے اور لچک دار رویہ اختیار کرنا چاہیے بندشوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نقاد اور تخلیق کار اور شاعر ہی نقصان میں رہتا ہے۔ آپ کو شاید علم ہوگا آپ کی بہت سی کتابیں یہاں بغیر اجازت کے اور

کچھ اجازت کے ساتھ لوگوں نے بغیر رائلٹی دیے ہوئے شائع کر دی ہیں۔

وزیر آغا: جی۔ ابھی میں کل گیا تو ایک دکان پر پوچھا کہ جناب "اردو ناول میں طنز و مزاح" میری جو کتاب ہے کیا اس کا نیا ایڈیشن آ گیا ہے۔ کہنے لگے نہیں نہیں کوئی نہیں صاحب، میں نے کہا جو آپ کے پاس ہے کہنے لگے نہیں وہ پرانا ہے۔ اب جو پرانا تھا وہ بھی بالکل تازہ چھپا تھا۔ پندرہ مرتبہ تو چھپ چکا ہے وہ.... یہ بات میں نے بھی سنی ہے کہ مختلف یونیورسٹیز میں لگا ہوا ہے۔ بات یہ ہے کہ ہم لوگ جو ادب سے تعلق رکھتے ہیں میں سمجھتا ہوں پوری دنیا میں ہندوستان اور پاکستان کے اردو میں لکھنے والوں کو تہذیبی اعتبار سے بہت زیادہ اہمیت ملنی چاہیے کہ اپنے اپنے شعبہ میں وہ اپنے رزق کے لیے کوئی اور کام کرتے ہیں اور لکھنے پڑھنے کا کام ادب کی محبت کے لیے کرتے ہیں۔

مظفر حنفی: حالانکہ بنیادی مقصدِ زندگی بہرحال ادب کو ہی بنا رکھا ہے، ہم اسے کاروبار بنا ہی نہیں سکے۔

وزیر آغا: لیکن وہ آدمی جس نے اسے LATEST ایڈیشن بنا کر چھاپا ہے اگر مجھ سے اجازت لیتا تو میں خوشی سے دیتا بلکہ اسے یہ بھی کہتا کہ وہ جو تمہارے پاس ایڈیشن ہے، چھاپا ہے پاکستان میں جو LATEST چھپا ہے وہ میں مہیا کرتا۔

مظفر حنفی: لیکن یہ نہیں ہو رہا ہے اور اس کی وجہ وہی ہے کہ حکومتوں کی جانب سے کچھ ایسی لچک نہیں ہے — کتابوں کی آمد و رفت کا سلسلہ ہو۔ یہ دونوں حکومتوں کی طرف سے ہونی چاہیے اس سلسلے میں افہام و تفہیم ہونی چاہیے اس بارے میں تھوڑی سی نازک بات اور پوچھوں گا ڈاکٹر صاحب بے تکلفی کے ساتھ یعنی اگر آپ جواب نہ دینا چاہیں تو خاموشی اختیار فرما سکتے ہیں۔ ابھی پچھلے دنوں لاہور سے "نقوش" آیا اس میں بہت اچھی تقریر تھی — میرا سر احترام سے جھک گیا۔ جنرل ضیاء الحق صاحب کی تقریر میں نے پڑھی تو معلوم یہ ہوا کہ انھوں نے باقاعدہ جاوید طفیل کو پیشکش کی ہے کہ وہ جتنے بھی "نقوش" کے خاص نمبر تا حال شائع ہوئے ہیں ان سب کو از سر نو شائع کریں۔ اور وہ حکومت کی جانب سے ہر لائبریری میں بطور تحفہ بھیجے جائیں گے۔ پھر وہ تحقیق نمبر کی صورت میں "نقوش" میں شائع شدہ اچھے تحقیقی مقالات کے انتخاب شائع کریں اور طفیل نمبر ایک دوسرا پھر مرتب کریں۔ یہ سب کچھ حکومت کے خرچ پر ہوگا۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ حکومت کا یہ فیاضانہ رویہ کیا تمام اردو اخبارات و رسائل کے ساتھ ہے یا صرف یہ کہ....

وزیر آغا: جہاں تک میرے علم میں آیا ہے یہ "نقوش" کے سلسلے میں ہوا ہے بلکہ کوئی انعام نقوش ادبی ایوارڈ بھی تجویز کیا گیا ہے ویسے میں سمجھتا ہوں یہ ایک اچھا اقدام ہے۔ میرا ذاتی یہ تاثر ہے کہ اس میں وسعت آنی چاہیے۔

مظفر حنفی: بہت اچھا اقدام ہے اور دوسرے رسائل کے ساتھ ایسا ہوگا تو اس میں ان کی حق تلفی بھی نہیں ہوگی — بیشک اس کا فیض دوسرے اخباروں اور رسالوں کو بھی پہنچنا چاہیے۔

وزیر آغا: تو مطلب یہ ہے کہ اس پرچے کو دینا نہیں ہے۔ وہ تقسیم ہی کرنا ہے تو اگر خیر تقسیم ہو تو اس کا آرگن صرف ایک نہیں ہونا چاہیے۔ دوسرے بھی ہونے چاہئیں لیکن یہ بات بالکل ٹھیک ہے کہ یہ انھوں نے بہت اچھا قدم اٹھایا ہے اچھا پھر یہ کہ ادب کی ترویج اور اشاعت کے لیے ہماری حکومت نے بہت زیادہ خرچ کیا ہے اور بڑی فیاضی سے خرچ کیا ہے اور یہ بڑا اچھا قدم ہے۔ اس کو GENERALISE کرنے کی ضرورت ہے تاکہ وہ ضائع نہ ہو اور بہت سی چیزیں مثلاً سیمینار ہم کروا لیتے ہیں ان سب پر لاکھوں روپے خرچ ہو جاتا ہے۔ جو ہو جاتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اتنا ضرور خرچ ہو۔ باقی سارا کتابوں کی اشاعت پر خرچ ہونا چاہیے کیونکہ مقصد تو اشاعت ہے۔ سیمینار تو ایک ایسی چیز ہے جیسا کہ ابھی میں ذکر کر رہا تھا سیمینار کے سلسلے میں کہ جناب جب اختتام کو پہنچتا ہے ہر سیمینار

وہ اپنے رزق کے لیے کوئی اور کام کرتے ہیں اور لکھنے پڑھنے کا کام ادب کی محبت کے لیے کرتے ہیں۔

.... تو وہیں سے اس کا آغاز ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اگر اس نے سوچ کے لیے کچھ غذا مہیا کی ہے تو اس کے بعد جو ڈیلیگیٹس DELEGATES آئے ہیں وہ جائیں گے اور سوچیں گے اور کوئی کام کریں گے لیکن اگر اس کا مقصد یہی قرار دے دیں کہ بات وہیں ختم کر کے اٹھیں تو اس کا تو کچھ فائدہ نہیں۔

مظفر حنفی: ہاں موجودہ صورت حال تو آغا صاحب آپ نے بھی محسوس فرمایا ہوگا کہ یہی ہے.... ایک مقالہ آپ یا کوئی SEMINARIAN اٹھارہ اٹھارہ سیمناروں میں نام بدل بدل کر پیش کرتا رہتا ہے کیونکہ مشاعرے اور سیمنار میں اب بہت زیادہ فرق نہیں رہ گیا ہے۔ ایک اور بات ہے کہ جو پڑھنے والا یا مقالہ سننے والا اور مقالہ نگار ہے ان دونوں میں بھی ایک رشتہ ہے نا، اُسے ملحوظ رکھنا چاہیے

وزیر آغا: بھائی ایک بات اور ان پر بحث DISCUSSION ہوتی ہے اس کے باوجود آپ اٹھارہ مقالے پڑھواتے ہیں جنھیں کوئی سننے کے لیے تیار نہیں۔

مظفر حنفی: اور ہر مقالہ نگار سے درخواست کرتے ہیں کہ اپنا مقالہ پانچ منٹ میں پیش کردے.... وہ نہیں کرے گا۔ کیسے کر سکتا ہے۔

وزیر آغا: اس لیے اس میں یہ ہونا چاہیے کہ تھوڑے مقالے ہوں اور وہ مقالے پہلے پڑھ لیے جائیں اور انتخاب کرلیا جائے۔

مظفر حنفی: بلکہ ان کی کاپیاں تقسیم کی جائیں۔ پھر ایک کمیٹی ہو جو یہ فیصلہ کرے کہ کون سا مقالہ پیش کرنا ہے۔ کیونکہ اس میں اگر کوئی نئی چیز آئی ہے تب ہی پیش کیجیے۔ ویسے تو دس مضامین سامنے رکھیے، گیارہواں اپنے آپ بن جاتا ہے۔ سیمنار کے مقالہ کا مضمون خیال انگیز ہو جو بیس منٹ میں بیس گھنٹے غور کرنے کا آپ کے لیے مواد فراہم کرتا ہو۔

وزیر آغا: پھر میں تو یہ بھی سمجھتا ہوں کہ سیمنار میں ایک اور چیز ہونی چاہیے۔ ایک آدمی نے مقالہ پڑھا اور آپ نے دعوت عام دے دی کہ بحث کریں۔ یہ کوئی طریقہ نہیں ہے۔ مقالے کی کاپیاں چار یا پانچ یا چھ اسکالرس کو مہیا کریں۔ اور کہا جائے کہ آپ نے اس پر بات کرنی ہے اور کسی کو اس پر بات نہیں کرنی ہے.... اس طرح سیمنار اتنا اچھا ہوگا کہ اسے آپ باقاعدہ کتابی صورت میں شائع کر سکیں گے۔ میں نے دیکھا ہے مغربی ملکوں میں کہ بہت سے اس قسم کے سیمنار ہوتے ہیں کہ سامعین AUDIENCE بیٹھے ہیں اور وہ فلاسفرس ہیں یا رائٹرس ہیں اور وہ اونچی جگہ پر بیٹھے ایک موضوع پر گفتگو کرتے ہیں اور بقیہ لوگ صرف سنتے ہیں۔

مظفر حنفی: بھائی جان! آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ کچھ ادارے ہیں کچھ ان کی مجبوریاں ہیں۔ مثلاً ایوان غالب جو سیمنار کرے گا اس کا مرکزی موضوع جو ہوگا وہ غالب ہوگا لیکن اگر ہم صرف ان کی چند غزلوں پر یا ان کے مکاتیب کے سلسلے میں مسلسل صرف غالب ہی کے اردگرد گھومتے رہیں گے (کیا عمدہ بات کہی ہے آپ نے — وزیر آغا) تو باتیں REPEAT ہوں گی...

وزیر آغا: مظفر صاحب! یہ بنیادی بات کہی ہے آپ نے۔ اور غالب چھوڑ کر کوئی بھی آدمی ہو، آپ بار بار اس کو موضوع بنائیں گے...... تو اس کا میں کہتا ہوں OVER EXPOSURE ہو جائے گا۔ اچھا پھر یہ ہے کہ باتیں REPEAT ہوں گی۔

غالب کو چھوڑ کر کوئی بھی آدمی ہو۔ آپ بار بار اُس کو موضوع بنائیں گے... تو میں کہتا ہوں "اُوور ایکسپوز" ہو جائے گا۔ اچھا پھر یہ باتیں ریپیٹ ہوں گی۔

مظفر حنفی: اس طرح سطحیت بھی آجائے گی تو پھر کیوں نہ اس پلیٹ فارم سے موضوعات میں تنوع لانے کی کوشش کی جائے۔ مثلاً موجودہ دور میں جو شاعری ہو رہی ہے اس میں غالب کے اثرات ہی دیکھیں۔

وزیر آغا: یہ خیال بہت اچھا ہے۔ ایک بات میں ہم بہت الجھتے ہیں جو آپ نے شروع میں فرمائی تھی۔ بہت پیچھے اس بات میں ہیں کہ ہم پوری طرح سے ہمارا مطالعہ جو ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ علوم کا علم ہونا چاہیے۔ دنیا کتنی آگے جا رہی ہے۔ دس سال کا بھی فرق پڑ جائے تو ہم ایک ہزار سال پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ تو ہمیں پتہ ہونا چاہیے کہ دوسری فیلڈس میں کیا ہو رہا ہے جب ہی ہم ادب کا تجزیہ کر سکتے ہیں

مظفر حنفی: یہ بات تخلیق کار کے لیے بھی

کسی حد تک ضروری ہے مگر نقاد کے لیے تو ناگزیر ہے۔ لیکن نقاد شاید اسے زیادہ ضروری نہیں سمجھتے۔

وزیر آغا: تخلیق کار جو ہے اس کا بھی فرض بنتا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ اگر وہ غزل گو ہے تو اسے صرف غزل ہی کہنی ہے۔ تخلیق کار کا مطلب کچھ مطالعہ کرنا بھی ہے۔ کئی لوگ ایسے ہیں ہمارے یہاں۔ میں نے فیض کے بارے میں بھی لکھا ہے، میں نے اور لوگوں پر بھی لکھا ہے۔ اور کھل کر لکھا ہے کہ بیس بیس سال سے انھوں نے کوئی کام نہیں کیا ہے۔

مظفر حنفی: اس لیے کہ وہ اپنی شخصیت کے .... دائرے میں آگئے ہیں۔ اپنی شاعری کے علاوہ کسی اور کو پڑھتے ہی نہیں۔

وزیر آغا: اور علوم کا مطالعہ بھی نہیں کیا کیونکہ ایک علوم کا EXPLOSION جیسے کہنا چاہیے جس طرح POPULATION کا EXPLOSION ...... ہو رہا ہے۔ ویسے ہی علوم کا بھی EXPLOSION ہو رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہم آہنگ ہونا چاہیے۔ میں یہ نہیں دعویٰ کرتا کہ ہم لوگ ہو گئے۔ لیکن کوشش بڑی ہونی چاہیے۔ اس میں سے پانچ فیصد تک ہمیں معلوم ہو جائے تو ہمارا VISION جو ہے بڑھ جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک بات میں عرض کرنا چاہتا ہوں خاص طور پر وہ ہے انشائیہ کی تحریک .... تو انشائیہ کی تحریک جو چلائی ہے پہلے تو ایک گڑبڑ تھی کہ طنزیہ اور مزاحیہ مضمون اور انشائیہ میں فرق ___

مظفر حنفی: جی میں انشائیہ کی طرف آنے ہی والا تھا آغا صاحب!

وزیر آغا: انشائیہ بنیادی طور پر یہ کہتا ہے کہ ہر چیز آپ کو سوچنے کی ترغیب دے سکتی ہے۔ معمولی سے معمولی چیز یہ میز اور کرسی اس کے اندر بھی ایک جہانِ معنی مضمر ہے۔ آپ اس معنی کی تلاش کریں تو سوچ کا عنصر جو ہے یا سوچ کا عالم جو ہے وہ آپ کے یہاں بروئے کار آنا چاہیے اور یہ ضروری نہیں ہے کہ آپ فلسفے کی باتیں کہیں اور مابعد الطبیعات کی باتیں کریں۔ آپ ان چھوٹی چھوٹی چیزوں کی کیوں نہیں باتیں کرتے۔ یہ مکان ہے۔ یہ کرسی ہے۔ یہ میز ہے۔ زندگی کے چھوٹے چھوٹے معاملات ہیں۔ لیکن

اگر انشائیہ کی تحریک کامیاب ہو گئی تو اس کے یقیناً بقیہ ادب پر گہرے اثرات مرتسم ہوں گے۔

انھیں آپ زمین کی سطح سے اوپر اٹھا کر ایک اونچی سطح پر لے آئیں ___ مثلاً میں ابھی ذکر کر رہا تھا ایک خاتون مجھ سے پوچھ رہی تھیں کہ یہ کیا ہوتا ___ کیا ہے؟ میں نے کہا کہ میں نے ایک انشائیہ لکھا آندھی پر۔ اب آندھی موضوع تو نہیں ہے۔ میں لکھ رہا تھا کہ آندھی آتی ہے۔ وہ اس طرح جیسے کہ ایک بلائے ناگہانی آتی ہے۔ جو درخت اس کے سامنے اکڑتے ہیں۔ انھیں بیخ و بُن سے اکھاڑ کر پھینک دیتی ہے اور جو جھک جاتے ہیں ان کے اوپر سے گذر جاتی ہے۔ میں یہ کیفیتیں بیان کرتا رہا۔ اور آخر میں میں نے کہا جس شخص کی زندگی میں کبھی آندھی نہیں آئی....

مظفر حنفی: قابلِ رحم ہے اس کی حالت!

وزیر آغا: یہ ایک نیا رُخ ہے۔ بالکل نیا رُخ ہے تعمیری۔ تو انشائیہ آپ کو سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں ذاتی طور پر یہ نہیں کہ کوئی غلط بات کہہ رہا ہوں کہ انشائیہ کے نہ صرف افسانے پر، نہ صرف تنقید پر، نہ صرف شاعری پر، اثرات مرتسم ہونا شروع ہو گئے ہیں اور چونکہ اس نے ہمیں سوچنے کی طرف راغب کیا ہے اور اگر یہ انشائیہ کی تحریک کامیاب ہو گئی تو اس کے یقیناً بقیہ ادب پر گہرے اثرات مرتسم ہوں گے۔

مظفر حنفی: ڈاکٹر صاحب' اس سے بیشتر ہمارے یہاں انشائیہ کا سلسلہ جو تھا۔ آپ نے اپنے مختلف مضامین میں اس کا ذکر بھی فرمایا ہے۔ پطرس کے مضامین جو ہیں وہ بھی انشائیے ہیں مجتبیٰ حسین کی مزاحیہ تحریریں جو ہیں وہ بھی انشائیے ہیں اور فکر تونسوی کے طنزیہ مضامین جو ہیں وہ بھی انشائیے ہیں۔ یہ نکتہ تو اپنی جگہ کہ انھیں انشائیہ ہرگز نہ کہنا چاہیے لیکن انشائیے کے طور پر اور اس نام سے کچھ چیزیں وہ بھی مروج رہی ہیں۔ مثال کے طور پر "نیرنگِ خیال" میں مولانا محمد حسین آزاد کی بیشتر نگارشات یا اس کے بعد سجاد حیدر یلدرم یا شرر کی کچھ "دلگداز" میں جو تحریریں تھیں کچھ کو ہم نے ادبِ لطیف کے کھاتے میں بھی ڈال رکھا ہے۔ ان

مضامین کو اس موجودہ روشنی میں، جو انشائیہ کی تعریف آپ نے بیان فرمائی۔ اس کی روشنی میں اب ان مضامین کو کہاں رکھا جائے؟

وزیر آغا: میں نے اس کا تجزیہ کیا ہے۔ میں نے اس پر بڑا ہی غور کیا ہے اور میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تین چار قسم کی چیزیں لکھی گئیں۔ ایک تو وہ چیز لکھی گئی۔ سرسید احمد خاں کی تحریک کے تحت جسے ہم جواب مضمون کہتے ہیں۔ اس میں اصلاحی رنگ آگیا۔ اس میں سیاسی رنگ آگیا، معلوماتی رنگ آگیا۔ ایک رو چل پڑی طنزیہ مضمون لکھنے کی۔ ایک چل پڑی مزاحیہ لکھنے کی۔ ایک رو وہ بھی چلی جس میں فکر کی تازگی ہوتی تھی لیکن وہ مکمل انشائیہ نہیں بن سکی مگر انشائیہ کے اجزا اس میں شامل ہو گئے جیسے ابوالکلام آزاد کا قہوہ پینے کا تجربہ....

مظفر حنفی: چڑیا چڑے کی کہانی خواجہ حسن نظامی کی کئی تخلیقات اور ایک بار پھر احترام کے ساتھ عرض کروں گا کہ محمد حسین آزاد کی کچھ تحریریں بھی۔ ان میں آجائیں گی۔

وزیر آغا: جی یہ چھوٹے چھوٹے تجربات ہیں لیکن ان میں معنی نکلتے ہیں۔ لیکن تحریک کے طور پر یہ چیزیں نہیں آئیں۔ کہیں کہیں کوئی کمی رہ گئی۔ اب جو یہ تقسیم ہند کے بعد انشائیہ کی تحریک چلی ہے۔ ہم نے یہ کوشش کی ہے کہ اسے بطور ایک صنف کے پوری طرح سامنے لائیں۔ مثال ہمارے سامنے ہے۔ بیسویں صدی اور انیسویں صدی کے آخر میں انگلستان میں جو انشائیہ پیدا ہوا اب وہاں بھی بڑی گڑبڑ ہے۔

مظفر حنفی: ان میں بہت سی چیزیں محمد حسین آزاد نے اردو میں ترجمہ بھی کی ہیں۔

وزیر آغا: ہمارے یہاں اساتذہ میں گڑبڑ جو ہوئی میں وہاں بھی لوگوں سے جھگڑتا رہتا ہوں۔ اس معاملے میں وہاں پر لفظ انشائیہ جو ہے ESSAY کا ترجمہ ہے۔ وہاں بھی مترجمین نے گڑبڑ کی تھی اور مترجمین نے یہ کہا کہ یہ چھوٹی چھوٹی چیزیں لے کر اس پر تاثرات ظاہر کرنے کا فن ہے

ہمارے یہاں ہوا کیا کہ جرنلزم نے ادب پر حملہ کر دیا چنانچہ جرنلزم کی جو قدریں ہوتی ہیں، جوڑ توڑ کی اور کردار شکنی کی، تو ادب پیچھے رہ گیا اور ادیب آگے آگیا۔

لیکن جب ہندوستان میں آئے تو اس نے فلسفے کا رخ اختیار کیا۔ اس نے طنز کا رخ اختیار کیا اس نے مزاح کا رخ اختیار کیا۔ بلکہ جواب مضمون کا حتی کہ ESSAY کا لفظ اپنے اصل CONNATATION سے NARROW ہو گیا۔ یہاں تک کہ چارلس لیمپ آتا ہے پھر HAZLIT آتا ہے پھر بیسویں صدی کے CHESTERTON اور دوسرے لوگ آئے اور اب آکر انھوں نے ESSAY کو دریافت کیا ہے۔ اس کے صحیح مفہوم کو۔ لیکن جب کوئی ANTHOLOGY وہاں سے آتی ہے۔ اس میں ہر قسم کے مضمون شامل ہو جاتے ہیں۔ انھیں لوگ پڑھتے ہیں اور کہتے ہیں یہ بھی انشائیہ ہے اور وہ بھی انشائیہ ہے۔ ہم کہتے ہیں ان میں سے چند انشائیے ہیں۔

مظفر حنفی: ڈاکٹر صاحب اس میں ان اساتذہ کی اس مجبوری کا بھی لحاظ رکھیں کہ آپ کے انشائیے یا جمیل آذر یا سلیم آغا قزلباش، ان لوگوں کے انشائیے نصاب میں شامل نہیں ہیں۔ نصابوں میں جو چیزیں شامل چلی آرہی ہیں انھیں ہم اب تک انشائیہ کہتے چلے آرہے ہیں۔ انشائیہ کی جو تعریف اب جاکر بدلی ہے، اس کے پیش نظر اب ہم ان پرانی چیزوں کو کس نام سے یاد کریں؟ ہمیں طلبا کو پڑھانی تو وہی نگارشات ہیں—!

وزیر آغا: دیکھیے میں عرض کروں ہوا کیا ہے۔ انشائیہ کا لفظ اب رائج ہوا ہے پہلے تو اس کو آپ مضمون کہتے تھے طنزیہ مضمون یا مزاحیہ مضمون کہتے تھے—

مظفر حنفی: ہمارے ہاں تو ایک پوری کتاب "اردو ایسیز" کے نام سے ہے ظہیر احمد صدیقی کی اس میں انشائیہ استعمال ہوا ہے۔

وزیر آغا: جب ہم نے اسے استعمال کیا یہ لفظ موجود تھا البتہ LIGHT ESSAY کے معنی میں نہیں تھا یہ لفظ موجود ہے۔ کوئی فرق نہیں کہ پوری طرح استعمال کیا گیا ہو۔ اب جب یہ رائج ہوا ہے تو اس کے جو امتیازی اوصاف ہیں انھیں

مروّج رکھنا چاہیے اور طنزیہ مزاحیہ اور جوابِ مضمون سے الگ رکھنا چاہیے۔

مظفر حنفی: وزیر آغا صاحب! غالباً آپ خوش ہوں گے یہ جان کر کہ ہمارے یہاں مُلا وجہی پر جب کام کیا گیا تو "سب رس" میں پند و نصائح سے متعلق جو لمبے چوڑے ٹکڑے ہیں، ان سب کو ایک صاحب نے یکجا کر دیا ہے (جاوید وشسشٹ نے۔ وزیر آغا) اور انشائیہ کے نام سے کیا ہے۔

وزیر آغا: اچھا یہ بھی ہمارے یہاں ایک عجیب و غریب بات ہوئی کہ جب بھی کوئی نئی صنف رائج ہوئی ہے تو اس کے ساتھ کسی آدمی کا نام وابستہ ہو جاتا ہے۔ اسے تحریک دیتے ہیں۔ اس کا ردعمل ہوتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ صاحب یہ نئی چیز نہیں اس کا تو رشتہ الہامی کتابوں تک جاتا ہے۔ ویدوں تک چلا جاتا ہے عہد نامہ جدید و قدیم تک چلا جاتا ہے۔ یہ انسانی فطرت ہے۔ میں کہتا ہوں مان لینا چاہیے اگر کہیں سے ایک تحریک شروع ہوتی ہے۔

مظفر حنفی: یعنی سیدھے سیدھے مان لیں کہ ڈاکٹر وزیر آغا نے ایک تحریک چلائی اور کامیاب ہو گئے؟

وزیر آغا: ایک صاحب نے مجھ سے یہی کہا کہ انشائیہ کے بارے میں لوگوں کا یہ خیال ہے کہ آپ اس کے بانی ہیں۔ میں نے کہا میں تو کبھی ایسی بات نہیں کہوں گا۔ ایک صنف جو تین سو چار سو سال سے یورپ میں چلی آرہی ہے۔ اس کا میں بانی کیسے ہو گیا۔ ہم نے تو اس تحریک کو آگے بڑھایا ہے۔ بانی بالکل نہیں۔

مظفر حنفی: نہیں ڈاکٹر صاحب ایسا تو ہوتا ہے۔ ہائیکو اور مختلف اصناف کتنے سو سال کے بعد آپ کے یہاں آئے۔ یہ جدیدیت کی جو تحریک چلی علامت نگاری کی تحریک .... تو یہ ... تین سو سال کے بعد آئی ہے اردو میں۔ اور اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اگر اس کا کریڈٹ مناسب اشخاص کو دیا جائے۔ خیر —— ڈاکٹر صاحب! ابھی ادیب کے سلسلے میں اور اس کی معاشرے میں کیا اہمیت ہے۔ اور کیا نہیں ہے، اس سلسلے میں تھوڑی سی گفتگو نامکمل

ہمارے اخبارات کے ادبی صفحات نے ادب کو نقصان پہنچایا ہے۔ اور خاص طور پر ہماری جو نئی نسل ہے اُسے نقصان ہوا ہے۔

رہ گئی تھی .... آپ کے یہاں پاکستان میں شاعر و ادیب آج نیوز میں ہے یعنی آپ کے ہاں جو بڑے اخبارات ہیں ان میں ادبی کالم آتے ہیں اور درجہ اوسط کے ادیب بھی قاری کی نگاہ میں، کچھ تھوڑا سا عام انسان کے مقابلے میں زیادہ اہم سے نظر آتے ہیں، چونکہ وہ نیوز بنتے رہتے ہیں۔ اگر کوئی ادیب بیمار ہے تو اس کی خبر آتی رہتی ہے۔ اس کے بارے میں لطیفے شائع ہوتے رہتے ہیں حالانکہ اس کے مضر اثرات بھی ہیں لیکن ہمارے یہاں یہ بدعت یا صحت مند روایت، جو آپ تصفیہ... فرمائیں گے رائج نہیں ہے۔ آپ کے خیال میں جو یہ سلسلہ شروع ہوا ہے۔ پاکستانی اخبارات میں یہ بنیادی طور پر مفید ہے ادب کے لیے یا مضر ہے؟

وزیر آغا: دیکھیے میں نے اس پر بہت کچھ لکھا ہے اور بحثیں بھی کی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں ذاتی طور پر کہ یہ ایک بہت بڑا ہتھیار ادب کے ہاتھ میں آیا تھا۔ اس لیے کہ ادب تو چھوٹے چھوٹے رسالوں میں مقید تھا یا چھوٹی چھوٹی بحثوں میں تھا۔ اب یکایک ایک اخبار ایک لاکھ یا دو لاکھ میں چھپتا ہے، اس میں ایک پورا صفحہ یا دو صفحے اگر ادب کے لیے مختص ہو گئے ہیں تو یہ تو خدا کی طرف سے دین ہے۔ اس کا فائدہ اٹھانا چاہیے تھا لیکن ہمارے یہاں ہوا کیا کہ جرنلزم نے ادب پر حملہ کر دیا۔ چنانچہ جرنلزم کی جو قدریں ہوتی ہیں، جوڑ توڑ کی اور کردار شکنی کی اور جناب نام کو آگے بڑھانے کی، تصویر کو بڑھانے کی، نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ ادب پیچھے ہو گیا ادیب آگے آ گیا۔ اب ادیب کی شخصیت جو ہے وہ زیر بحث آرہی ہے جس کو چاہتے ہیں وہ زمین میں ملا دیتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں آسمان پر بٹھا دیتے ہیں۔ تو میں مجموعی طور پر یہ سمجھتا ہوں کہ ہمارے اخبارات کے ادبی صفحات نے ادب کو نقصان پہنچایا ہے اور خاص طور پر ہماری جو نئی نسل ہے اسے نقصان ہوا ہے۔ رسالہ جو ہے وہ تو کوئی تین مہینے کے بعد آتا ہے۔ اب تین مہینے میں مدیر کو وہ اپنی چیز دیتے ہیں، مدیر اسے

روایت اب ضخیم پرچوں کی ہوگئی ہے جو سال میں ۲-۳ بار نکلتے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ پرچہ کا چھاپنا بہت مہنگا کام ہے۔

واپس کرتا ہے کہ یہ نقص اس میں ہے وہ ایک طرح سے اس کو GUIDANCE ..... بھی دیتا ہے۔ اس کی تربیت بھی کرتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ اس کی چیزیں آنا شروع ہو جاتی ہیں۔ اخبار کی عمر پندرہ منٹ ہوتی ہے۔ رات کو لکھتے ہیں، صبح کو چھپ جاتا ہے .... تصویر چھپ جاتی ہے۔ اب نئے لکھنے والے جو ہیں وہ کہتے ہیں کہ آپ کس قسم کی باتیں کرتے ہیں کہ جناب اتنی محنت کریں۔ ایمرسن نے کہا تھا کہ ادب میں نوّے فیصد PERSPIRATION ہونا چاہیے نئے لکھنے والے اس محنت سے کیوں بھاگتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ادب کا معیار کم ہوتا جا رہا ہے۔ دن بہ دن۔

مظفر حنفی: صحیح فرمایا آپ نے میرا بھی یہی خیال تھا حالانکہ ہندوستانی ادیبوں کو تھوڑا سا بڑا .... للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔

وزیر آغا: اس لیے دیکھتے ہیں کہ اپنے رخ زیبا کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ اب ادیب کو کوئی ضروری نہیں کہ اپنے رخ زیبا کو دیکھے ...... ہمارے مولانا صلاح الدین احمد جب میں نیا نیا ادب میں آیا تو لطیفے کی بات وہ کہتے تھے کہ ان ادیبوں کی چیزیں پڑھیں کبھی انھیں ملیں نہیں، نہ ان کی تصویر دیکھیں ورنہ آپ کا تصور پاش پاش ہو جائے گا....

مظفر حنفی: میں بھی یہی سمجھتا ہوں کہ تصویر کا زیادہ چھپنا بہتر نہیں ہے .... ہاں یہ تو تجربے سے ثابت ہوا ہے۔

وزیر آغا: مثلاً ریڈیو اور ٹیلی ویژن کا فرق دیکھ لیجیے کہ ٹیلی ویژن میں تو اس کا جو اپنا تصور ہے اس ڈرامہ کا یا تصویر کا وہ پیش کر رہا ہے۔ (بیشک۔ مظفر حنفی) اور ریڈیو میں جو تصور آپ کے ذہن میں ہے وہ آپ CREAT کر رہے ہیں۔ دیکھیے کتنی وسعت ہے۔ تمام کرداروں کی شکلیں آپ بنا رہے ہیں لیکن وہ جو فلم والا ہے وہ خود بنا کر دے رہا ہے۔ تو مطلب اس میں...

مظفر حنفی: یعنی سامع اور قاری دونوں شریک ہو جاتے ہیں۔ تخلیقی عمل میں ریڈیو پر یا کتاب میں لیکن ٹیلی ویژن میں اور فلم میں سب کچھ بنا بنایا ملتا ہے۔

وزیر آغا: بیشک۔

مظفر حنفی: ڈاکٹر صاحب۔ چونکہ یہ ادبی کالم کی اور اخبارات کی بات چیت چل رہی ہے اور ظاہر ہے کہ اخبارات لاکھوں کی تعداد میں چھپتے ہیں۔ ادیب ان کے ذریعے عوام تک ایک ساتھ لاکھوں عوام تک پہنچ سکتا ہے۔ اس لیے بھی شاید یہ صورت حال ہو اس پر مجھے یہ بھی یاد آیا کہ ہمارے یہاں یہ جو "بیسویں صدی" نکلتا ہے اس کی تعداد بھی ماشاء اللہ کافی ہے اور یہ پاپولر قسم کا لیکن ادبی پرچہ ہے۔ خالص ادبی پرچے ہمارے یہاں معدودے چند ہیں اور ان میں بھی ایک آدھ کو چھوڑ کر، ہزار، دو ہزار جن کی تعداد اشاعت ہے، باقی سب گنٹے دار نکلتے ہیں۔ آپ کے یہاں صورت حال نسبتاً کچھ بہتر ہے کہ وہاں 'اوراق' نکل رہا ہے۔ "نقوش" نکلتا ہے "فنون" ہے۔ لیکن جو ادبی ماہناموں کی ہمارے یہاں بڑی شاندار روایت تھی جیسے "عالمگیر" "ادبی دنیا" "مخزن" "نیرنگ خیال" "زمانہ" "ہمایوں" "ساقی" وغیرہ... باقاعدگی سے نکلتے تھے اور ہر مہینے ایک خاص معینہ تاریخ کو خریدار تک پہنچتے تھے، ادیبوں اور شاعروں کا ایک تازہ قافلہ اس میں مسلسل شریک ہوتا رہتا تھا۔ یہ صحت مند روایت ختم ہو رہی ہے۔ آپ کے یہاں کیا صورت حال ہے۔ باقاعدگی سے نکلنے والے ادبی ماہنامے کراچی کے "افکار" کے علاوہ اور بھی کچھ ہیں...

وزیر آغا: نہیں۔ میرا خیال ہے جو آتے بھی ہیں۔ وہ چند ایک پرچوں کے بعد ہی ختم ہو جاتے ہیں۔ روایت اب ضخیم پرچوں کی ہو گئی ہے اور تین چار مہینوں میں یا سال میں دو تین بار نکلتے ہیں۔ اس کی کئی وجہیں ہیں۔ ان میں سے ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ اب پرچے کا چھاپنا بہت مہنگا کام ہے اس کے لیے آپ کو اشتہارات چاہییں اب اشتہارات حاصل کریں۔ کاتب جو ہے وہ ایک بڑی تکلیف دہ مسئلہ ہو گیا ہے....

منظفر حنفی: لیکن آپ کے ہاں نوری نستعلیق اور اردو کمپیوٹر آگیا ہے۔
وزیر آغا: مگر ابھی وہ مہنگی ہے۔ وہ آئے گی تو اس سے کچھ مسئلہ حل ہوگا تو کاتب کا مسئلہ بھی ہے، اشتہار کا مسئلہ بھی ہے تو اس وجہ سے وہ جو ماہنامہ تھا، متاثر ہوا۔ اچھا اس کا ایک اور اثر بھی ہوا۔ اخبار میں جو آپ کے ادبی صفحات آتے ہیں انھوں نے یہ کام کیا یہ ہر ہفتے کے بعد آجاتے ہیں اب وہ جو پڑھنے والا ہے، اس کی بھی تسکین ہو جاتی ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں یہ جو ادبی صفحات ہیں میں ان کے خلاف نہیں ہوں۔ میں یہ کہتا ہوں کہ اگر ان میں اچھے انٹرویوز شائع ہوں، اچھے موضوعات پر گفتگو ہو۔ یہ بیشک ملحوظ رکھیں کہ اس کو اتنا بلند آہنگ نہ بنا دیں مگر یہ ضرور دیکھیں کہ ہم نے ادب کو ایک عام قاری تک پہنچانا ہے۔ اس طرح سطح پر اگر لایا جائے تو ادب کو بہت فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

منظفر حنفی: بھائی ایک چیز میں نے اور محسوس کی.... اس سلسلے میں میں نے ایک مضمون بھی لکھا تھا جس پر خاصی ہنگامہ آرائی ہو رہی ہے لیکن بنیادی طور پر میرا مقصد بڑا نیک تھا میں نے عرض کیا تھا کہ یہاں سے جو ادیب و شاعر پاکستان پہنچتے ہیں اور آپ تک کثیر الاشاعت اخبارات "جنگ" "امروز" "حریت" یا "مشرق" وغیرہ یہ انٹرویو شائع کرتے ہیں.... تو یقیناً ہوگا تو تشخیص تو ہونی چاہیے اب یہ کیا کہ ایک ہفتہ میں ایک ایسے ادیب کا انٹرویو چھپ رہا ہے جس نے ساری عمر اپنی ادب میں صرف کی ہے اور دوسرے دن ایک ایسے کا انٹرویو آرہا ہے جس کی ابھی ایک کتاب بھی نہیں آئی....

منظفر حنفی: دوسری طرف یہ بھی ہے کہ بڑا عالم اور اچھا فنکار انکسار سے کام لیتا ہے۔ معمولی آدمی بڑھ چڑھ کر باتیں کرتا ہے۔

وزیر آغا: اب اس پس منظر میں دیکھیے ایک آدمی ہے... جس کی اپنی کوئی CONTRIBUTION تو ہے نہیں لیکن یہ چور دروازے سے آجاتے ہیں اب اس بارے میں بہت سی کہانیاں مشہور ہیں کہ ان کی سماجی حیثیت کیا ہے وہ GIVE AND TAKE کتنا کر سکتے ہیں۔ وہ آپ کو انگلستان بلا سکتے ہیں۔ کینیڈا بلا سکتے ہیں کہ نہیں بلا سکتے اور جو ادبی صفحے کا ایڈیٹر ہے اب وہ کیا کر رہا ہے۔ کیا مقاصد اس کے سامنے ہیں، کتنے فائدے اٹھا رہا ہے۔ اس نے بڑا نقصان پہنچایا ہے۔ جو عام ریڈر ہے، جو اسکولوں میں اور کالجوں میں پڑھتے ہیں۔ وہ تو انھیں ہی ادیب سمجھیں گے نا جن کی تصویریں چھپ رہی ہیں۔ اس کا احتساب ہونا چاہیے

منظفر حنفی: میں بھی سمجھتا ہوں کہ مناسب شخص کا ہی انٹرویو لینا چاہیے اور مناسب شخص انٹرویو لے رہا ہو یعنی جن صاحب کے سلسلے میں میں نے وہ مضمون لکھا تھا، نام نہیں لے رہا تو ان کے انٹرویو جو آپ لیتے ہیں، انھیں ادبی حیثیت کا حامل ہونا چاہیے تاکہ انٹرویو دینے والا شخص مناسب محتاط اور حق بجانب تناظر میں گفتگو کرے... مثلاً اکثر لوگ بڑی بلند آہنگی کے ساتھ باتیں کرتے ہیں اس لیے ان کا انٹرویو لینے والا ناواقف یا مبتدی شخص ہے اگر باتیں کسی اہم اور معقول آدمی سے ہو رہی ہوں تو گفتگو کی سطح بلند آہنگ ہوگی۔

وزیر آغا: آپ نے بہت عمدہ بات کہی ہے ایک اور پہلو بھی ہے اگر یہ CRITERIA ہو جائے کہ ہر وہ شخص ادیب ہے جس کے پاس ویزا ہے یا پاسپورٹ تو کیا ہوگا ہندوستان سے پاکستان جاتا ہے یا وہاں سے یہاں آتا ہے، اس کے پاس ویزا یا پاسپورٹ رہا ہوں میں ان کا تو انھوں نے ذاتی گفتگو میں کہا کہ بھائی آپ نے پاکستان میں چھپنے والے میرے انٹرویو پر اعتراض کیوں کیا اور مضمون کیوں لکھ دیا۔ اس کے بجائے تو آپ مجھے خط لکھ کر پوچھ لیتے میں یہ باتیں واضح کر دیتا تو میں نے ان سے یہی عرض کیا تھا کہ دیکھیے۔ آپ جس پرچے میں انٹرویو دے کر آئے ہیں، وہ لاکھوں میں چھپتا اور بکتا ہے۔ اس کے بعد وہ انٹرویو تین جگہ پر ڈائجسٹ ہوا ہے تو لاکھوں کی تعداد میں لوگ غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے۔ لوگ

ہم نے ادب کو ایک عام قاری تک پہنچانا ہے اس کو اگر سطح پر لایا جائے تو ادب کو بہت فائدہ پہنچ سکتا ہے —

آپ کے اس انٹرویو کو پڑھ کر میرا شکریہ ادا کیجیے کہ میرے اعتراض پر آپ نے جھلایا ہوا جواب ہی سہی، کچھ باتوں کی وضاحت کی تو وہ لوگ جان جائیں گے جن کو آپ کی غلط بیانی سے تکلیف پہنچی تھی ورنہ ذاتی طور سے میں آپ سے پوچھتا تو اس کی وضاحت کتنے لوگوں تک پہنچتی۔

وزیر آغا: سچ فرمایا آپ نے۔ اس میں یہ ہے کہ اب صحافت جو ہے یا ادب جو ہے اس میں HONESTY جو ہے...... اس کو تو بڑی مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اب مثال کے طور پر بہت سے لوگ ہیں جو یہاں آکر انٹرویو دیتے ہیں۔ ادیبوں کے انٹرویو یہاں سے لے جاتے ہیں۔ اب اس میں اس قسم کے POINTED سوالات کرتے ہیں جس سے ان کا کچھ مقصد حاصل ہوتا ہے۔ فرمایئے جی انشائیے کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ فلاں کے بارے میں، اچھا اب آپ نے اگر کوئی کلمۂ خیر بھی کہا ہے تو وہ اسے کاٹ دیتے ہیں۔ مسخ کر دیتے ہیں۔ اس سے تو نقصان اور بھی پہنچے گا۔

مظفر حنفی: ڈاکٹر صاحب پہلے تو ہم اطمینان دلائیں ادارہ بیسویں صدی کی جانب سے کہ جو کچھ آپ فرما رہے ہیں اس کا ایک ایک لفظ شائع کیا جائے گا۔ لفظ بہ لفظ ویسا ہی خواہ وہ رسالے کے حق میں جاتا ہو یا ہمارے خلاف جاتا ہو۔

وزیر آغا: ہمارے بیچ کوئی بات ایسی نہیں ہوتی جسے کاٹنے کی ضرورت آئے لیکن عام طور پر جیسا کہ میں نے کہا ہے۔

مظفر حنفی: خصوصاً انھیں اخبارات میں جن میں یہ ادبی کالم شائع ہو رہے ہیں۔ ہم نام نہیں لیتے کسی اخبار کا... لیکن ایک رویے کی بات کر رہے ہیں۔

وزیر آغا: رویہ یہ عام ہو گیا ہے کہ مسخ شدہ تحریریں شائع ہوتی ہیں۔ جو جی چاہتا ہے۔ وزیر آغا صاحب یہ بات کہہ دیں۔ کسی وقت ہم اپنی طرف سے ڈال دیتے ہیں۔ ان میں....

مظفر حنفی: ایک بات اور رہی جاتی ہے جیسا آپ نے ادبی کالم کے بارے میں فرمایا۔ ویسے ہی تھوڑا متنازعہ یا بحث طلب مسئلہ نثری نظم کا بھی ہے... مجھے آپ کے ذاتی تصورات اور خیالات کا

> میں نثری نظم کے خلاف نہیں ہوں، لیکن میں کہتا ہوں کہ نثر اور نثری نظم کے درمیان آپ ایک حدِ فاصل تو قائم کریں گے۔

علم ہے کسی حد تک لیکن میں چاہتا ہوں کہ اس میں "بیسویں صدی" کے قارئین بھی SHARE کریں۔ یہ فرمائیں کہ آپ نثری نظم کے کس حد تک قائل ہیں؟

وزیر آغا: بات یہ ہے جی کہ آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے ۱۹۴۰ء کے لگ بھگ جدیدیت کی تحریک کو آگے لانے کی کوشش کی۔ اس لیے میں تو ہر صنف کے حق میں ہوں جس میں امکانات ہیں۔ کیونکہ ادب کے راستے میں کسی قسم کا بندھ باندھنا نہیں چاہیے۔ جیسے ہائیکو ہے۔ ہم ہائیکو کو آگے لا رہے ہیں۔ ہم تجریدی افسانے کو آگے لائے ہیں۔ یہ جو علامتی افسانہ ہے اسے لائے، تنقید کے میدان میں..... تو یہ کیسے ہو گیا کہ لوگوں نے مشہور کر دیا کہ آغا صاحب نثری نظم کے خلاف ہیں۔ میں نے کہا نثری نظم کے خلاف نہیں ہوں لیکن میں کہتا ہوں کہ نثر اور نظم کے درمیان ایک حدِ فاصل تو آپ قائم کریں گے۔ تو نثری نظم جو ہے نثر کی توسیع ہے۔ اسے آپ آگے بڑھایئے۔ اسے شاعری تو آپ نہ کہیے۔ پھر وہ مثالیں دیتے ہیں۔ مولانا حالی سے ادھر ادھر سے اس کو غلط سیاق و سباق میں پیش کرتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ شعری مواد تو ہر جگہ ہوتا ہے۔ اس کے بغیر تو کوئی فن پارہ وجود میں آ ہی نہیں سکتا۔ لیکن وہی شعری مواد جب شعری آہنگ سے مملو ہوگا تو پھر وہ شاعری بنے گی اسے کوئی نظر انداز نہ کرے۔

مظفر حنفی: لیکن وہ بنیادی نکتہ ہے جسے نقاد عام طور پر نظر انداز کرتا ہے۔ آپ کی طرح سارے تخلیق کار اچھے نقاد بھی نہیں ہیں۔ اس لیے اور گڑبڑ ہوتی ہے۔

وزیر آغا: گڑبڑ یہ ہوتی ہے۔ اس میں آج صبح بھی میں ذکر کر رہا تھا کہ ہماری جو نئی GENERATION ہے اسے اب کوئی فرصت نہیں رہی ہے کہ وزن کیا ہوتا ہے اور ردیف کیا ہوتی ہے۔ قافیہ کیا ہوتا ہے۔ اسے اس سے کوئی غرض نہیں۔ کراچی سے ایک خاتون نے مجھے نثری نظمیں بھیج دیں کہ انھیں چھاپیں۔ میں نے انھیں لکھا کہ آپ پہلے پابند نظمیں مجھے بھیجیے۔ بعد میں نثری نثری نظموں کی بات ہوتی۔ انھوں نے کہا

بہت اچھا میں پابند نظمیں بھیج دیتی ہوں۔
پابند نظمیں جو بھیجیں تو وہ بھی ...
نثری نظمیں تھیں۔ اس سے نتیجہ یہ
نکلا کہ انھیں پتہ ہی نہیں ہے کہ پابند
اور نثری نظموں میں کیا فرق ہے۔
اور کہتی ہیں بہت آسان کام ہے یہ تو
جو جی میں آئے لکھیے۔ اس میں نہ
صرف یہ کہ ہیئت کے التزام کی ضرورت
ہے بلکہ خیال کے التزام کی بھی ضرورت
نہیں ہے حالانکہ ادب جو ہے وہ CREATIVE ASSOCIATION
ہے۔
اس میں آپ کا لاشعور کام کرتا
ہے۔ شعور بھی کام کرتا ہے۔
اگر اس کو نظر انداز کر دیں تو نتیجہ
یہی ہوتا ہے۔ جن لوگوں سے باتیں ہوتی
ہیں۔ وہ کہتے ہیں اور سب تو صحیح
ہے۔ ہم ابھی تک اچھی نثری نظم تخلیق
نہیں کر پائے۔ اپنے طور پر آپ نے
بیس سال ضائع کر دیے اور دوسروں
کا بھی بیڑا غرق کر دیا۔
مظفر حنفی: ایک مرتبہ ایک ایڈیٹر
نے ایک تحریر بھیجی۔ مختلف ناقدین
کو اور کہا کہ اس نثری نظم پر
اظہار خیال کر دیجیے۔ مجھ سے بھی
اظہارِ خیال کرنے کی فرمائش کی اور
میں نے انھیں سیدھے سیدھے لکھ دیا کہ
جو چیز انھوں نے بھیجی ہے وہ خراب
نثر کا نمونہ ہے۔ نثری نظم ہے ہی
نہیں۔ ہندوستان کے بہت بڑے
نقاد ہیں، میں نام نہیں لے رہا ہوں
ان کا۔ انھوں نے کہا یہ اچھی نثری
نظم ہے۔ اس کے بعد انھوں نے اس
نظم کا تفصیلی تجزیہ کر ڈالا۔ اسی کو
مدیر نے شائع بھی کیا اور آخر میں نوٹ
دیا کہ جناب یہ میں نے صفیہ اریب
کے ناولٹ جھاگ اور سمندر کا ایک
نثری ٹکڑا بھیج دیا تھا۔ بتائیے یہ معیار
ہے نثری نظم کا اور ہماری تنقید کا۔
وزیر آغا: اچھا۔ یہ دلچسپ تجربہ وہاں
بھی ہوا۔ رشید امجد کے ایک افسانے
کا ٹکڑا اسی طرح پیش کیا گیا۔ اور
لوگوں نے اسے نثری نظم تسلیم کر لیا۔
اچھا اب کوئی CRITERIA اگر نہیں
رہ جاتا تو شناخت کیسے ہو۔ کسی آرٹسٹ
نے بہت بڑی بلڈنگ کی کپڑے پر
ایک تصویر بنائی۔ لوگوں نے بہت
تعریف کی۔ رات میں ایک سو بیس
میل فی گھنٹہ کی رفتار سے طوفان آیا

> یہ جو ہمارے یہاں ایک رویّے نے
> جنم لیا ہے کہ ادب کو میزان پر جانچنے
> کے بجائے — نظریے کے میزان پر
> جانچیے۔ یہ بات غلط ہے۔

اور وہ چیز اڑ گئی۔ کنٹراکٹ سمٹ گیا
اب وہ آرٹسٹ صاحب صبح کو آئے
اور کہنے لگے اس میں تو نئی
DIMENTION پیدا ہو گئی۔
اب بتائیے وہ اخبار میں آئی، اس
کی تصویر بھی آ گئی، اس نئی
Dimention کی۔ اب یہ تو کوئی
بات نہ ہوئی۔
مظفر حنفی: یہاں ایک صورت اور
بھی ہوئی اس کی "الفاظ" ایک
پرچہ علی گڑھ سے نکلتا ہے ......
زمانے میں ابو الکلام قاسمی اس
کے ایڈیٹر تھے۔ انھوں نے غالباً
اقبال مجید کے افسانوں کے اقتباسات
شائع کیے۔ اس کے بھی مختلف لوگوں
نے تجزیے کیے۔ لوگوں نے کہا
یہ نثری نظمیں ہیں۔ تو اس طرح
وہ نثر .... جیسا آپ نے
فرمایا جس میں شعری مواد شامل
ہے۔ اگر اسے بھی ہم نثری نظم کہنے
لگیں تو پوری آب حیات اور
"نیرنگ خیال" جو ہے اور انشائے لطیف
کے نام سے جو کچھ تھا وہ سب نثری نظم
ہے۔
وزیر آغا: بالکل، میں تو سمجھتا ہوں
مظفر صاحب، یہ جو ہمارے یہاں
ایک رویّہ نے جنم لیا ہے کہ ادب کو
ادب کے میزان پر جانچنے کے بجائے
نظریے کے میزان پر جانچیے یا کسی اور
میزان پر جانچیے۔ یہ بات غلط ہے۔
ادب کو ادب کے میزان پر آپ
دیکھیں تو پھر سارا مسئلہ حل ہو جائے
گا۔ اب نثری نظموں کو بھی اگر کوئی
ادب پارہ سمجھتا ہے تو ہم اسے خوش آمدید
کہتے ہیں۔
مظفر حنفی: ہاں صرف اس کے نام پر
اصرار نہ کیا جائے کہ اسے نثری نظم ہی
کہو۔
وزیر آغا: لیکن وہ جو اس میں ایک
CRITERIA ہے کہ ادبیت اس
میں ہونی چاہیے، وہ اپنی جگہ ہے۔
ایک WHOLE بنائیے۔ WHOLE
کے بغیر تو ..... یہ تو نہیں کہ آپ نے
لکھنا شروع کیا اور جہاں تھک گئے
وہاں قلم رکھ دیا اور چیز مکمل ہو گئی
یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی۔
مظفر حنفی: اس سلسلے میں شاید آپ
کو یاد ہو، پچھلی بار شاید فکشن سیمینار

کے سلسلے میں احمد ہمیش آپ کے ساتھ تشریف لائے تھے۔ شاید ۱۹۵۸/۵۹ء کے آس پاس۔ انھوں نے بے زمین نظمیں لکھنی شروع کی تھیں اور یہ لطیفہ مشہور ہوا تھا کہ احمد ہمیش نے میٹر توڑ دیا ــــ احمد ہمیش نے میٹر توڑ دیا تو آکٹر ڈاکٹر صاحب! میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ بیشتر نظمیں ساقی فاروقی اور دوسرے چند نام ایسے ہیں جو واقعتاً آزاد نظمیں اور پابند نظمیں بھی کہہ سکتے ہیں اور غزل بھی کہہ سکتے ہیں۔ اگر انھوں نے نثری نظم کہی ہے تو ہم تسلیم کریں گے کہ ہاں ٹھیک ہے۔ لیکن وہ لوگ جو شعر کہہ نہیں سکتے وہ نثری نظم بڑے زعم سے کہہ رہے ہیں۔ اور ان میں بڑی تعداد نقادوں کی ہے۔

وزیر آغا: میں ذاتی طور پر سمجھتا ہوں کہ شعوری طور پر ہیئت کا تجربہ اسی وقت ہوتا ہے جب تخلیقیت کم ہو جاتی ہے۔ مثلاً میرا جی کے زمانے کو لیجیے۔

اگر آپ کے اندر تخلیق ہے تو ہر تخلیق اپنا ایک چہرہ لے کر آتی ہے وہی اس کی ہیئت ہوگی تو جب کبھی کبھی ایسی بات ہوتی ہے تو مجھے شک پڑ جاتا ہے۔ اب مثلاً ساقی فاروقی کے یہاں مینڈک وغیرہ۔ میں ذاتی طور پر سمجھتا ہوں کہ یہ نظمیں.... زیادہ دن زندہ رہنے والی نہیں ہیں۔

مظفر حنفی: آغا صاحب، آپ کی یہ بات اپنی جگہ پھر بھی ساقی فاروقی کے یہاں کچھ اچھی نظمیں بھی ہیں۔

وزیر آغا: بھائی! جس طرح اسپیڈ بریکر ہوتا ہے اسی طرح ایک ٹائم بریکر بھی ہوتا ہے۔ ہر بیس سال کے بعد ــــ میں آپ کو یقین دلاؤں۔ پچھلے دنوں میں نے منٹو کو پڑھا۔ از سر نو پڑھا۔ اتنے عرصے کے بعد میں حیران رہ گیا۔ وہ افسانے جن پر اس کی ساری شہرت کا دار و مدار ہے، چیپ CHEAP قسم کی فلمی کہانیاں مجھے نظر آئیں۔ کل تین یا چار چیزیں اچھی ہیں۔ بلکہ اس کے "گنجے فرشتے" کہیں مجھے سپیریر SUPERIOR نظر آئے جنھیں وہ شہرت نہیں ملی۔ اس طرح ہمارے ترقی پسند ناقدین نے جن لوگوں کو

میں ذاتی طور پر سمجھتا ہوں کہ
شعوری طور پر ہیئت کا تجربہ
اُس وقت ہوتا ہے جب ــــ
تخلیقیت کم ہو جاتی ہے ــــ

اٹھایا آسمان پر اب آہستہ آہستہ وہ نیچے آ رہے ہیں زمانہ کسی کا لحاظ نہیں کرتا۔ چاہے جتنا بھی آپ ڈھول اور تاشوں کے ساتھ بات کریں۔ اسے اپنا فیصلہ دینا ہے۔ بیس سال کے بعد دے گا ــــ پچاس سال کے بعد دے گا لیکن ضرور دے گا

مظفر حنفی: ڈاکٹر صاحب جس زمانے میں آپ "ادبی دنیا" کے حصۂ نظم کے مدیر تھے، غالباً میرا جی حیات تھے یا انتقال ہو چکا تھا۔ کیا آپ کی.... ان سے کبھی ملاقات....

وزیر آغا: میں اُن سے کبھی نہیں ملا۔ جب میں آیا ہوں ادب میں۔ ہاں ایک واقعہ ہوا تھا۔ ملاقات آپ اسے کہہ لیجیے۔ میں نیا نیا ادب میں آیا تھا تو اخبار میں میں نے پڑھا بلکہ ادب سے دلچسپی ہوئی تھی۔ ادب میں آیا نہیں تھا۔ غالباً ۱۹۴۰ء کی بات ہوگی۔ تو اخبار میں چھپا کہ حسرت موہانی کے پوتے ہیں اور وائی۔ ایم۔ سی۔ اے میں وہ اپنا ایک لکچر دیں گے۔ میں بھی چلا گیا۔ ایک BECK BENCHER کے طور پر سب سے پیچھے بیٹھا ہوا تھا تو ایک صاحب آئے۔ اُن کی بڑی بڑی مونچھیں تھیں.... عجیب حلیے کے آدمی تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ یہ کون ہیں جو اسٹیج پر حسرت موہانی کا تعارف کرا رہے ہیں تو انھوں نے بھاری آواز میں کہا۔ آپ نہیں جانتے یہ کون ہیں؟ میں نے کہا۔ جی میں نہیں جانتا۔ کہنے لگے۔ یہ مولانا صلاح الدین احمد ہیں۔ اچھا تو بات ختم ہو گئی۔ اس کے بعد جب میں ادب میں آیا تو اس کے دو تین سال کے بعد مجھے ایک تصویر ملی جس سے پتہ چلا کہ بھاری آواز والے جن صاحب سے میں ملا تھا وہ میرا جی تھے۔

مظفر حنفی: بہرحال۔ ان کے لہجے میں جذباتیت جس قدر تھی، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا صلاح الدین صاحب سے وہ بھی بہت محبت کرتے تھے۔

وزیر آغا: وہ صلاح الدین احمد صاحب کے جوائنٹ ایڈیٹر تھے۔ اب میرا ان سے رشتہ یہ بنتا ہے کہ وہ بھی شریک مدیر تھے اور میں بھی اس

کے بیس سال کے بعد "ادبی دنیا" کا
شریک مدیر ہوا۔ انھوں نے بھی جدید
نظم کے فروغ میں حصّہ لیا اور میں
نے بھی لیا۔ پھر میں نے یہ کیا کہ میراجی
کو DISCOVER کیا۔ اور دھرتی پوجا
والے مضمون میں اس روایت کو
آگے بڑھانے کی کوشش کی۔ آپ نے
فرمایا ہے ابھی کہ آخری دور جو
"ادبی دنیا" کا تھا اس میں مجھے
شاعری کا حصّہ دیا گیا۔ بات بالکل
صحیح ہے ۔ وہ جو کہتے ہیں کہ مجھے
کھڑے ہونے کی اجازت دیں تو
لیٹنے کی میں خود بنالوں گا، تو یہی
کام میں نے کیا... اس کے بعد
اس رسالے میں تمام جتنے مباحث
چھڑے اور تجزیاتی مطالعے وغیرہ کا
سلسلہ میں نے شروع کیا اور مولانا
کا دل تو کشادہ تھا اور ان سے
دوستانہ قسم کے جھگڑے بھی ہوتے
رہے۔ مثلاً مولانا چاہتے تھے کہ مضمون
شائع ہو تو ادیب کا نام آخر میں آئے
اب دیکھیے۔ یہ رویے کا فرق ہوتا
ہے۔ میں نے کہا۔ مولانا زمانہ بدل
گیا ہے۔ نام آپ اوپر آنے دیجیے۔
پھر فیصلہ ہوا کہ شاعری میں آپ
نام اوپر لے آئیں۔ نثر میں میں نیچے
ہی رکھوں گا۔

مظفر حنفی: میں تو تخلیقات کی بات
کرتا ہوں۔ آپ نے ان کی اخلاقیات
پر عمل کیا ہے۔ جب آپ کی تخلیق
"اوراق" میں چھپتی ہے تو بالکل [illegible]
کے بعد چھپتی ہے۔ فہرستِ مضامین
میں آخری نام جو ہوتا ہے وہ وزیر
آغا کا ہوتا ہے۔

وزیر آغا: پھر یہ ہوا کہ میں نام نہیں
لیتا، ایک مقتدر ادیب نے جن کا
پرچم بہت مشہور پرچہ ہے، وہ اپنے
مقام کا خود یقین کرتے تھے۔ جب
انھوں نے دیکھا کہ یہ شخص سب سے
آخر میں اپنا نام لکھتا ہے تو انھوں نے
بھی لکھنا شروع کر دیا۔

مظفر حنفی: اس قسم کی روایت ہمارے
یہاں بھی پڑ جائے۔ ادھر جو خالص
ادبی پرچے چل رہے ہیں۔ ان میں
مدیران کی تحریریں جب چھپتی ہیں
تو SENIOR MOST لکھنے
والوں سے بھی پہلے چھپتی ہیں۔ ہر
رسالے میں سب سے پہلے مدیر ہوگا

یہ بات بالکل صحیح ہے کہ ۔۔ وہ جو
کہتے ہیں کہ مجھے کھڑے ہونے کی
جگہ دیں تو ۔۔ لیٹنے کی میں خود بنا
لوں گا ۔۔ تو یہی کام میں نے کیا۔

وزیر آغا صاحب! غالباً آپ بھی
یہ محسوس کرتے ہوں گے کہ ہمارے
ادیبوں اور شاعروں میں جو عالمانہ
انکسار اور بے نیازی ہونی چاہیے
اس کا بڑا قحط ہے۔

وزیر آغا: اب دیکھیے مثلاً "اوراق"
کی ہمیشہ سے پالیسی رہی ہے کہ ہماری
اپنی جو کتابیں ہیں، میں نے جو
لکھی ہیں کبھی ان پر تبصرہ "اوراق"
میں نہیں شائع ہوا۔ اس پر کہیں
اور شائع ہو جائے اور بات ہے۔
لیکن میں نے کئی ایسے رسائل دیکھے
ہیں جن میں لوگ اپنے بارے میں
خود ہی لکھوا رہے ہیں...

مظفر حنفی: یہ پرچہ جو ہے اپنے قبضے میں۔
بالفرض کسی شخص کے اعتراض کو وہ
اپنے رسالے میں جگہ بھی دیتے ہیں تو
مدیر کے اوپر کوئی اعتراض کیا
گیا تو وہ چار سطروں کا ہوگا...
پھر مسلسل تین صفحوں میں اس شخص
کی غلطیاں گنائی جائیں گی اور یہ
کہ اعتراض کرنے سے پہلے تم اردو
سیکھ لو۔ تو یہ اخلاقیاتِ ادب کے
خلاف ہے۔ ادبی اخلاقیات اور مدیرانہ
صحافت میں جو بردباری چاہیے.....
وہ نہیں ہے ۔۔ خیر ۔۔ ابھی ڈاکٹر صاحب
آپ نے دھرتی پوجا کے بارے میں ذکر
کیا اور اسی طرح ایک طلائی تثلیث
والا سلسلہ چلا تھا۔ خاصی گرد اڑائی
گئی دھرتی پوجا کے نام پر۔ پاکستانی
کلچر کے بارے میں بھی آپ کے چند
مضامین شائع ہوئے تھے۔ اس کے
اوپر بھی لوگوں نے کتنا ہنگامہ کھڑا کیا
تھا۔

وزیر آغا: اصل میں بات یہ ہے کہ جب
یہ مضمون چھپا کئی بار "دھرتی پوجا کی
ایک مثال" تو اسے بہت پسند کیا
گیا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ رسائل بھرے
پڑے تھے۔ ہندوستان میں بھی اسے
دوبارہ چھاپا گیا۔ لیکن اس کے بعد
جب "اردو شاعری کا مزاج" آئی۔

مظفر حنفی: دھرتی پوجا اور میراجی...
عمیق حنفی کا جوابی مضمون بھی تو
آیا تھا؟

وزیر آغا: مگر یہ سب باتیں "اردو
شاعری کا مزاج" کے بعد کی ہیں۔
کیونکہ "دھرتی کی پوجا" کی مثال
تو ایک TRIGGER تھا۔ اس

سے مجھے ایک خیال پیدا ہوا کہ ثقافتی
جڑیں ہمارے ادب کی کہاں ہیں۔
اس کی تلاش میں میں نے میرا۔جی
کو پہلے دیکھا۔ پھر میں نے دیکھا
کہ میرا۔جی ادھر بہت قریب ہیں۔
جڑیں تو بہت دور تک جا رہی ہیں
تو پھر میں پیچھے ہٹتا چلا گیا۔۔ اور
اس طرح سے زمین کا موقف دھرتی
کی اہمیت جو ہے سامنے آگئی، تو
دھرتی پوجا اسی حوالے سے تھا۔۔
دھرتی پوجا کا مطلب بت پرستی
تو نہیں تھا۔ لیکن لوگوں نے
کہا کہ بت پرستی سکھا رہے ہیں۔
مظفر حنفی: اور اسلامی مملکت میں
رہ کر سکھا رہے ہیں۔
وزیر آغا: تو بت پرستی تو یہ نہیں
تھی۔ پھر آہستہ آہستہ صورت حال
بدلی پھر SANITY آئی۔ اب
آپ دیکھیے ایک گیت مشہور ہوا
ع سونی دھرتی اللہ رکھے قدم قدم آباد
یہ جب چھپا تو مجھے بڑی خوشی
ہوئی۔ میں نے کہا دیکھا۔ وہ بات میں
نے سچ کہی تھی۔ آج اس کا اثر ہوا۔ یہ
دھرتی سے مراد کئی سطحوں پر ہے۔۔
اپنے وطن کی دھرتی۔ حب الوطنی کا تقاضا
یہ ہے کہ جس دھرتی پر میں رہ رہا
ہوں، جو مجھے غذا دیتی ہے، میں اس
کی عزت کروں۔ پھر یہ کہ میری بھی
تو ایک دھرتی ہے۔ یہ جسم میری دھرتی
ہے۔ پھر میرے اندر اجتماعی لاشعور
جو ہے یہ میرے نسل کی دھرتی ہے۔
اس وسیع تناظر میں لوگ دیکھ نہ سکے
وہ کٹھ ملائیت والا رویہ تھا۔ اب
جو میں نے "شام کی منڈیر سے" میں
اس کو واضح کر دیا ہے۔ اور اس
کا تعلق عجیب و غریب بات ہے کہ اپنی
شادی سے میں نے جوڑا ہے۔
مظفر حنفی: کیا خوبصورت پہلو تھا
اس کا۔ "شام کی منڈیر سے" میں
بار بار پڑھنے کی چیزیں ہیں وہ بھائی
جان۔ "اوراق" میں ابھی پچھلے دنوں
..... "تازہ ترین جو اوراق" ہے اس
میں دبستان لاہور سے متعلق میں
نے آپ کے خیالات پڑھے۔ اس سے
پیشتر غالباً طنزاً لوگ "دبستان سرگودھا"
کہا کرتے تھے۔ بعد میں واقعتاً پھر
وہ دبستان ہی ہو گیا۔ وہاں جیلانی
اصغر صاحب ہیں، انور سدید ہیں،

دھرتی پوجا کا مطلب بت پرستی
تو نہیں تھا۔۔ لیکن لوگوں
نے کہا کہ یہ بت پرستی سکھا
رہے ہیں۔۔

راغب شکیب ہیں، سجاد نقوی ہیں،
کافی بڑی نسل ہے۔ تو وہ دبستان
سرگودھا بھی مسلم ہو گیا۔ اس اعتبار
سے اگر ہم دبستانوں کی تقسیم فیاضی
کے ساتھ کرتے چلے گئے تو کیا بہت
سارے دبستان نہیں بن جائیں گے؟
وزیر آغا: بات یہ ہے کہ ہمارا اس
وقت بھی یہ موقف تھا کہ دبستان
سرگودھا در اصل دبستان لاہور ہی
ہے۔ لوگوں نے طنزاً کہا، ہم نے
بھی مذاق میں کہا۔ ورنہ وہ جواب
یا عذر کے طور پر تھا..... اپنی
تھیسس میں جو میں نے
کی
کہا کہ ہر دبستان کی ایک
WIDER LAND ہوتی ہے۔ اب
جو پورے کا پورا پنجاب ہے جہاں
سے دبستانِ لاہور کو غذا.....
مہیا ہوتی ہے۔ خود لاہور میں
کتنے ادیب پیدا ہوئے ہیں۔ علامہ
اقبال بھی، فیض بھی سب باہر سے
آئے ہیں۔ وہ پنجاب سے ابھر کر آئے
ہیں اور آکر لاہور میں ان کی تربیت
.... ہوئی ہے۔ یہاں انھیں زور
بھی ملتا ہے ان کی نفسیات کی
تشکیل بھی ہوتی ہے یہ تو مرکزی
نقطہ ہوتا ہے۔
مظفر حنفی: بلاشبہ دلی کے دبستان کا
مطلب یہ نہیں کہ دلی کے ارد گرد کی
فضا دلی سے منقطع ہے۔ یا نواحِ لکھنؤ
کا ماحول لکھنؤ کی فضا سے منقطع ہے۔
وزیر آغا: پورے کا پورا علاقہ ہوتا ہے
جس کا مرکز تعلق اس کا دبستان
بنتا ہے۔
مظفر حنفی: تو اس کا مطلب یہ
ہے کہ اس دبستان لاہور کی جو
بنیاد ہم مانیں وہ انجمن پنجاب وغیرہ
کے وقت سے پڑ گئی تھی۔
وزیر آغا: ہاں ہاں وہ وہیں سے
شروع ہوتی ہے۔ اب آپ دیکھیں
نظم کا WATER FLOW اس دھرتی
کے ساتھ کتنا ہے..... اور
اقبال جب پہلی نظم لکھتے ہیں تو
ہمالہ پر لکھتے ہیں۔ دیکھنے والی بات
ہیں کہ کیوں ایسا ہوتا ہے۔
مظفر حنفی: میری سمجھ میں تو کچھ یہ آتا
ہے اور میں اپنے احباب سے
اکثر یہ کہتا رہتا ہوں کہ پنجاب کی
دھرتی نظم اور افسانے کے لیے بڑی

زرخیز ہے۔ اور اس کے مقابلے میں ہمارے یہاں ہندوستان میں غزل کے لیے فضا ہموار تھی اور ہے
وزیر آغا: بڑی عجیب و غریب بات ہے۔ اور میں آپ کے خیال سے اتفاق کرتا ہوں .... اور اس میں بڑی دلچسپ باتیں ہیں۔ میں نے تو لکھا بھی ہے کہ جب آریہ لوگ یہاں آئے تھے تو جب تک وہ پنجاب میں سے گزرتے رہے تو وید تخلیق کرتے رہے جو شاعری ہے لیکن جب یو۔پی میں آگئے تو اپنشد تخلیق کیے جو نثر ہے
مظفر حنفی: لیکن میں تو دوسری بات کہہ رہا ہوں کہ فکشن میں بھی پنجاب خاصا زرخیز ہے۔ چنانچہ ہمارے بیشتر بڑے افسانہ نگار پنجاب کی دین ہیں۔
وزیر آغا: اس میں ایک دور عجیب و غریب آیا جو مجھے اچھا لگا وہ یہ ہے کہ MEN AND CIVILIZATION ایک کتاب لکھی HORTINGTON نے، اس نے کہا کہ جو موسمی حالات ہوتے ہیں وہ ایک ملک کے کلچر میں اور اس کے رویے میں اور زاویے کے تعین میں بہت زیادہ مددگار ثابت ہوتے ہیں تو یہاں موسمی مدوجزر زیادہ ہوگا۔ زیادہ آئیں گے Thunder Blooms تصادم زیادہ ہوگا وہاں کلچرل فضا اور CREATINITY زیادہ ہوگی تو آپ دیکھیے کہ پنجاب کا سارا علاقہ جو ہے جنگیں ساری کی ساری وہیں ہوئیں حتیٰ کہ مہابھارت کا علاقہ بھی اُسے کہا گیا ہے۔ اس کے بعد تو اعتدال کی صورت پیدا ہوجاتی ہے۔
مظفر حنفی: اس سلسلے میں میں اور تھوڑا سا جاننا چاہوں گا۔ دبستانوں ہی کی حدبندی کرنا چاہیں تو پاکستان میں ہم کتنے ادبی دبستان تسلیم کریں گے؟
وزیر آغا: میں نے تو اس سلسلے میں یہ لکھا ہے کہ فی الحال تو مجھے لاہور کا دبستان نظر آتا ہے۔
مظفر حنفی: اور کراچی کے بارے میں کیا خیال ہے۔ لکھنے والوں ہی کی بڑی نسل بھی وہاں ہے اور رنگ بھی الگ ہے اُن کا۔
وزیر آغا: کراچی کا دبستان، دلی لکھنؤ کے دبستان کی توسیع ہے۔ بیشتر مہاجرین اپنا کلچر اپنے ساتھ لے کر آئے ہیں۔

جب آریہ لوگ یہاں آئے تھے تو جب تک وہ پنجاب میں سے گذرتے رہے وید تخلیق کرتے رہے جو شاعری ہے۔ اور جب یو۔پی میں آگئے تو اپنشد تخلیق کرتے رہے جو نثر ہے

مظفر حنفی: جیسے رامپور تھا یہاں پر لکھنوی دبستان کی توسیع رامپور تھا۔
وزیر آغا: میں اتفاق کرتا ہوں آپ سے، بات یہ ہے کہ یہ کوئی جھگڑے والی بات نہیں ہے۔ آج جو لاہور کی صورتحال ہے، پانچ سو سال کے بعد کیا ہوگی، ایک ہزار سال کے بعد کیا ہوگی، یہ چیزیں اس طرح تو نہیں رہیں گی۔ لیکن یہ STUDY کرنے کے لیے، مطالعہ کرنے کے لیے، بڑا اچھا طریقہ ہے کہ آپ اس طرح سے بھی دیکھیں۔ افراد کے ذریعہ بھی دیکھیں، دبستانوں کے ذریعہ بھی دیکھیں، تاریخ کے اعتبار سے بھی دیکھیں ANTHROPOLOGY کے اعتبار سے بھی دیکھیں۔ اب دیکھیں کہ سچائی کہاں ہے۔
مظفر حنفی: پچھلے دنوں میرے خیال ہیں دس پندرہ سال تو ہو ہی گئے، علی جواد زیدی صاحب نے ایک کتاب لکھی تھی "دو ادبی اسکول" شاید نظر سے گذری ہو، اس میں یہ ہے کہ لکھنوی دبستان میں دہلوی دبستان کی خصوصیات مل جاتی ہیں کیونکہ دہلوی دبستان میں بھی شاہ نصیر جیسے لوگ تھے جو ان صفات کے حامل تھے تو اس طرح ادب کو یوں اسکول وغیرہ میں تقسیم کرنا مناسب نہیں۔
وزیر آغا: لیکن اس طرح تو بڑی آسان بات ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ تمام جگہوں پر انسان ایک طرح کے ہیں —— آنکھیں بھی ہیں، کان بھی ہیں، لیکن اس کے علاوہ تخصیص بھی تو ہے۔ جب آپ ادب کا یا علوم کا تجزیہ کرتے ہیں تو.... تو اس کی تخصیص اور انفرادی احساس آپ کی اپنی تفہیم کے لیے ضروری ہیں۔ اس میں جگہ کی کوئی قید نہیں...
مظفر حنفی: اگر بچانوے فیصد لوگ اس خیال کے حامل ہیں یا اس وصف کے حامل ہیں تو وہ کلاں دبستان کا خاصہ ہوا اور دوسری صورت میں....
وزیر آغا: ابھی میں لکھ رہا تھا میرا خیال ہے کہ مزاح جو ہے ایک ایسی چیز ہے جس میں آپ کی سائیکی اور علاقے کی سائیکی اچھی طرح سامنے آتی ہے۔ کن باتوں پر آپ ہنس رہے ہیں، مسکرا رہے ہیں یا قہقہے لگا رہے

ہیں۔ تو میں نے کہا آپ فرق دیکھیں کہ لاہور میں جو مزاح ہے اب پہلے یہی۔ آپ دیکھیے کہ وہاں لفظ مَزاح رائج ہے اور لکھنؤ میں مِزاح رائج ہے۔ تو یہ زیر اور زبر کا فرق بڑا معنی خیز ہے۔ تذکیر و تانیث کا معاملہ بھی اسی طرح ہے۔ وہاں پر بلند آواز ہے۔ یہاں آواز میں نرمی ہے۔ یہاں مزاح میں لطافت آپ کو معلوم ہوگی۔ لفظوں کی تراش خراش بڑی خوبصورت ہوگی۔ وہاں پر ایک کھردرا پن ہوگا واقعات کا مزاح ہوگا اور کیرکٹر کا مزاح ہوگا۔ یہاں لفظوں کا مزاح ہوگا۔ ہم تو دونوں کے خلاف نہیں ہیں دونوں میں خوبیاں بھی ہیں، اچھی باتیں بھی ہیں، بری باتیں بھی ہیں...

مظفر حنفی: ڈاکٹر صاحب ایک بات میں عرصے سے محسوس کر رہا ہوں۔ پہلے تو مجھے ایک شعر پڑھنے کی اجازت دیں ___

اس کی آواز میں تھے سارے خد و خال اس کے
وہ چہکتا تھا تو ہنستے تھے پر و بال اس کے

بھائی ایسے شعرا، اپنے محدود مطالعے کے مطابق میں عرض کر رہا ہوں، پاکستان میں غزل گو شعرا کے یہاں مجھے کم کم نظر آتے ہیں اور اس میں کوئی تعصب کار فرما نہیں ہے۔ کچھ ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ وہاں غزل کہنے والوں کا ایک خاص مزاج بن گیا ہے وہاں بھی اچھی غزل کہی جا رہی ہے لیکن ایک خاص مزاج ایسا بن گیا ہے کہ چاہے وہ شہزاد احمد ہوں یا احمد مشتاق ہوں یا پاکستان میں مختلف جتنے بھی شعرا غزل گوئی کر رہے ہیں میں ظفر اقبال وغیرہ کی اینٹی غزل کی بات نہیں کر رہا ہوں لیکن سنجیدگی کے ساتھ جن لوگوں نے غزل اختیار کر رکھی ہے، اچھی غزل کہنے کے باوجود ان میں انفرادی شان نظر نہیں آتی۔ اس کے برعکس یہاں ہندوستان میں دیکھتا ہوں، میں مینار کی بات پھر بھی نہیں کر رہا ہوں ممکن ہے انیس ڈی بیچ کا فرق ہو ہمارے یہاں مخمور سعیدی کی غزل حسن نعیم کے مقابلے میں پہچانی جاتی ہے۔ ندا فاضلی کی غزل شہریار سے مختلف ہے اور سلطان اختر کی غزل مثلاً مجھ سے مختلف ہے۔ اور بھی

ہمارے یہاں مخمور سعیدی کی غزل حسن نعیم کے مقابلے میں پہچانی جاتی ہے۔ ندا فاضلی کی غزل شہریار سے مختلف ہے۔

بہت سے لوگ ہیں جو انفرادی رنگ رکھتے ہیں غزل میں اپنے شعر سے پہچانے جاتے ہیں۔ آپ اس سلسلے میں کیا سوچتے ہیں یہ یکسانیت پاکستانی غزل میں واقعی عام ہے یا میرے تجربے کی کوئی خرابی ہے۔ معاف کیجیے آپ کا یہ شعر جو میں نے پڑھا تھا اس خیال کو رد کرتا ہے۔ مگر ایسے شعر نکلتے نہیں زیادہ۔

وزیر آغا: ہاں میں نے اس پر زیادہ غور نہیں کیا۔ لیکن میں یہ سمجھتا ہوں غزل کی خاص بات یہ ہے کہ دس سال کے اندر اندر اس میں کلیشے ابھر آتے ہیں الفاظ اور تراکیب اور IMAGES تقریباً سب لوگ REPEAT کرنے لگتے ہیں اور دس سال کے بعد یکسانیت آنے لگتی ہے۔ غزل ایک کافر صنفِ سخن یقیناً ہے۔ ہر دس سال کے بعد ایک نیا چولا بدلتی ہے۔ ایک نیا آدمی آتا ہے ایک نیا لہجہ دے دیتا ہے۔ پھر اس کی تقلید شروع ہو جاتی ہے۔ نظم کے سلسلے میں بھی ہوتا ہے مگر نظم میں چونکہ ایک وسیع کینوس ملتا ہے

مظفر حنفی: تو نظم میں انفرادی نقوش آپ کے خیال میں زیادہ آسانی سے واضح ہو جاتے ہیں؟

وزیر آغا: میں نے اس پر غور نہیں کیا کہ آپ کے یہاں VARIATION زیادہ ہے اور وہاں VARIATION کم ہے۔ مظفر حنفی صاحب! بیشک آپ نے یہ نکتہ اچھا اٹھایا۔ میں اس پر غور کروں گا لیکن اس وقت آپ سے میں حتمی بات اس لیے نہیں کہتا کہ میں نے غور نہیں کیا کہ یہاں VARIATION زیادہ ہے ___ وہاں کم ہے۔

مظفر حنفی: میں گذارش کروں گا کہ آپ اس سلسلے میں غور فرمائیں کیونکہ "اوراق" میں خاصے ہندوستانی شاعروں کو شائع کر رہے آپ نے تقریباً ہر شمارے میں دس بارہ ہندوستان کے شاعر تو ہوتے ہی ہیں۔ اس بارے میں بھی ڈاکٹر صاحب میں آپ کی رائے جاننا چاہوں گا کہ ہندوستان کے غزل گو اور نظم نگار وغیرہ بھی متاثر کرتے ہیں کسی حد تک آپ لوگوں

کو؟

وزیر آغا: جی یقیناً میں نے اصل میں تو شروع میں ہی عرض کیا تھا کہ میں تو پوری اردو دنیا کو دیکھتا ہوں اور جہاں اچھی چیز ہو میں اسے چھاپتا ہوں "اوراق" میں۔ اور یقیناً اس کا اچھا معیار ہے جس کو دیکھ کر ہم چھاپتے ہیں۔ یہاں وہ ۱۹۶۰ء کے لگ بھگ ایک تحریک ـــــ جدیدیت کی آئی تھی۔ اس کے اثمار اب بہت اچھی طرح آگئے ہیں۔ اچھے لکھنے والے یہاں موجود ہیں۔ نظم کے بھی غزل کے بھی اور وہاں پر پاکستان میں بھی میں سمجھتا ہوں ایک غلطی ہوئی ہے اور وہ غلطی یہ ہوئی ہے کہ اچھے انتخابات نہیں چھپے۔ پچھلے بیس پچیس سالوں میں بڑے گھپلے ہوئے اب ہر شخص جو ہے ـــــ PUBLIC RELATIONS کرتا ہے۔ یہ بھی ناراض نہ ہو جائے، وہ بھی ناراض نہ ہو۔ اس میں ضرورت اس بات کی ہے کہ کوئی شخص یا ادارہ آئے جو دس سال کے ادب یا بیس سال کے ادب کے انتخاب کو پیش کرے تخصیص یہ نہیں کہ لکھنے والا ہندوستان کا ہے یا پاکستان کا ہے اس سے ادب کو بہت زیادہ فائدہ ہوگا ـــــ

مظفر حنفی: اس میں یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ ایماندار مرتبین ہمارے کتنے ہیں۔ آپ جیسا کوئی شخص دیانتداری سے مرتب کرے گا تو بات بنے گی۔ چغتائی پر آپ کی کتاب میری نگاہ سے گذری ہے۔ پھر انجمن ترقی اردو والوں کے لیے ۱۹۶۵ء تک کی شاعری کا انتخاب بھی مرتب کیا تھا آپ نے .... وہ بھی میری نظر سے گذرا ہے۔ دراصل ایماندار کے ساتھ ویسا انتخاب مرتب کرنے والے لوگ نہیں ہیں۔

وزیر آغا: انتخاب میں ضرور کروں گا۔ لیکن ابھی تخلیقی کام کرنے کی نیت ہے۔ چاہتا ہوں جتنا وقت ملا ہے میں یہ کرلوں۔ بعد میں مجھ سے بہتر لوگ بھی موجود رہیں کام کرنے کے لیے....

مظفر حنفی: پھر عرض کروں گا۔ بہتر لوگ تو ہوسکتے ہیں لیکن ایمانداری سے کرنے والے لوگ....

پاکستان میں بھی ایک غلطی ہوئی ہے۔ اور وہ غلطی یہ ہوئی ہے کہ اچھے انتخابات نہیں چھپے۔ پچھلے ۲۰-۲۵ سالوں میں بڑے گھپلے ہوئے۔

وزیر آغا: اچھا غزل میں ایک خاص چیز ہے۔ نظم میں نہیں ہے۔ افسانے میں بھی نہیں ہے یہ کہ غزل میں جتنے شعر ہوتے ہیں ضروری نہیں کہ سب شعر اچھے ہوں PEDDING ـــــ بڑی ہوتی ہے۔ اس لیے اب انحصار ہے آپ پر کہ دو یا تین اچھے شعروں کی بنا پر ایک غزل کو.... منتخب کرلیا۔ لیکن نظم کے سلسلے میں آپ ہاں یا نا کہیں گے اور افسانے کے سلسلے میں بھی یہی کہیں گے .... یا تو اچھا ہے یا اچھا نہیں ہے۔ غزل میں دو شعر اچھے ہیں پانچ خراب ہیں مگر وہ دو شعر اتنے اچھے ہوسکتے ہیں کہ پوری غزل پسند آجائے۔

مظفر حنفی: ڈاکٹر صاحب غزل کے سلسلے میں میرا خیال کچھ اس قسم کا ہے کہ غزل میں دراصل بنیادی شعر، جو اندر سے جذبہ پیدا کرتا ہے غزل کہنے کا وہ ایک شعر ہی ہوتا ہے۔ باقی اشعار فریم مہیا کرتے ہیں اس کے لیے۔

وزیر آغا: لیکن یہ بھی ہوتا ہے کہ بعض اوقات اتنی INSPIRATION ہوتی ہے کہ غزل کے چار پانچ شعر اچھے ہو جاتے ہیں۔

مظفر حنفی: جی ہاں۔ بعض اوقات تو انتخاب کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

وزیر آغا: اگر ANTHOLOGY کا مسئلہ ہو تو اس رکاوٹ کو عبور کیا جاسکتا ہے۔ کہ اگر غزل میں سات شعروں میں سے پانچ اچھے ہیں تو پانچ ہی دیے جائیں۔ دو شعر حذف کردیے جائیں۔ بجائے اس کے کہ اس میں Pedding والے اشعار شامل کیے جائیں۔ یہ صوابدید پر ہے مرتب کے اور اس پر بھی ہے کہ شاعر کتنا اس کو مانتا ہے۔ لیکن یہ مفر کی کوئی صورت نہیں ہے کہ غزل کے چند اچھے شعر ہیں تو چند برے بھی یا میڈیم بھی اس میں شامل ہوجائیں۔

مظفر حنفی: آغا صاحب ایک پہلو اور ہے جس پر آج آپ تھوڑی سی روشنی ڈالیں ترقی پسند تحریک کی ابتدا جو ہے ہمارے یہاں ۱۹۳۵-۳۶ء سے ہوتی ہے۔ ویسے تو اس کے علمبردار آج بھی موجود ہیں مگر وہ اپنے کام ۱۹۶۰ء میں مکمل کرچکے

ہر چند کہ اس کی تجدید اور احیا وغیرہ کی باتیں کی جاتی ہیں۔ حقیقتاً بچیس سال کا دور تھا اس تحریک کا اور اس دور میں انھوں نے فیض جیسا شاعر بھی دے دیا۔ منٹو، کرشن چندر اور احمد ندیم قاسمی، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی وغیرہ ایک بڑی نسل افسانہ نگاروں کی بھی دی۔ آپ کے یہاں ۱۹۵۸ء سے جدیدیت کی بنیاد پڑ گئی تھی۔ ہمارے یہاں یہ رو یا تحریک جو ہے، میں تو تحریک نہیں کہتا، ہمارے یہاں ۱۹۶۰ء سے شروع ہوا یہ سلسلہ۔ ساٹھ تا اٹھاسی تک، اٹھائیس تیس سال ہو گئے ان تیس برسوں میں کیا ہم اس تناظر میں اتنا بڑا شاعر جیسا کہ فیض ترقی پسند تحریک سے ابھر کر آیا تھا، اتنے بڑے افسانہ نگار جیسے کہ ترقی پسند تحریک سے ابھر کر آئے تھے۔ اس دوران جو کچھ وہ دے سکے۔ کیا جدیدیت کا رجحان ویسے افسانے دے سکا ہے۔

وزیر آغا: بہت عمدہ اور بنیادی سوال آپ نے اٹھایا ہے۔ ہر عہد جو آتا ہے وہ اپنے ساتھ ناقدین کی ایک کھیپ بھی ساتھ لے کر آتا ہے جو اس کی تشریح میں اس کو فروغ دینے میں مدد دیتے ہیں۔ اب جو ترقی پسند دفعہ آیا تھا جو ہمیں وہاں GAINTS نظر آتے ہیں۔ میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ منٹو کو اب اٹھا کر دیکھتا ہوں تو اس کے بہت سے افسانے مسترد کرتا ہوں۔ میں اور لوگوں کو بھی مسترد کروں گا۔ کچھ دن کے بعد پتہ چلے گا کہ ان میں سے واقعی GAINTS کتنے تھے PIGMIES کتنے تھے۔

بیس پچیس سالوں میں جو ادب آیا ہے اس کی اچھی ANTHOLOGIES بھی نہیں آئیں۔ یہ ایک بڑا نقص پیدا ہوا ہے۔ لیکن افسانے میں بھی، انشائیہ میں تو ایک پوری تحریک سامنے آئی ہے، غزل آپ دیکھتے ہیں یکے بعد دیگر ناصر کاظمی سے لے کر اب تک تین چار پانچ کروٹیں آئی ہیں۔ نظم کو نقصان پہنچا ہے، ایک حد تک اور وہ نثری نظم کی وجہ سے پہنچا ہے لیکن اب بھی اگر آپ انتخاب کریں گے تو اس زمانے میں پرانی نظمیں جو آپ کو بہت متاثر

منٹو کو اب اٹھا کر دیکھتا ہوں
تو اس کے بہت سے افسانے
مسترد کرتا ہوں ۔ اور لوگوں
کو بھی مسترد کروں گا ۔

کرتی تھیں، اب وہ ان کے مقابلے میں درمیانہ نظر آئیں گی۔ میں ذاتی طور پر سمجھتا ہوں کہ پچھلے بیس پچیس سالوں میں ادب کے بالخصوص تنقید اور تنقید کے پچھلے دور کے مقالات آپ اٹھا کر دیکھیں۔ ان کے مقابلے میں آج کے زمانے میں اچھے مقالات لکھے گئے ہیں۔ زمین آسمان کا فرق آپ کو نظر آئے گا۔ علوم کا جو IMPACT ہوا ہے، لوگوں نے سوچا ہے، محسوس کیا ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں فروغ ملا ہے۔ ترقی پسندی کی آپ نے بات کی ہے۔ اس میں یہ ہوا کہ بیسویں صدی کی ادبی ہے؟

جب Revolution آیا ہے روس میں اس وقت کے لکھنے والے واسکی اور لینن اور دوسرے جو ادب کے لوگ تھے، ان کے جو نظریات تھے۔ ادب کے بارے میں، آپ ان لوگوں کا مطالعہ کرکے دیکھیں، وہ ہم سے بہت قریب تھے۔ لیکن جب اسٹالن کا دور آیا ہے تو انھوں نے ادب کو ایک ذریعہ بنا دیا ہے۔ اب وہ Militaat ہو گئے اور یہ وہ زمانہ ہے جب ہمارے یہاں ترقی پسندی آئی تو انھوں نے براہِ راست اسٹالن سے اثرات قبول کیے۔ یہ صحیح معنوں میں ترقی پسندی تھی بھی نہیں۔ آپ ترقی پسندوں کی کتابیں اٹھا کر دیکھیے میں نے جو کتاب لکھی ہے اس میں اس بات کو سامنے لایا ہوں کہ کس نے مفاہمت کی ہے۔ اس میں ان کی تحریروں سے یہ ثابت کیا ہے۔ اب دیکھیے کہ کس طرح مفاہمت کر رہے ہیں وہ اور وہ جو ایک AESTHETICS ہوتی ہے ادب کی اور ادب کا وہ جو جذبے کا مسئلہ ہوتا ہے نظریات سے الگ کر کے جس کو انھوں نے اہمیت نہیں دی تھی وہ سامنے آنا شروع ہوا ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں یہ خیر کا معاملہ ہے۔ میں چاہتا ہوں اس قسم کی POLORAIZATION ختم ہو۔ یہ نہیں کہتا کہ وہ سارا ایک سانچے کا ہو جائے۔ ایک اس پر مہر لگ جائے VARIATION تو آنی چاہیے۔ لیکن یہ ہو کہ یہ Polarization جو ہے یہ نفرت رقابت پیدا کرتی ہے

یہ نہیں ہونی چاہیے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارا ادب اس طرف جا رہا ہے اور جدیدیت کی جو رد جو شروع ہوئی تھی اس میں افراتفری کی صورتیں تو پیدا ہوئیں مثلاً افسانہ، آپ دیکھیے افسانہ جو پہلے ترقی پسندوں نے دیا اس میں پلاٹ، کردار اور نظریہ وغیرہ پر بہت زور دیا۔ اس کے REACTION میں علامتی افسانہ آیا اور تجریدی افسانہ آیا لیکن اب پچھلے آٹھ دس سالوں سے وہ کردار اور پلاٹ بھی واپس آگیا ہے لیکن اس کے ساتھ علامتی ابعاد بھی پیدا ہو گئے ہیں۔ اب دیکھیے یہ اس افسانے سے بہتر ہو گیا۔ اچھے افسانے آ رہے ہیں۔ میں تو سمجھتا ہوں اب تو بہار آ رہی ہے۔

مظفر حنفی: معاف کیجیے، میں پھر وہی سوال کر رہا ہوں، پاکستانی افسانے کی حد تک آپ نے بالکل درست فرمایا۔ ہندوستان میں صورتِ حال تھوڑی سی زیادہ تاریک رہی۔ یہاں تجریدی اور علامتی افسانے کو اتنا زیادہ سر پر بٹھا لیا گیا کہ اس کے بعد جب ناقدین نے اس کو رد کرنے کی کوشش کی تو وہ اتنے ESTABLISH ہو چکے تھے کہ اس کے اثرات تا حال چلے آ رہے ہیں ——

وزیر آغا: بالکل صحیح اب میں نے دیکھا ہے کہ بعض مضامین میں نقاد ان شعرا کا نام لیتے ہیں جن کو وہاں سے رخصت ہوئے بیس برس گزر گئے ہیں۔ اب بھی وہ .... افتخار جالب وغیرہ کی باتیں کرتے ہیں۔

مظفر حنفی: افسانہ نگاروں کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے لیکن میں نام نہیں لینا چاہتا۔

وزیر آغا: یہ افسوس ناک صورتِ حال ہے۔ اپنی انفرادیت کو نہیں گنوانا چاہیے یہاں اچھے لکھنے والے بھی موجود ہیں بڑی انفرادیت بھی ہے۔ اچھے افسانے بھی چھپتے ہیں۔ بلراج کومل نے بڑی اچھی نظمیں لکھی ہیں اور بلراج کومل نے افسانے بھی اچھے لکھے ہیں —— جوگندر پال نے اتنے اعلیٰ افسانے لکھے ہیں۔ رام لعل نے لکھے ہیں —— یہاں سبھی لکھنے والے بہت اچھے ہیں۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ پاکستان میں بہتر کام ہوا ہے اور یہاں پر کمتر ہوا ہے۔

مظفر حنفی: میں افسانوں کے REFERENCE میں کہہ رہا تھا ——

اصل میں آپ نے جو یہ نام لیے جوگندر پال کے یا رام لعل کے یہاں یہ لوگ خالصتاً جدید افسانہ نگار نہیں کہلاتے۔ انھیں جدیدیت کے پیش رو کہہ لیجیے زیادہ سے زیادہ۔ یہ سینیئر لوگ ہیں۔ حالانکہ جوگندر پال ۱۹۶۲ء سے لکھ رہے ہیں۔ عمر ان کی زائد ہے۔

وزیر آغا: میں نے عرض کیا تھا نا کہ جدیدیت سے مفہوم اگر وہ علامتی اور تجریدی افسانہ ہے تو وہ تو وہاں بھی ختم ہو گیا۔

مظفر حنفی: یعنی آپ نے جلد ہی اپنی اصلاح کر لی۔ میں اس پر خوشی کا اظہار کر رہا ہوں کہ آپ نے اس غلطی کو جلد محسوس کر لیا۔ ہمارے یہاں اس اصلاح کی کوشش ناکام ہوتی جاتی ہے۔ کیونکہ ناقدین اب بھی اصرار کرتے ہیں کہ اصل افسانہ وہی ہے۔

وزیر آغا: لیکن میرا خیال ہے کہ جو ہم نے وہاں رو چلائی ہے یہاں پر اس کی تقلید ہوگی اور بہت جلدی .... وہ جو بے راہ روی تھوڑی ہے وہ ٹھیک ہو جائے گی یہاں ہندوستان میں بھی بہت اچھے لکھنے والے موجود ہیں اور وہ صحیح متوازن افسانے بھی لکھ رہے ہیں تو تخصیص کی بات نہیں ہونی چاہیے۔ میں تو کہتا ہوں کہ پورا اردو ادب جو ہے اس پر فروغ آئے، بہار آئے۔

مظفر حنفی: آغا صاحب، افسانے کے سلسلے میں جیسا کہ ابھی آپ نے فرمایا ترقی پسند تحریک کے پاس ان کے اپنے نقاد تھے جو تخلیق کار نہیں تھے یہ الگ بات ہے کہ احتشام صاحب نے بھی غزلیں کچھ کہہ دیں یا افسانے لکھے یا اختر اورینوی نے افسانے لکھے لیکن عموماً وہ لوگ تنقید نگار رہے تھے —— سوائے سردار جعفری کے۔ سردار جعفری شاعر بھی تھے اور نقاد بھی۔ اس لیے وہ صحیح تنقید بھی نہ کر سکے۔ منہ پھٹ آدمی ہوں اس لیے کہتا رہتا ہوں، اور اچھی تخلیق بھی پیش نہ کر سکے۔ کیونکہ تنقید میں بھی

بہت رہے اور حکم نامے صادر کرتے رہے۔ لیکن باقی ناقدین کے بارے میں دیکھیے آپ۔ وہ اختر اورینوی ہوں یا اختر رائے پوری ہوں؛ آپ کے ممتاز مفتی ہوں یا مجتبیٰ حسین۔ یہ بنیادی طور پر نقاد تھے اور اپنے اپنے فیلڈ میں یہ ترقی پسند نئے آنے والے لوگوں کو جتنی جلدی انھوں نے کر دیا وہ ہم جدیدیت کے وسیلے سے اس لیے نہیں کر پائے غالباً۔ آپ سے معذرت کے ساتھ عرض کر رہا ہوں ——

.... ہمارے یہاں جو نقاد تھے وہ بیشتر تخلیق کار ہونے کا بھی دعویٰ .... رکھتے تھے، اس لیے وہ ڈنڈی مارتے رہے۔ اپنے آپ کو بڑھاتے رہے۔

وزیر آغا: لیکن اس کا ایک مثبت پہلو بھی ہے کہ انھوں نے بنے بنائے سانچوں میں تنقید نہیں کی بلکہ تخلیقیت کا مظاہرہ کیا۔ خود بھی اس واردات میں سے گزرے ہیں۔ تجربے میں سے گزرے ہیں —— انھوں نے جو اصول وضع کیے وہ کشید کیے اپنے تجربے میں سے۔ یہ ایک بڑا مثبت پہلو ہے۔ بجائے اس کے کہ ایک PATERN بنا بنایا اس پر تولیں میں سمجھتا ہوں اس کا فائدہ بھی ہوا۔

مظفر حنفی: یہ فائدہ اصل میں نقاد کا جاری کردہ فیض نہیں ہے۔ وہ تو جدیدیت کا رجحان لے آیا ہے وہ اپنے ساتھ کوئی مینی فیسٹو تو لے کر آیا نہیں اس لیے وہ خود جگر بندی کو رد کرتا تھا۔ میں اس بنیادی پہلو کو تو تسلیم کرتا ہوں۔ اس سے الگ ہٹ کر ہوا یہ کہ مثلاً نقاد شاعر بھی ہے اور وہ نقاد شاعر اوسط درجے کا ہے۔ تھرڈ ریٹ شاعر ہے۔ میں ہندوستان کے تناظر میں بات کر رہا ہوں (جی ہاں جی ہاں۔ وزیر آغا) چنانچہ اس نے کو فروغ دیا اور ہر اس چیز کو جو گاڑھی دبیز، مبہم اور اکثر بے معنی چیز تھی اس کو باقاعدہ ایک —— پلان کے تحت یہ کہا گیا کہ جدید شاعری یہی ہے چنانچہ ایک بہت بڑی نسل اس بہکاوے میں آگئی۔

وزیر آغا: یہ بالکل ٹھیک ہے۔ لیکن میں تو سمجھتا ہوں کہ ہمارے سامنے مثال وہ ہونی چاہیے جو ٹی۔ ایس ایلیٹ کی ہے جو بیک وقت ایک بڑا نقاد بھی ہے اور بڑا تخلیق کار بھی ہے اور انشاء اللہ یہ صورتِ حال پیدا ہوگی کیونکہ جو سمت ہے وہ صحیح ہے —— تخلیق کار تنقید کے میدان میں آگئے ہیں —— میں اس تنقید کی بات نہیں کرتا جو تخریبی تنقید ہے۔ یہ بھی ایک وبا آئی ہوئی ہے کہ کتاب کی رسم اجرا ہوتی ہے جیسے کہ بچے کی سالگرہ پر ہوتا ہے۔ معمولی لکھنے والے کی تعریف پھر غالب اور میر کے درجے کا شاعر بنا دیا۔ ایک صاحب نے بڑی عمدہ بات کہی۔ پتہ نہیں مشفق خواجہ صاحب نے کہی یہ بات بڑی پسند آئی وہ کسی شاعر کو کسی نے ایسی ہی تقریب میں کہہ دیا کہ یہ تو غالب کے ہم پلہ ہے۔ وہ کہنے لگے کہ بالکل صحیح ہے۔ یہ الفاظ وہی استعمال کرتے ہیں جو غالب نے کیے ہیں صرف ترتیب مختلف ہوتی ہے۔

مظفر حنفی: رسم اجرا وغیرہ جیسی تقریبات سے ڈاکٹر صاحب آپ جانتے ہیں مجھے بھی بڑی وحشت ہوتی ہے۔ اکیاون کتابیں لکھی ہیں؛ ان میں سے کسی ایک کی رسم اجرا نہیں ہوئی۔ ایک بار نثار احمد فاروقی صاحب نے کہا بھئی "کلیاتِ شاد عارفی" تو تمھاری تصنیف نہیں۔ اسے تو تم نے مرتب کیا ہے۔ اس کی رسم اجرا .... تو میں نے کہا بھائی اس پر جو خرچ آنے والا ہے وہ آپ مجھے عنایت فرما دیں میں اس سے "باقیاتِ شاد عارفی" شائع کر دوں گا .... اب آپ اردو ادب کی مجموعی صورتِ حال پر کچھ فرمائیے!

وزیر آغا: بہر حال میں تو ذاتی طور پر اردو ادب کے سلسلے میں بہت پُر امید ہوں اور مجھے بہت یقین ہے کہ جس سمت میں ہم جا رہے ہیں اگر اسی طرح سے ہم نے اپنے کو دنیا سے منقطع نہیں کیا اور چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں محبوس نہ ہوئے۔ ذہنوں کو بھی کھلا رکھا اور تنگ نظری سے بھی اپنے آپ کو بچایا تو یقیناً اردو ادب ترقی کرے گا۔

مظفر حنفی: وزیر آغا صاحب، آپ کا بہت وقت لیا میں نے، حالانکہ میرے لیے اب بھی یہ بہت کم وقت ہے — آپ سے جی چاہتا ہے ۲۴ گھنٹے اور بات کریں۔ بہرحال بہت بہت شکریہ۔ پھر ملیں گے۔ ●●

رابطہ کی سفیر اور ہم

ڈاکٹر سیّد ابوالخیر کشفی

C-6 اسٹاف ٹاؤن جامعہ کراچی یونیورسٹی کیمپس۔ کراچی (پاکستان)

بیسویں صدی کے ہندوپاک ادب نمبر ۱۹۸۹ء کی مناسبت اور اہمیت کے پیش نظر خیال آیا کہ برِ عظیم جنوبی ایشیا کے ان دونوں ملکوں میں اردو کے ادیبوں، اداروں اور خادموں کو چند اہم کاموں کی طرف متوجہ کیا جائے۔ یہ ایسے کام ہیں جن کا کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی گوشے سے ذکر کیا جاتا رہا ہے۔ لیکن اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ یہ کام ایک تحریک کے طور پر کیے جائیں۔ ان میں سے بعض کام ایسے ہیں جو افراد کے کرنے کے نہیں، بلکہ اداروں کے کرنے کے ہیں۔

لیجیے، اداروں کے لفظ سے پہلے کام کا خیال ذہن میں اُبھرا۔ پاکستان اور ہندوستان میں اردو کے بہت سے ادارے علمی و ادبی کام کر رہے ہیں۔ ان اداروں میں اکثریت سرکاری یا نیم سرکاری اداروں کی ہے۔ غیر سرکاری ادارے بھی موجود ہیں اور ایسے ادارے بھی جو کسی ایک فرد کی ذات اور شخصیت سے وابستہ ہیں۔ ترقی اردو بیورو ہند، مقتدرۂ قومی زبان پاکستان، انجمن ترقی اردو پاکستان، انجمن ترقی اردو ہند، اردو ڈکشنری بورڈ پاکستان، ہندوستان کے کئی صوبوں کی اردو اکیڈمیاں، مجلس ترقی ادب پاکستان، دارالمصنفین ہند وغیرہ ــــ میرا مقصد فہرست سازی نہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ مکتبہ جامعہ اور فیروز سنز جیسے ناشرین کو بھی ادارے کہنا مناسب ہے ــــ یہ سب ادارے اچھا کام کر رہے ہیں۔ بعض کا دائرۂ کار متعین ہے مثلاً اردو ڈکشنری بورڈ، لیکن دوسرے اداروں کے کاموں میں تکرار ملتی ہے۔ ضروری ہے کہ یہ ادارے ایک دوسرے سے تعاون کریں، ان کے مقاصد اور دائرۂ کار کا تعین ہو جائے اور یہ ادارے اپنا ایک وفاق قائم کر لیں۔ کم سے کم یہ بات تو بہت آسانی سے ممکن ہے کہ ہندوستان کے علمی و ادبی ادارے اپنا وفاق بنا لیں اور پاکستان کے ادارے اپنا وفاق۔ پھر ان دونوں وفاقوں کے درمیان مشاورت اور معلومات کا تبادلہ آسان تر ہوگا۔ ان اداروں کے درمیان تعین کار کس طرح کیا جا سکتا ہے؟ یہ ایک مزے کی ذہنی مشق ہو سکتی ہے۔ اس پر آپ بھی اظہار خیال کر سکتے ہیں اور میں بھی، لیکن مناسب تر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا فیصلہ یہ ادارے خود کر لیں۔ بہت سے ادارے اپنے کام کے سلسلے میں رکاوٹیں محسوس کر کے اِدھر اُدھر کے کام کرنے لگتے ہیں۔ مثال کے طور پر مقتدرۂ قومی زبان کے ذمّہ نفاذِ اردو کا فریضہ سپرد کیا گیا تھا لیکن مقتدرہ نے اس بھاری پتھر کو چوم کر چھوڑ دیا اور چھوٹے چھوٹے کتابچوں اور متوسط درجہ کی کتابوں کی اشاعت شروع کر دی۔ اس صورتِ حال کی پوری ذمّہ داری مقتدرہ پر نہیں، مگر مقتدرہ والوں نے حالات سے صلح کر لی اور اپنے مناصب کی برقراری کو ہی سب کچھ سمجھ لیا۔

ایک ہی کام کے لیے سرکاری سطح پر ایک سے زیادہ ادارے بھی موجود ہیں۔ مثلاً پاکستان میں اقبال اکادمی اور بزم اقبال ــــ یہ وسائل کا ضیاع ہے۔ مقصد؟ خیر چھوڑیے ــــ اقبال اکادمی جس سلیقے سے اپنا کام کر رہی ہے اس کے پیش نظر یہی ادارہ اقبالیات کے فروغ کے لیے کافی ہے۔ اور بزم اقبال کے ڈائریکٹر کے لیے اقبال اکادمی کے شعبۂ تحقیق میں اسکالر کی اسامی نکالی جا سکتی ہے۔

میری رائے میں بعض علمی و ادبی رسالوں کو بھی ادارہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ ہمارے ادبی ماضی میں ایسے کتنے ہی ادارے نظر آتے ہیں "نگار" لکھنؤ کو آزادیٔ فکر و نظر، "معارف" کو علمی تحقیقات، "ساقی" کو جدید افسانے کے فروغ کے ادارے کہنا مناسب ہوگا۔ میں نے پھر چند مثالیں ہی پیش کی ہیں ورنہ مخزن، ہمایوں، زمانہ، ادیب اور ایسے ہی دوسرے رسالے بھی اس زمرہ میں شامل کیے جا سکتے ہیں ــــ آج نقوش کو یہی مرتبہ حاصل ہے۔ 'نقوش' کے خاص نمبر عالمی ادبی صحافت کا ایک اہم واقعہ ہیں۔

یہ رسالے ادبی فضا کی تخلیق کے نقطۂ نظر سے بھی ادارے تھے ــــ آج اردو میں ادبی ماہنامے نہ ہونے کے برابر ہیں۔ سرکاری پرچوں سے قطع نظر پاکستان میں صرف ایک ادبی ماہنامہ "افکار" شائع ہوتا رہا ہے۔ اب ماہنامہ "دائرے" کا بھی اضافہ... ہو گیا ہے۔ ہندوستان میں بھی صورتِ حال کچھ ایسی اطمینان بخش نہیں۔ ماہنامہ "شاعر" ہی ہر مہینے ہندوستان سے چھپتا رہا ہے۔ اب "کتاب نما" کو بھی ایک ادبی ماہنامہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ "الفاظ" ہر ماہ نہیں شائع ہوتا۔ ادبی ماہناموں کے فقدان کی وجہ سے لکھنے والوں اور پڑھنے والوں میں رابطہ ٹوٹ گیا ہے۔ آزادی سے کچھ پہلے تک "ساقی"، "زمانہ"، "ادب لطیف"، "ہمایوں"، "نگار" اور "ادبی دنیا" وغیرہ زندہ ادارے

اور تحریکوں کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان پرچوں میں کوئی اچھی تحریر شائع ہو جاتی تو اس کا اثر پشاور سے حیدرآباد اور دکن تک محسوس کیا جاتا تھا۔ اچھی تحریروں پر گفتگو ہوتی اور ان ماہناموں کے صفحات پر عام پڑھنے والے اپنی آرا کے ذریعے بڑے سے بڑے لکھنے والے کی راہنمائی کرتے۔ ضروری ہے کہ اس دور کو ایک بار پھر زندہ حقیقت بنایا جائے۔

ان دنوں ہندوستان میں "شمع" اور "بیسویں صدی" اور پاکستان میں کئی ڈائجسٹ پابندی کے ساتھ شائع ہو رہے ہیں۔ "شمع" اور "بیسویں صدی" کو نیم ادبی رسالے کہا جاتا ہے اور اگر یہ بات تحقیر سے نہ کہی جائے تو کچھ ایسی غلط نہیں کیونکہ ان پرچوں میں تنقید، تحقیق اور تمام ادبی اصناف کی گنجائش کم ہی رہی ہے۔ اب ان پرچوں کا دائرہ مضامین وسیع تر ہو رہا ہے۔ اسی طرح پاکستان کے ادبی پنڈتوں نے ڈائجسٹ کے لفظ کو ایک گالی بنا دیا ہے حالانکہ ان ڈائجسٹوں میں انگریزی کے جدید افسانوی ادب کے بہترین نمونے شائع ہو رہے ہیں۔ انھیں ڈائجسٹوں نے کرشن چندر جیسے مقبول افسانہ نگار اور ابوالفضل جیسے مشکل افسانہ نگار اور طویل کہانیاں لکھنے والوں کی نگارشات کو لاکھوں پڑھنے والوں تک پہنچایا۔ ایک ڈائجسٹ ہی کے لیے شوکت صدیقی کا ناول "جانگلوس" لکھا گیا۔ کئی اور معتبر افسانہ نگاروں نے ان ڈائجسٹوں کے لیے لکھا ہے اور کبھی کبھی نام بدل کر لے جدید بھی ایک ڈائجسٹ کے لیے مسلسل لکھ رہے ہیں۔ ان ڈائجسٹوں کے مقبولیت کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اردو کے جدید افسانہ نگاروں کے ہاں کہانی نہیں ملتی اور عام پڑھنے والے نے اُن کے افسانوں کو رد کر دیا ہے۔ شاید اسی رویہ کی وجہ سے اب ہمارے افسانہ میں کہانی پھر سے جگہ پا رہی ہے۔ میری رائے میں نیم ادبی پرچے اور ڈائجسٹ ایسے مرحلہ میں داخل ہو گئے ہیں کہ وہ اپنے قارئین کے حلقہ کو محدود کیے بغیر اپنے ادبی رنگ کو نمایاں تر کر سکتے ہیں۔ میں پاکستان سے شائع ہونے والے خوبصورت رسالوں کو رسالوں کا الگ زمرہ قرار دیتا ہوں۔ کسٹم کی الجھنوں سے بچنے کے لیے یہ رسالے ہانگ کانگ یا سنگاپور کے پریسوں میں چھپتے ہیں اور وہاں سے مختلف ممالک بھیجے جاتے ہیں۔ رسالوں کے اس زمرہ کا آغاز رابطہ سے ہوا اور اب کئی اور رسالے اس نوع کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ انھیں عائلی رسالے یعنی فیملی میگزین کہیے۔ یہ ملاقاتی کمروں کی زینت بھی بنتے ہیں اور ان میں شائع ہونے والی شاعری اور افسانے معیاری ہوتے ہیں۔

ان رسالوں نے رابطہ کی سفیر یعنی اردو زبان کے ادب کو دور دور تک پہنچا دیا ہے۔ اردو اب برِّ عظیم جنوبی ایشیا کے تینوں ملکوں کے علاوہ سعودی عرب، عرب امارات اور انگلستان کے بڑے علاقوں میں پڑھی اور بولی جانے والی زبان ہے۔ اردو کے اخبارات و رسائل کینیڈا، انگلستان، آسٹریلیا، امریکہ، جین اور کئی ممالک سے شائع ہو رہے ہیں۔ یہ وہ اخبار و رسائل ہیں جو ان ممالک کے اردو حلقے شائع کر رہے ہیں۔ میں مختلف ملکوں کے سرکاری پروپیگنڈا رسائل کا ذکر نہیں کر رہا ہوں۔ ضرورت ہے کہ یہ رسالے کسٹمز اور جغرافیائی سرحدوں کو عبور کر کے اردو دنیا کے ہر گوشے تک پہنچ سکیں۔

اس مسئلہ کا ایک حل "انتخابی رسالے" ہو سکتے ہیں۔ کراچی سے "نقش" اور "جائزہ" یہ دو رسالے طویل مدت تک ادبی رسالوں کے مضامین کا انتخاب شائع کرتے رہے۔ اب ایسا کوئی رسالہ نہیں ہے۔ اگر ایسا ایک رسالہ پاکستان سے اور دوسرا ہندوستان سے شائع ہونے لگے۔ تو اردو کے ادیب اور پڑھنے والے ایک دوسرے سے قریب آ سکیں گے۔ اس کی افادیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اردو کے قارئین کی قوتِ فراغت محدود ہے۔ ایسے کسی ایک رسالے کے مطالعے سے وہ بہترین نئی تخلیقات سے واقف رہیں گے۔ "بیسویں صدی" کا ادارہ ایک ایسا ادبی رسالہ شائع کر سکتا ہے جس میں پاکستان، بنگلہ دیش اور کینیڈا کے رسالوں کا انتخاب کے ساتھ ساتھ ہندوستان کی بھی چند تخلیقات شامل ہوں۔ اسی طرح نئے افق پبلیکیشنز گروپ یا کوئی اور ادارہ پاکستان سے ایسا ادبی انتخابی پرچہ شائع کر سکتا ہے جس میں ہندوستان، برطانیہ، عرب امارات سے شائع ہونے والے رسالوں اور مطبوعات کا انتخاب پیش کیا جا سکے۔ ایسے دو رسالوں سے اردو کے عالمی ادب کے رجحانات کا اندازہ ہو سکے گا۔ اور دنیا کے مختلف ملکوں میں بسنے والے اردو کلچر کے لوگوں کے مسائل کا بھی مطالعہ کیا جا سکے گا۔ یہ ایسا کام ہے جس کی صرف ادبی اہمیت نہیں بلکہ عمرانی اور ثقافتی اہمیت بھی ہے۔

ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ابلاغ کی جو خلیج Communication gap, ہے وہ بڑی سنگین اور کئی اعتبار سے خطرناک ہے۔ دو ملکوں کے باہمی تعلقات اور رشتوں کے مسئلہ کو آسانی اور اطمینان کے ساتھ سیاست دانوں کے سپرد نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے ملکوں میں سیاست دانوں کی فصل تو خوب اگتی ہے مگر سیاسی اور فطری تدبّر نہ ہونے کے برابر ہیں کسی کا قول ہے کہ سیاست داں کی نظر لگے الکشن پر ہوتی ہے اور سیاسی تدبّر کی اگلی نسل پر۔ میرا یقین ہے کہ طویل مدت کے لیے مستقبل سے ادب کا رشتہ سیاست سے زیادہ گہرا ہے۔ جگر مرادآبادی مرحوم نے یہی بات بڑے حسن سے کہی تھی مگر ان کے شعر کے مضمرات، امکانات اور دور اندیشی کو پوری طرح سمجھا نہیں گیا ہے

کام جو اُن کا ہے وہ اہلِ سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

اس ابلاغی خلیج کو پاکستان اور ہندوستان کے درمیان کتابوں اور رسالوں کے آزادانہ اور تجارتی تبادلے کے ذریعہ پاٹا جا سکتا ہے اور اس سلسلہ میں لکھنے والوں اور شائع کرنے والوں کی ذمہ داری یہ ہوگی کہ ایک دوسرے کے اجتماعی جذبات، عقائد

اور محسوسات کا احترام کیا جائے۔

ادبی سطح پر اس خلیج کو کم کرنے کی ایک تجویز شعری ادب کی حد تک میرے ذہن میں ہے اور وہ یہ کہ مولانا حسرت موہانی کے "انتخابِ سخن" کا سلسلہ دوبارہ شروع کیا جائے۔ مولانا کی محبت اور احترام میں میں نے اس سلسلہ کو انتخاب سخن کا سلسلہ کہا ہے۔ اب ذرا وضاحت کردوں ——— انتخاب سخن میں نئے اور زندہ شعرا کا انتخاب ہوگا۔ یہ انتخاب اتنا تفصیلی تو ہو کہ کسی شاعر کے بارے میں انتخاب کی روشنی میں فیصلہ کیا جاسکے۔ انتخاب میں اس کے بہترین کلام کے ساتھ ساتھ کمزور کلام بھی شامل کیا جائے تاکہ "محاسن" اور "معائب" دونوں کا اندازہ ہوسکے۔ پاکستانی شاعروں انتخاب ہندوستان میں کتابی صورت میں اور ہندوستانی شاعروں کا انتخاب پاکستان میں کتابی صورت میں شائع کیا جائے۔ یا پہلے کسی رسالے میں اور پھر کتابی صورت میں۔ ہندوستان کے دو ایک پرچوں میں میں نے بعض پاکستانی شعرا کا انتخاب شائع کرایا تھا، مگر یہ کام تسلسل کے ساتھ کرنے کا ہے۔ میں ہندوستان ۸۶ – ۸۵ء تک پابندی کے ساتھ گیا ہوں اور میں نے جب بھی کسی نئے پاکستانی شاعر کا کلام سنایا تو لوگوں نے حیرت اور مسرت کے ساتھ سنا۔ احمد فراز، منیر نیازی، مصطفےٰ زیدی، ابنِ انشاء، محسن بھوپالی اور پروین شاکر وغیرہ کے بعد سحر انصاری عبید اللہ ... اور سلیم کوثر کچھ کچھ جانے جاتے ہیں مگر بہت سے ایسے شاعر جو آج کا عہد اور آنے والے کل کی امانت ہیں ہندوستان میں حرفِ ناشنیدہ کا درد رکھتے ہیں اور جو لوگ معروف بھی ہیں اُن کے مرتبہ کا احساس نہیں۔ احمد فراز کو جاننے، پڑھنے اور پسند کرنے والے تو بہت ہیں لیکن خود ہندوستان کے ادبی حلقوں کو اس کا احساس نہیں کہ فیض کے بعد کے دورِ شاعری کے اہم ترجمان عزیز حامد مدنی کا جدید اردو شعر کی تاریخ میں کیا مرتبہ ہے؟ اسی طرح ہندوستان میں اختر الایمان کے ساتھ پوری طرح انصاف نہیں کیا گیا۔ اسی طرح شاد عارفی آج بھی ہم سے اپنا حق مانگ رہے ہیں۔ اسی طرح مجید امجد اور مختار صدیقی وغیرہ کا مطالبہ بھی صحیح تناظر میں نہیں کیا گیا۔

میں بات سمیٹنے کی کوشش کرتا ہوں۔ آج کچھ ایسے پاکستانی شاعر ہیں جن کا کلام ہندوستان کے سنجیدہ ادبی قارئین تک نہیں پہنچا۔ اسی طرح ہندوستان کے کئی شاعر اور پاکستان میں بس ایک نام ہیں ——— ابھی قریب کے بعض شعرا کو بھی بھلایا جارہا ہے کیونکہ اُن کا اچھا انتخاب نہیں کیا گیا۔ مثال کے طور پر روش صدیقی، سکندر علی وجد، شہا بھوپالی مجددی، ثاقب کانپوری، نشور واحدی، اثر لکھنوی مسعود اختر جمال وغیرہ۔ اسی طرح بہت سے اچھے زندہ شاعر فکرِ معاش کے بوجھ تلے یوں کچلے گئے کہ اُن کی آواز بھی کھو گئی۔ کانپور میں ایک بزرگ شاعر ہیں حق بنارسی۔ غربت کے موضوع پر اُن کا یہ شعر دیکھیے اور بتائیے کہ کیا کسی اور نے بھی اس شدت سے اس موضوع پر ایسا شعر کہا ہے؟

تو تو ہر چہرہ کو آئینہ بنا دیتی ہے
اے غریبی کوئی رکھے ترا پردہ کیسے؟

مجھے عرض یہ کرنا ہے کہ شعری انتخابات مرتب کرتے ہوئے ہمیں صرف شہرت کو بنیاد نہیں بنانا ہے بلکہ اچھے شعرا کو دریافت کرنا ہے۔ مزید یہ کہ جو شعری مجموعے موجود ہیں ان میں سے ہر ایک میں ایسے اشعار مل جائیں گے جو انتخاب حسن میں شامل کیے جاسکیں۔ ہمارا عہد عام شعور اور بیداری کا عہد ہے۔ یہ شعور ہمارے شعری ادب میں زیادہ نمایاں ہے۔ ہمارے نئے شعرا میں بعض اپنی تخلیقی شعری زبان کی تلاش میں مصروف ہیں (مثال کے طور پر محمد اظہار الحسن اور علی اکبر عباس) بعض شاعرات نسوانی حسیات کو ثقافت کے پس منظر میں پیش کررہی ہیں اور اُن کے ہاں بدن دریدگی سے زیادہ ثقافتی لباس کی تراش خراش ملتی ہے (یاسمین حمید) بعض شعرا کے ہاں ادبی روایات آج کے مسائل، موضوعات اور اندازِ فکر کے ساتھ مل کر ایک نئی روایت بن گئی ہے (پروین شاکر، علیم، سلیم کوثر اور محمد رئیس علوی) بعض شاعر ہمیں اس صنعتی عہد میں شاعری کی اہمیت کا ایک دوسرے زاویے سے احساس دلا رہے ہیں۔ وہ شاعری میں اپنی شکستگی کا مداوا تلاش کررہے ہیں۔ شاعری اُن کی شناخت اور پیشہ نہیں بلکہ اُن کے لیے زیست کرنے کا بہانہ اور وسیلہ ہے (مشتاق احمد قریشی) ——— انتخاب سخن کا سلسلہ شروع ہو تو یہ نکات روشن تر ہوجائیں گے۔ میری بات اور دعوے کی دلیل ان شعرا کے شعر ہی ہوسکتے ہیں۔ بس چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

لیجیے پہلے محمد اظہار الحق جو اسلامی تاریخ بالخصوص ہسپانیہ کو اردو غزل کے استعاروں کی صورت دے رہے ہیں۔ پہلے نعت کے دو شعر ؂

میں ہر آواز سے اپنی سماعت کو بچا کر
مقدس آہٹیں اُن عرش قدموں کی سُنوں گا
نہ ہے وہ گرد جو اُن کی سواری نے اڑائی
میں آنکھوں میں کہاں تک محض بینائی رکھوں گا

اور اب تاریخ کو غزل بنتے دیکھیے ؂

شہتوت کا رس تھا، نہ غزالوں کے پرے تھے
اس بار بھی میں جشن میں تاخیر سے پہنچا

ہمارا نام بھی بارہ دری پر نقش کرنا
یہ ساری جالیاں ہم نے نگاہوں سے بُنی ہیں

گیا جب لوٹ کر گھوڑا سوار اس پر نہیں تھا
محبت رفتہ رفتہ عاشقوں کو کھو رہی تھی

تیغ کی دھار میں الحمرا، موتی کی آب میں الحمرا
اک محراب میں سورج ہے اور اک محراب میں الحمرا

علی اکبر عباس بھی اپنی زبان اور لہجہ تراشنے کی کوشش میں مصروف اور "مبتلا" ایک شاعر ہے۔ اُس کی فکر اپنی ہے، فیض صاحب نے انگلی کے اشارے سے اُسے "کوئے لباں" کا جلوہ دکھایا ہے اُردو غزل کی روایات کے ساتھ ساتھ پنجابی شاعری کے ابواب بھی اس کے سامنے ہیں۔ مناظر سب وہی ہیں جو ہم آپ دیکھتے ہیں مگر علی اکبر عباس اپنے "درِ نگاہ" سے دیکھتا ہے ؎

سکوتِ گریہ پہن کر دعائے درد انگیز
درِ نگاہ سے، کوئے لباں سے نکلی ہے

چلتا رہتا ہوں مسلسل کہ نہ لٹ جائے کہیں
ایک اندیشہ کہ شامل مرے اسباب میں ہے

جو حرف زندہ کروں گا، مجھے دعا دے گا
میں کچھ نہ دوں گا اُسے تو مجھے وہ کیا دے گا

یوں آج کا اردو شاعر لفظوں کو زندہ کرنے کے عمل میں مصروف ہے۔ لفظوں کی زندگی ہے کیا؟ نئے خیالات، نئے ہیجانات اور نئی نظر کا ساتھ دینا اور اُن کا اظہار کرنا۔ آج کا شاعر پُرانی زمینوں میں نئے جذبے بو رہا ہے اور پُرانی ردیفوں اور قافیوں کے افق پر نئے چاند ستارے بکھیر رہا ہے۔ ایک نہایت پُرانی زمین میں محمد رئیس علوی کے یہ شعر سُنیے ؎

گلا بیٹھا ہے کتنے کی ہوس میں ہچکیاں بھر کر
چلا ہے کوئی ترکش میں قفس کی تیلیاں بھر کر
یہاں تو حرف کا ہونٹوں پہ آتے دَم نکلتا ہے
دلِ دیوانہ دامن میں چلا ہے عرضیاں بھر کر

یاسمین حمید میرے لیے بھی ایک بالکل نیا نام لیکن بہت مانوس آواز ہے۔ اس آواز میں الفاظ کے ساتھ سُر اور لے کا رشتہ ہے، موسیقی اور شعر کے امتزاج کا عمل۔ یاسمین حمید اپنے اندر کے فنکار کو جانتی تھی اور اُسی فن کار نے شاعری کے وسیلہ کو چُن لیا۔ یہ سچ اور ذات کی شاعری ہے ؎

ہم نے کسی کو عہدِ وفا سے رہا کیا
اپنی رگوں سے جیسے لہو کو جُدا کیا

صدا بلند ہے اتنی کہ کان پھٹتے ہیں
ہے اذن ایسا کہ گونگا بھی بولتا چاہے

کھو گیا کثرتِ گویائی کے ہنگامے میں
ایک جو حرف تھا گفتار میں دانائی کا

یاسمین کی شاعری "بازنانِ حرف گفتن" تو ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ یہ عشق کے معاملاتِ خام کا نام بھی نہیں بلکہ یہ وہ حرفِ دانائی ہے جو گفتگو کے بازار میں گم ہو کر شاعرہ کے دل میں جاگزیں ہوا اور اس کتاب (پسِ آئینہ) کے صفحات پر آیا۔

مشتاق احمد یوسفی حرف و صدا کی دنیا میں فنکار بھی ہیں اور تاجر بھی — تجارت ایسی کی کہ لکھنے والوں کو آبرو دے واد گندم ملے گا

— اس مصروفیت میں جب تھک جاتے ہیں تو نغمۂ شعر کا سہارا لیتے ہیں۔ روحانیت ان کی ذات کا ایسا رنگ ہے جسے انھوں نے رومانیت اور شوخ رنگوں میں چھپانا چاہا ہے، مگر دیکھیے کہ وہ حقیقت اور مجاز کی بزم مشترک کیسے سجاتے ہیں ؎

اُن کے دم سے ہے نورِ بزمِ حیات
آپ جلتا نہیں دیا دل کا

مشتاق قریشی کی شاعری میں بے شاخ کلیوں کا ماتم بھی ہے اور اپنی تلاش بھی۔
آدمی کیسے اور کتنا تنہا ہوتا ہے، چھپانے کے باوجود یہ موضوع مشتاق کی شاعری میں اُبھرتا ہے۔ اُن کی شاعری جبر و اختیار کی ایک نئی شرح ہے:

اور میں ہوں بگولے کی مانند
اپنی ذات میں تنہا
تپتے صحرا میں
چکراتا ہوا

پانچ نسبتاً نئے اور کم معروف شعراء کی مدد سے میں نے "انتخاب سخن" کا مقدمہ آپ کی خدمت میں پیش کیا ہے اور اب ایک خوشخبری — کم سے کم دو جلدیں میرے پاس تیار ہیں۔ ایک پاکستانی شعراء کا انتخاب (ہندوستان میں اشاعت کے لیے) اور دوسرا ہندوستانی شعراء کا انتخاب (پاکستان میں اشاعت کے لیے)

اب ایک اور مسئلہ — ہندوستان اور پاکستان دونوں جگہ دوسری ہندوستانی اور پاکستانی زبانوں کے ادب کے ترجمے اردو رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں اور تراجم کے کئی مجموعے بھی شائع ہوئے ہیں۔ پاکستان میں 'ماہِ نو'، 'افکار' اور 'نئی قدریں' نے سندھی، پنجابی، پشتو، کشمیری اور بلوچ ادب کے تراجم پابندی کے ساتھ شائع کیے ہیں۔ اکادمی ادبیاتِ پاکستان نے بھی کئی کتابیں شائع کی ہیں مثلاً زینت، پنجابی شاعری کا انتخاب اور افکارِ خوش حال خاں — میری رائے میں اب مختلف زبانوں کی عصری شاعری اور افسانوں کے ترجمے مجموعوں کی صورت میں اردو میں شائع ہونے چاہئیں — ہمیں ہندوستان کی مختلف زبانوں سے عصری ادب سے دلچسپی ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ بنگالی، ہندی، مرہٹی، تامل اور تلگو کے جدید ادب کا ایک انتخاب ہر سال شائع ہو سکے۔ ساہتیہ اکادمی یہ منصوبہ اپنے ذمہ لے سکتی ہے۔

اور آخری تجویز یہ کہ ہندوستان اور پاکستان کے اردو ادب کا ایک ایک انتخاب ہر سال انگریزی زبان میں پیش کیا جائے۔ ہو سکے تو اس انتخاب کی اشاعت کی تجویز میں کسی غیر ملکی اشاعت گھر کو شامل کر لیا جائے۔ پھر یہ انتخاب کرنے والے ایماندار اور وسیع النظر ہوں ادھر انگریزی میں ہمارے ادب کے جو انتخابات شائع ہوتے ہیں وہ " لب ہی بازوں " کے کارنامے ہیں۔ ایسے انتخابات کہ شاعر کی حیثیت سے وزیر آغا اور زاہد ڈار تو شامل ہوں مگر راشد، اختر الایمان اور عزیز حامد مدنی شامل نہ ہوں۔ حقیقی ادیب اپنے مفادات کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالتا۔ سچے حرف کے سوا اس کی کوئی لابی نہیں ہوتی مگر —

میں نے اردو ادب کے حوالے سے چند باتیں آپ کی خدمت میں پیش کیں۔ تحقیق و تنقید، لغت اور علمی کاموں کے بارے میں پھر کبھی سہی —

●●

پروپیگنڈا کے لیے ڈرامہ سب سے موثر ذریعہ ہے۔ انگریز نے اس طرف توجہ نہیں دی۔ بلکہ پارسی تھیٹر کو بھی indirect طریقے پر promote کرنے کی کوشش کی۔ لیکن میں یہ عرض کر رہا تھا کہ نیشنلزم کا تصور جس طرح سر سید کی تحریک کے حوالے سے حالی شبلی اور اس کے بعد اقبال کے ساتھ آیا۔ وہ بڑی ڈائریکٹ قسم کی کوشش تھی۔ ڈرامہ جو کہ بالکل interovert activity, نہیں۔ اس وقت ڈرامے میں اس قسم کی باتیں نہیں ہو رہی تھیں، جس قسم کی شاعری میں ہو رہی تھیں۔ بلکہ ناول میں ہو رہی تھیں۔ ڈپٹی نذیر احمد کے ہاں تو ٹھیک ٹھاک اظہار ملتا ہے۔

(انور سجاد)

آزادی کے چالیس سال اور ہندوستانی مسلمان

پروفیسر نثار احمد فاروقی

شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی دہلی ۱۱۰۰۰۷

ہمارے ملک کو آزاد ہوئے پورے چالیس سال ہو گئے ہیں۔ قوموں کی زندگی میں آزادی بہت بڑی نعمت ہے، مگر اس کا مطلب شتر بے مہار ہو جانا نہیں ہے۔ آزادی کا صحیح استعمال خود آزادی سے زیادہ اہم ہے یہ صحت مند تاریخی شعور اور سماجی بیداری کے بغیر ممکن نہیں، یہ شعور اور بیداری ایسی جنس نہیں جو بازار میں بکتی ہو اس کے سوت افراد کسی شخصیت کے اندر ہوتے ہیں اور شخصیت کسی تعمیر اچھے اخلاق اور خود افروز تعلیم و تربیت سے ہوتی ہے۔ یہ سب ایک دوسرے کی علت ہیں۔ ہمارے ملک میں آزادی سے پہلے خواندگی کی شرح بہت کم تھی، اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی تعداد میں قلیل تھے مگر معیار تعلیم اتنا پست نہیں تھا جتنا آج نظر آتا ہے۔ اب یونیورسٹیاں ڈیڑھ سو سے زائد ہو گئی ہیں مگر ابتدائی اور ثانوی کی سطح پر تعلیم کی حالت بہت ابتر ہے اور جامعات کا معیار بھی عامیانہ ہو کر رہ گیا ہے، ہمارے پانچ سالہ منصوبوں میں تعلیم کے لیے جو بجٹ رکھا جاتا ہے وہ سالانہ دس روپیہ فی کس سے زیادہ نہیں ہوتا۔ انگریز نے ہندوستان والوں کی تعلیم کا نصاب اپنے خاص مقاصد کو سامنے رکھ کر بنایا تھا جس سے ہندوستانی آپس میں لڑتے رہیں اور سرکاری دفتروں کو بابو ملتے رہیں جنھیں ہر موضوع کی صرف سطحی واقفیت ہو مگر دماغ میں خیالات نہ الجھیں کیوں کہ خیالات ہی فساد پیدا کرتے ہیں۔ آزادی کے بعد اگر ہمیں ایک ایسا معاشرہ بنانا تھا جن میں سماجی انصاف ہو، سب کو مساوی حقوق اور مواقع حاصل ہوں، نفرت اور نفاق نہ ہو، رواداری اور مفاہمت ہو، سیکولرازم اپنے صحیح مفہوم میں پھلے پھولے اور جمہوریت محض اکثریت کے غلبے اور جبر کا نام نہ ہو، تو ہمیں سب سے پہلے اپنا نظام تعلیم درست کرنا چاہیے تھا اور اپنے بچوں کو ایسی تعلیم دینی چاہیے تھی کہ انھیں ہر مذہب کی تاریخ اور تعلیم سے تھوڑی بہت واقفیت پیدا ہو۔ اس لیے کہ ہمدردی اور رواداری واقفیت کے بغیر پیدا نہیں ہوتی۔ افسوس کہ ایسا نہیں ہوا اور ہمارا تعلیمی نظام ایک سیکولر ذہن بنانے سے قاصر رہا ہے۔ سیکولرازم کا مفہوم عوام تو خیر کیا سمجھیں گے ہمارے بڑے بڑے نیتاؤں نے بھی نہیں سمجھا ہے یا اسے دل سے قبول کرنا نہیں چاہا صرف ایک پردہ بنا کر رکھا ہے تاکہ اقلیتوں کے تحفظ کی کوئی فالتو فکر کرنے سے دامن بچایا جا سکے۔

تقسیم ہند اور اس کے اثرات: ہم دو سو سال تک برطانوی سامراج کا کھلونا بنے رہے اس نے اس سرزمین میں ایسے بیج بو دیے کہ ہمارے سوچنے کی سمتیں بدل گئیں، مگر نہایت رنج اور حیرت کی بات یہ ہے کہ سامراجی سازشوں کا احساس ہونے کے بعد بھی اسی جال میں پھنستے رہے، برطانیہ کے لیے بار بار کہتے رہے کہ اس کی پالیسی "لڑاؤ اور حکومت کرو" ہے اور یہ سب جان بوجھ کر بھی آپس میں اتحاد اور محبت کا ماحول پیدا نہ کر سکے۔ اسی زمانے میں برطانوی دارالعوام کے ایک ممبر نے کہا تھا کہ "تم لڑتے ہو ہم حکومت کرتے ہیں" آزادی حاصل کرنے کے بعد بھی ہم نے اس پالیسی کو نہ صرف اپنا لیا بلکہ اور زیادہ مستحکم کر دیا۔ سراج الدولہ، سلطان ٹیپو شہید، بہادر شاہ ظفر تک ابوالکلام، گاندھی، اور بھگت سنگھ تک بے شمار ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں نے اس ملک کی آزادی کے لیے قربانیاں دیں۔ خون بہایا، سختیاں جھیلیں اور قید و بند میں اپنی زندگی کا بہترین زمانہ بتا دیا مگر آزادی کے بعد وہ لوگ محب وطن بن کر آ گئے جو انگریز کے خاص پٹھو ہوا کرتے تھے۔ جدوجہد آزادی میں کانگریس کی خوبی یہ تھی کہ اس نے ہتھیار نہیں اٹھائے تھے۔ اخلاقی قوت سے توپ اور تفنگ کا مقابلہ کیا تھا، مگر سامراج نے کیسی چال چلی، دنیا میں کہیں آج تک یہ نہیں ہوا کہ انتقال حکومت (Transfer of power) کے وقت اقتدار سونپنے والے تو صاف بچ کر نکل جائیں اور اقتدار لینے والے آپس ہی میں ایک دوسرے کا گلا کاٹنے لگیں۔ ہمیں آج تک یہ اندازہ نہیں ہے کہ دو سو سال میں انگریز نے ہندوستان کی ساری دولت یوروپ کو منتقل کر دی تھی اور ہمیں بالکل قلاش بنا دیا تھا جب کہ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں نے یہاں کی دولت کبھی باہر نہیں بھیجی۔ قومیت اور وطن کے جس تصور پر آج ہم نازاں ہیں یہ پیالہ بھی سامراج کا پلایا ہوا ہے، اس کے کچھ اثرات تو آنکھوں کے سامنے ہیں کچھ اور آئندہ برسوں میں ظاہر ہوں گے۔ اسی نظریۂ قومیت کی آڑ میں دو قومی نظریے کا تخیل پیش کیا گیا، مگر ہوا کیا ہوا؟ ہندوستان پاکستان اور بنگلہ دیش میں ہندو اور مسلمان تین تین قومیتوں میں تقسیم ہو چکے ہیں، تینوں کے حالات و مسائل جدا ہیں، مفادات مختلف

ہیں بلکہ ایک کے نقصان میں دوسرے کا فائدہ چھپا ہوا ہے۔ تقسیم وطن کے اثرات کیسے مہلک ہوئے۔ صدیوں کے بنے ہوئے خاندان اکھڑ گئے۔ لاکھوں کے گھر خاک ہو گئے، نو دولتیوں کے طبقے دونوں طرف وجود میں آ گئے۔ بقول شاعر:

کیسے کیسے ایسے ویسے ہو گئے ایسے ویسے کیسے کیسے ہو گئے

تقسیم وطن کی ذمہ داری مسلمانوں کے سر پر منڈھ دی جاتی ہے اور اپنی شدید بے خبری کے باعث مسلمان اس کی ذمہ داری قبول کرتے رہے ہیں حالانکہ اس سے بڑی تہمت کوئی ہو نہیں سکتی، تقسیم کے ذمہ دار وہ ہیں جنھوں نے تقسیم کو قبول کیا تھا۔ یہ سچائی آج نہیں تو کل ظاہر ہو کر رہے گی۔

سوشلزم کی دہائی: کانگریس نے ۱۹۲۰ء سے بھی پہلے سے سوشلزم کا نعرہ لگانا شروع کیا تھا۔ وہ سماج وادی نظام معیشت قائم کرنے کا دعویٰ کرتی تھی مگر دستور ہند میں بھی وضاحت کے ساتھ اس کی گنجائش نہ رکھ سکی۔ مولانا حسرت موہانی مجلس دستور ساز کے واحد ممبر تھے جنھوں نے دستور کے مسودے پر دستخط نہیں کیے کیوں کہ اس میں سوشلزم کی ضمانت نہیں تھی۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ کانگریس کی طاقت عوام سے تھی اور اس کو اقتصادی امداد سرمایہ داروں سے مل رہی تھی۔ اب چند خاندان سارے ملک کی صنعت کو اپنی مٹھی میں لیے بیٹھے ہیں، سارا پریس ان کے پاس ہے، ان کی امداد اور سرپرستی سے الیکشن جیت کر آنے والے پارلیمنٹ میں بیٹھے ہیں تاکہ ان کے مفادات کی حفاظت کرتے رہیں۔ یہی سرمایہ دار طبقہ فرقہ پرست اور فتنہ پرور جماعتوں کی مالی امداد کرتا ہے تاکہ ننگے بھوکے بے وقوف عوام چھوٹے اور حقیر مسئلوں میں الجھ کر سر پھٹول کرتے رہیں اور اس غلط فہمی میں مگن رہیں کہ وہ اپنے دین و مذہب یا "پراچین پرمپرا" کی بڑی خدمت کر رہے ہیں اور انھیں حکومت سے اپنے بنیادی حقوق طلب کرنے کی مہلت ہی نہ ملے۔ ورنہ اس ملک میں جہاں ۸۵٪ آبادی مزدور پیشہ ہے، بہت بڑی تعداد سخت افلاس کے عالم میں زندگی گزار رہی ہے لاکھوں انسان بھیک مانگ کر پیٹ بھرتے ہیں۔ لاکھوں عورتیں پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے کسبیاں بن جاتی ہیں، کروڑوں انسانوں تک آج بھی تعلیم پہنچی ہے نہ طبی امداد، نہ ان کے سر پر کوئی چھت ہے نہ بدن پر سالم کپڑا ہے، انھیں ۱۸ گھنٹے سخت محنت کرنے کے بعد صرف اتنا آذوقہ میسر آتا ہے کہ بہ مشکل جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھ سکیں۔ پیٹ بھرنے کی فکر اتنا وقت ہی نہیں چھوڑتی کہ وہ اور کوئی فکر کر سکیں، اعلیٰ متوسط طبقے کے لیے بھی یہ تصور سخت اجنبی ہے کہ وہ اپنا مکان بنا سکیں یا اپنی سواری خرید سکیں ایسے ملک کے ان رہنماؤں کو "پرمپرا" کی فکر ستا رہی ہے جیسے ان کے رقص و موسیقی کو، مجسمہ سازی و مصوری کو کوئی لوٹے لیے جا رہا ہے۔ کسی مفلس اور پراگندہ حال معاشرے نے کبھی بلند افکار پیدا نہیں کیے۔ یہ طبقہ ایسا ہی ماحول بنائے رکھنا چاہتا ہے جس میں کوئی عظیم فنکار یا فلسفی، کوئی انقلابی دعوت دینے والا دانشور، کوئی مصلح اور معمار پیدا نہ ہو سکے۔ ہم صرف کلاسیکی سرمائے اور پرمپرا کے گن گاتے رہیں اور اس سے غافل رہیں کہ کوئی کالی داس یا تلسی داس، کوئی جائسی یا غالب آج بھی پیدا ہو سکتا ہے بلکہ تابندہ تر شعور کے ساتھ پیدا ہو سکتا ہے۔ یہ بھی اسی سامراجی سازش کے اثرات ہیں جس نے ہمارے سوچ کے دھارے ہی بدل کر رکھ دیے ہیں۔

ان چالیس برسوں میں، ایک مختصر سے وقفے کو چھوڑ کر، مرکزی حکومت کانگریس کے ہاتھ رہی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ آزادی کی جدوجہد میں کانگریس کا رول تاریخی اہمیت رکھتا ہے ان رہنماؤں کے اخلاص پر بھی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ پنڈت نہرو اور ان کی کابینہ کے رفقا سب ممتاز شخصیات تھیں اور ان کا ہندوستان گیر امیج (Image) تھا، مگر حصول آزادی کے بعد کانگریس نے اپنے انتخابی منشور ایسے بنائے کہ بقول اکبر: "شیخ بھی خوش رہیں شیطان بھی بیزار نہ ہو" سماج کے ہر طبقے کی جائز و ناجائز خواہشوں اور مطالبوں کی جھلک اس میں مل جائے، سیکولرسٹ قوتیں بھی خوش رہیں اور فرقہ پرست بھی مایوس نہ ہوں، بہت سے وعدے زبانی جمع خرچ سے آگے نہ بڑھیں، سرمایہ داروں کو پورا تحفظ مل جائے اور بھولے عوام کو فقط "وعدہ حور" پر خوش رکھا جائے۔ اس پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ کوئی دوسری سیاسی جماعت ملک گیر قوت حاصل نہ کر سکی اور اسے مجبوراً جات پات یا علاقائی عصبیت کا سہارا لینا پڑا، اب تمام ریاستوں میں صوبائی پارٹیاں پیدا ہو گئی ہیں اور انھوں نے علاقائی جذبات کا رنگ خوب چوکھا کر دیا ہے اسی طرح برادری اور نسل، زبان اور مذہبیت کا تعصب بھی خوب گہرا ہو چکا ہے۔ ہمارے ذرائع ابلاغ (Mass Media) نے کسی غیر کانگریسی شخصیت کا قومی تصور (National Image) ابھرنے ہی نہیں دیا اس لیے جب الیکشن میں حزب مخالف کے کسی قد آور شخص کا مقابلہ کرنا ہوتا ہے تو فلمی دنیا سے اداکاروں کو درآمد کیا جاتا ہے۔ نہرو کے زمانے تک ایسے لوگ کابینہ میں موجود تھے جن کا جنگ آزادی میں کچھ نہ کچھ حصہ تھا اور وہ نہرو کے برابر نہ سہی ان کے لگ بھگ ضرور تھے اور حکومت کی کسی غلط پالیسی پر ٹوک بھی سکتے تھے بلکہ اسے تبدیل کرا سکتے تھے، مگر اب سیاست کے میدان میں وہ آتا ہے جس کے پاس دولت ہے یا سرمایہ داروں کی پشت پناہی ہے یا اس نے کسی چھوٹے سے حلقے میں اپنا زور باندھ رکھا ہے۔ کوئی سمجھ دار انسان، کوئی دانشور، حالات کی نبض پہچاننے والا کوئی بڑے سے بڑا عبقری (Genius) یہ جرأت نہیں کرتا کہ الیکشن میں کھڑا ہو جائے، اول تو اس کو ٹکٹ نہیں ملے گا اور مل گیا تو ضمانت واپس نہیں ملے گی۔ اس لیے زمام کار ان ہاتھوں میں ہے جو کوئی وژن (Vision) نہیں رکھتے۔ حق گوئی کے لیے قلندری شرط اول قدم ہے، جسے دنیا کی ہوس خود در در لیے پھرتی ہو وہ حق کی پاسداری

کیا کرے گا؟ بہت ہی کم مثالیں ایسی ہوں گی کہ ان لیڈروں نے اپنے ہی ضمیر کی آواز کو کان دھر کر سنا ہو اور سارے مفادات کو بالائے طاق رکھ کر صرف حق بات کہی ہو۔ ہمارے ملک میں حق کی پاسداری کرنے والوں کا حشر مولانا حسرت موہانی اور پنڈت سندر لال کا سا ہوتا ہے۔

معاشی سطح پر دیکھیے تو نابرابری میں برابر اضافہ ہو رہا ہے، ایک خاندان کا تجارتی سرمایہ تین ہزار کروڑ روپے سے بھی زیادہ ہے اور دوسرے خاندان کو تین روپے بھی میسر نہیں کہ وہ مونگ پھلیاں ہی بیچ لے۔ ٹیکس کا سارا بوجھ متوسط طبقے کی کمر پر لاد دیا جاتا ہے تاکہ سرمایہ داروں کو گزند نہ پہنچے۔ یہ ایسی ہی پالیسیوں کا نتیجہ ہے کہ سرمایہ دار طبقہ نے کلچر کی سرپرستی اور مذہبی احیاء کے نام پر ایسے اداروں کو فروغ دیا ہے جو مذہبی اور تہذیبی جارحیت اور آپس میں منافرت کو بڑھاوا دے رہے ہیں۔ ہم نے تضادات میں زندگی بسر کرنے کو اپنا شعار بنا لیا ہے، کہتے کچھ ہیں، کرتے کچھ ہیں۔ جن باتوں کا حاصل کرنا مقصود نہیں ہوتا ان پر خوب زبانی جمع خرچ کرتے ہیں ایسا ہی ایک کھوکھلا اور بے روح نعرہ "قومی یک جہتی" کا ہے، مگر قومی یک جہتی ایسی آبرو باختہ نہیں کہ ایک سیمینار کرنے سے، ایک قوالی کر لینے سے یا ایک مشاعرہ کرنے سے قابو میں آجائے گی، بقول حسرت:

وصل کی بنتی ہیں ان باتوں سے تدبیریں کہیں
آرزؤں سے پھرا کرتی ہیں تقدیریں کہیں

قومی یک جہتی کے نعرے جیسے اوپرا تو اور بے رس ہیں ان سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ آواز دل سے نہیں حلق سے نکل رہی ہے۔ میں نے ابتدا ہی میں عرض کیا تھا کہ کوئی ہمدردی واقفیت کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتی اور ہم نے ہندوستانیوں کو ایسی تعلیم ہی نہیں دی کہ وہ ایک دوسرے کو اچھی طرح اور صحیح سیاق (Context) میں سمجھ سکیں۔ مسلمانوں کو دفاعی پوزیشن میں رکھنے کے لیے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ "قومی دھارے" میں شامل ہوں، مگر آج تک کسی بوجھ بجھکڑ نے یہ نہیں بتایا کہ یہ دھارا ہمالیہ کی کون سی چوٹی سے نکلتا ہے اور کس سمندر کے دامن میں جذب ہو جاتا ہے؟ اگر قومی دھارے کا مطلب یہ ہے کہ ملک کے امن وامان کو تہس نہس کیا جائے، بے گناہ اور غریب انسانوں کی پیٹھ میں خنجر گھونپے جائیں، ان کی دکانوں اور مکانوں کو آگ لگا دی جائے، چھوٹی چھوٹی باتوں کو بہانہ بنا کر دنگا فساد کیا جائے، عورتوں کو بیوہ، بچوں کو یتیم اور جوانوں کو اپاہج بنا دیا جائے۔ توہمات پر خوب روپیہ اور وقت خرچ کیا جائے اور حقائق سے آنکھیں موند لی جائیں تاریخ کو افسانہ اور افسانوں کو تاریخ بنا دیا جائے، مسلمان بھی اپنے تئیں جات پات میں بانٹ لیں اور طبقوں میں تقسیم ہو جائیں، "اعلیٰ اور ادنیٰ" کے امتیازات قبول کر لیں، اپنے بچوں کو بلی چڑھا دیں اور بیوہ کو چتا پر رکھ کر پھونک دیں، تو مسلمان یہ سب ہرگز نہیں کریں گے اور انھیں ایسا کرنا بھی نہیں چاہیے۔ اگر قومی دھارے کا مطلب یہ ہے کہ کم جہیز لانے والی بچیوں کو مٹی کا تیل چھڑک کر جلا دیا جائے، فرقہ وارانہ جذبات کو بھڑکانے والی اور منافرت پیدا کرنے والی تحریکیں گلی گلی پھیلا دی جائیں، ہریجنوں اور کمزور طبقوں کے افراد کو اوپر نہ اٹھنے دیا جائے، انھیں صرف زبانی دعووں سے خوش رکھا جائے، تو مسلمان اس دھارے سے بھی الگ ہی رہیں گے اور انھیں الگ رہنا ہی چاہیے۔ پھر یہ بھی بتایا جائے کیا ہندوستان کے سکھ اور عیسائی، جین اور پارسی، بودھ اور لنگایت سب اس دھارے میں شامل ہو چکے ہیں صرف مسلمان ہی باہر رہ گئے ہیں؟

اگر اس قومی دھارے کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کا ہندوستان کی سیاست میں مثبت اور تعمیری رول ہو، یہاں کی صنعت و حرفت میں وہ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا سکیں، مختلف عہدوں اور ملازمتوں میں ان کی اہلیت اور وفاداری وحب الوطنی کا ملک اور قوم کو فائدہ پہنچے، یہاں کی تہذیب و ثقافت کے سرمائے میں وہ بھی مثبت اور مفید اضافے کریں اور ان کی مطمئن زندگی ایک سچی جمہوریت کی شاہد عادل بن جائے، تو اس دھارے کو ان تک یا انھیں اس دھارے تک پہنچنے سے کون روک رہا ہے؟ کیا مسلمانوں نے خود اپنے پیروں میں بیڑی ڈال رکھی ہے؟

یہ کیسی جمہوریت ہے؟ ہندوستان میں مسلمانوں کی صحیح تعداد کا اندازہ چار مردم شماریوں کے بعد بھی نہیں ہو سکا ہے، مگر قیاس چاہتا ہے کہ وہ مجموعی آبادی کا کم از کم ساڑھے بارہ فیصد ضرور ہیں، ہریجن اور کمزور و پس ماندہ طبقات کا تناسب بھی ۲۵ ٪ سے کم نہیں ہے، ہریجنوں کو ان کی سطح سے اوپر اٹھانے کے لیے جس رفتار سے کام ہوا ہے اس سے کہیں زیادہ تیزی کے ساتھ مسلمانوں کو پستی کی طرف دھکیلا گیا ہے۔ قومی زندگی کے ۸۵ ٪ شعبوں میں مسلمانوں کی نمائندگی صفر ہے اور ۱۵ ٪ شعبوں میں ایک یا دو فیصد سے زیادہ نہیں ہے جب تک ہریجن، پس ماندہ طبقات، اور مسلمان اوپر اٹھنے کے مساوی مواقع نہیں پاتے اس ملک میں حقیقی خوش حالی نہیں آسکتی۔ آپ اس ملک کو خوش حال اور ترقی یافتہ نہیں کہہ سکتے جس کی ۲/۷ آبادی پچھڑی ہوئی ہو۔ جمہوریت اور سیکولرازم کی کامیابی کا معیار یہ ہے کہ اقلیتیں محفوظ اور مطمئن ہوں، ہندوستان کو محض اس بنا پر دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت نہیں کہا جا سکتا کہ یہاں ووٹ ڈالنے والوں کی تعداد زیادہ ہے، یہ سب سے بڑی جمہوریت اسی وقت ہو سکتی ہے جب یہاں ہر مظلوم کو انصاف ملے اور ہر ظالم کو ظلم کی سزا۔ یہ کیسی جمہوریت ہے جہاں بقول سعدی "سنگ با بستند وسگ باکشادند" پتھر بندھے ہوتے ہیں اور کتے کھلے ہوتے۔ انگریز کے زمانے میں جو ہوا سو ہوا، آزادی کے بعد اس ملک میں ۲۰ ہزار سے بھی زیادہ بلوے ہو گئے مگر کسی ایک فسادی کو بھی سزا نہیں ملی۔ الزام ہمیشہ

مسلمانوں کے سر رہتا ہے، ہم کہتے ہیں مسلمانوں پر ہی مقدمہ چلاؤ ان کا جرم عدالت میں ثابت کرو اور انھیں وہ سزا دو جس کے وہ مستحق ہیں۔ کیا اتنے تلخ اور طویل تجربوں کے بعد بھی ہماری پارلیمنٹ کے لیے یہ ممکن ہو سکا کہ وہ فرقہ وارانہ فسادات کی روک تھام کے لیے موثر قوانین بنا لیتی؟ مگر ان کا نقصان تو مسلمانوں کو ہو رہا ہے اور یہی رجعت پرست جماعتوں کا منشا ہے۔ اب یہ حال ہو گیا ہے کہ :

وہی قاتل، وہی شاہد، وہی منصف ٹھہرے
اقربا میرے کریں خون کا دعوا کس پر ؟

پولیس اور نیم فوجی دستے جن کا فرض منصبی جان مال اور آبرو کی حفاظت کرنا ہے جب وہ بھی قاتل اور لٹیرے بن جائیں تو مسلمانوں میں عدم تحفظ کا احساس کیسے پیدا نہ ہو؟ مسلمان برابر یہ تجربہ کر رہا ہے کہ اس کی تہذیب و ثقافت کے آثار مٹا دینے کی ہر سطح پر کوشش پیہم ہو رہی ہے۔ اس کی شناخت اور شخصیت کو ختم کرنے کے لیے گہری سازش کی جا رہی ہے اور جو کچھ بھی دم دلاسے ہیں وہ محض سطحی اور زبانی ہیں۔ اس کی جان مال آبرو اور شناخت جب تک محفوظ نہ ہو وہ بڑے قومی نقشے میں اپنی جگہ کیسے بنا سکتا ہے ؟

یہ دفترِ گلہ تو بہت دراز ہے، بقولِ غالب

پُر ہوں یوں شکوے سے میں راگ سے جیسے باجا
اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے

اب میں خود مسلمانوں سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ مسلمان تاریخی شعور رکھتے ہیں اس لیے وہ تاریخ سے عبرت بھی حاصل کر سکتے ہیں اور حقیقت کا چہرہ بے نقاب دیکھنے کی تاب بھی لا سکتے ہیں، دوسروں کا شکوہ کرتے رہنے یا ان سے توقع وابستہ کرنے سے زیادہ مفید یہ ہوگا کہ ہم اپنا جائزہ لیں اور اپنا احتساب کریں۔ حالات نے آج جو کروٹ لی ہے اسے بڑے تاریخی چوکھٹے میں دیکھیں اور اس کا تجزیہ کریں۔ اس سلسلے میں صرف چند نکتوں کی طرف اشارہ کروں گا۔ پہلی بات تو یہ کہ کوئی بھی قوم یا طبقہ افراد سے بنتا ہے، جو کیفیت افراد کی ہوتی ہے اور جن حالات سے ایک فرد گزرتا ہے وہی تجربہ ایک وسیع تر منظر (Perspective) میں قوموں کو بھی ہوتا ہے۔ ہم اگر اپنے اعمال کا محاسبہ نہ کریں اور اپنے ضمیر کی آواز کو سننے سے انکار کر دیں تو بے حس اور مجرم بن جاتے ہیں اسی طرح جو قومیں اپنے ماضی سے عبرت حاصل نہ کریں، حال پر تنقید اور محاسبے سے گریز کریں، مستقبل کے لیے تدبیر و تدبر سے کام نہ لیں اور گوسفندی مزاج پر قناعت کریں وہ مظالم کا شکار ہوتی رہتی ہیں۔

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

ہم اس "جرم ضعیفی کی سزا" سے اسی وقت بچ سکتے ہیں کہ خود تنقیدی کی عادت ڈالیں۔ فارسی کا شاعر عرفی کہتا ہے :

خواہی کہ عیب ہائے تو روشن شود ترا
یک دم منافقانہ نشیں در کمین خویش

یعنی اگر اپنے عیوب کو دیکھنا چاہتے ہو تو اپنی ہی گھات میں بیٹھ جاؤ۔ ہمیں یہ سوچنا ہے کہ جو کچھ پیش آ رہا ہے اس میں ہمارا حصہ کیا ہے؟ قرآن کا ارشاد تو یہ ہے کہ "اللہ تعالیٰ کسی پر ظلم نہیں کرتا بلکہ انسان خود اپنے آپ پر ظلم ڈھاتا ہے۔" ہمارے بزرگوں نے تغیر اور انقلاب کی حقیقت اور قوت کا صحیح اندازہ نہیں کیا اور ایک نہایت ترقی پسند (Dynamic) مذہب کے پرستاروں کی زندگی اور فکر کو جامد (Static) بنا دیا۔ اگر ہم انقلاب کا استقبال کرنے والی لچک سے محروم نہ ہوتے تو اتنے بھیانک نتائج دیکھنے نہ پڑتے۔ قوموں کی زندگی میں عروج کے بعد زوال بھی آتا ہے، نیچے گرنے کے لیے کسی بلندی پر ہونا ضروری ہے، مردہ اور غیر ترقی یافتہ قومیں عروج و زوال کی قید سے آزاد ہوتی ہیں، اس عروج و زوال کا بھی ایک چکر یا سائیکل ہوتا ہے جو تقریباً ایک ہزار سال میں پورا ہو جاتا ہے۔ دنیا کی سب سے عظیم اور وسیع سلطنت رومۃ الکبریٰ تھی جس نے ترقی کی اعلیٰ ترین منزلیں طے کی تھیں، اس کے زوال کے بعد مسلمانوں کا عروج شروع ہوا اور تقریباً ایک ہزار سال میں یہ سائیکل بھی پورا ہو گیا۔ یوروپ نے جب خوابِ خرگوش سے آنکھیں کھولیں تو مسلمانوں کی وساطت سے یونان و روما کا گم شدہ علمی سرمایہ واپس مل گیا اور اس نے تین چار صدیوں میں اپنے زوال کے اسباب پر کڑی تنقید کر کے اپنے لیے حیات تازہ کا سامان ایسا فراہم کر لیا کہ آج کی دنیا میں دراصل انھیں کی سیادت ہے، ہم تو تیسری بلکہ چوتھی دنیا میں بس رہے ہیں۔

سلطنتِ رومۃ الکبریٰ کے اسبابِ زوال پر مشہور مورخ ایڈورڈ گبن نے ایسی لاجواب کتاب لکھی ہے جس کا شمار دنیا کے عظیم کلاسیکی ادب میں ہوتا ہے، یہ ایسی کتاب ہے کہ باشعور تعلیم یافتہ انسان کو اسے نہایت غور سے پڑھنا اور اس سے سبق لینا چاہیے۔ گبن نے سلطنت رومۃ الکبریٰ کے زوال کے اسباب ایک ایک کر کے گناتے ہیں۔ ان میں سے چند کا یہاں تذکرہ کرتا ہوں : وہ کہتا ہے کہ رومن حکومت میں علاقائی تعصب بہت پھیل گیا تھا اور ہر علاقہ خود مختار ہونا چاہتا تھا۔ روما کے باشندے رقص، موسیقی، شاعری، کھیل کود، ناٹک، اکھاڑے، مجسمہ سازی، وغیرہ میں زیادہ دلچسپی لینے لگے تھے اور علم کی قدر اتنی گھٹ گئی تھی کہ تعلیم و تدریس کا پیشہ غلاموں کے سپرد

کر دیا تھا۔ جو سوسائٹی کے بہترین افراد تھے وہ اداکار کھلاڑی بننا پسند کرتے تھے۔ ہماری سوسائٹی کیا اس سے مختلف راستے پر جا رہی ہے؟ پڑوس کے ایک کھلاڑی نے شارجہ میں ایک چھکا مارا تو قوم نے اسے ایک کروڑ روپے انعام میں دے دیے اگر افلاطون، ارسطو، بقراط، سقراط سب زندہ ہو کر آجائیں تب بھی اس ملک میں ایسی قدر دانی کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے۔ دو چار سیل دوڑ کر ایک اتھلیٹ کو جو دولت اور شہرت حاصل ہو جاتی ہے کیا کوئی فلسفی یا سائنس داں، کوئی دانشور یا مفکر خواب میں بھی اس کا تصور کر سکتا ہے؟ آپ اسے "ترقی" سمجھا کریں، یہ سب ذہنی دوالیہ پن کی نشانیاں اور زوال کے مقدمات ہیں۔ جاگیر دارانہ نظام میں قدر و منزلت کا معیار یہ تھا کہ حاکمان وقت کو خوش رکھا جائے:

اگر شہ روز را گوید شب است این
بباید گفتن اینک ماہ و پروین

یعنی بادشاہ اگر دن کو رات کہے تو یہ کہنا چاہیے کہ جی ہاں وہ رہے چاند ستارے۔ کیا آج کی قدر افزائیوں کے پیمانے اس سے کچھ مختلف ہیں؟

ثقافتی اور مذہبی احیاء پسندی: ثقافتی احیاء کا نظریہ بھی تاریخ میں زوال کا پیش خیمہ ثابت ہوا ہے۔ کلچر اپنی فطری قوت نمو سے پنپتا ہے یہ کوئی ایسی جنس نہیں ہے جسے اچھی کھاد دے کر زیادہ پیداوار حاصل کی جا سکے۔ مگر کلچر کے عشق میں عوام کو گرفتار کرنے کا مقصد بھی دراصل یہ ہے کہ وہ دوسرے بنیادی تقاضوں سے غافل رہیں۔ ہم نے فرانس، امریکہ اور روس میں "ہندوستانی میلہ" لگا کر کروڑوں روپے برباد کر دیے۔ کیا ان ملکوں کو ہماری اصلی حالت معلوم نہیں ہے کہ وہ ان بہلاووں میں آجائیں گے؟ اسی روپے سے چھوٹے چھوٹے مکان بنا کر ہزاروں بے گھر لوگوں کو بسایا بھی جا سکتا تھا، لاکھوں پیشہ وروں کی گھریلو صنعتوں کے فروغ کے لیے تقاوی دی جا سکتی تھی۔ یہ چونچلے کبھی روس یا امریکہ کو نہیں سوجھتے کہ وہ اپنے کلچر کی تبلیغ کریں۔ شاید ان کے پاس ایسا شاندار کلچر ہی نہ ہوگا۔

اسی ذہنیت کا دوسرا مظہر مذہب کی اندھی احیاء پسندی ہے۔ ثقافتی احیاء سے تو غفلت پیدا ہوتی ہے مگر پامال مذہبی روایات کی احیاء پسندی شقاوت، بے رحمی اور سنگ دلی کو جنم دیتی ہے جس کے نمونے آپ آئے دن دیکھ رہے ہیں۔ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ جب مذہب اور ریاست میں دوڑ شروع ہوتی ہے اور مذہب کو بالادستی حاصل ہو جاتی ہے تو ریاست تباہ ہو جاتی ہے۔ گبن کہتا ہے کہ سلطنت روما کے زوال کی تاریخ دراصل مذہبی شقاوت کی فتح کی داستان ہے روم الکبریٰ میں مذہبی رہنماؤں کو عروج اس لیے حاصل ہوا تھا کہ مذہبی توہم پرستی اور ظاہری رسوم کی پاسداری حد سے بڑھ گئی تھی۔ آج مختلف مذہبی فرقوں کو غیر صحت مند مذہبی مظاہروں کے لیے جس طرح کھلی چھوٹ اور ڈھیل دی جا رہی ہے اس کا انجام بھی تاریخ کی منطق میں اس سے مختلف نہیں ہوگا۔ روما کے عوام بھولے تھے اور مذہبی نعروں کے سیلاب میں آسانی سے بہہ جاتے تھے، وہ مفلس بھی تھے، اگر کوئی انھیں راحت و آسائش کے خواب دکھاتا تھا (خواہ وہ مرنے کے بعد بھی ملنے والی نہ ہو) اس کے جھنڈے تلے جمع ہو جاتے تھے، کلچر کے نام پر ہمارے بھولے اور مفلس عوام کے ساتھ بھی آج یہی مذاق ہو رہا ہے۔ کوئی بھی سوسائٹی ہو وہ اسی وقت تک توانا رہتی ہے اور آنے والے خطرات کا مقابلہ کر سکتی ہے جب اس کے افکار کی بنیاد عقل اور منطق پر ہو، جذبات اور توہمات پر نہ ہو۔ اگر ہمارا تعلیمی نظام ناقص ہے، وہ ہمیں ہمارے گرد و پیش کا صحیح علم نہیں دیتا۔ اگر ہم اپنے کلچر اور مذہب کے نام پر جذباتی ہو جاتے ہیں اور عقل و خرد کی باتوں سے بدکنے لگتے ہیں تو ذہن کی کھڑکیاں بند ہو جاتی ہیں، تازہ ہوا کا گزر نہیں ہوتا اور تخلیقی صلاحیتوں کے سوتے خشک ہو جاتے ہیں۔ مذہب اور ثقافت کے نام پر اکثر ہمارا استحصال ہوتا رہتا ہے جس سے اغیار فائدہ اٹھاتے ہیں۔ مملکت روما میں بھی پارلیمنٹ کے ممبر بڑے جاگیردار اور مالدار لوگ تھے، مفلس عوام کا حقیقی نمائندہ کوئی نہ تھا۔ کیا آج اس سے کچھ مختلف نقشہ ہے؟ کوئی مفلس انسان، خواہ وہ عقل کل ہی کیوں نہ ہو، کیا یہ توقع کر سکتا ہے کہ وہ پارلیمنٹ میں اپنے جیسے مفلس انسانوں کا حقیقی نمائندہ بن کر داخل ہو جائے گا؟

عمل کی بنیاد فکر میں ہے: ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ جو قوم اوپر اٹھتی ہے اسے قانونِ فطرت کے تحت ایک دن نیچے بھی آنا ہوگا۔ ہاں اس زوال کو متوازن اندازِ فکر اور حسنِ تدبیر سے روکا جا سکتا ہے۔ اندازِ فکر سب سے اہم بات ہے اس لیے کہ ہم پہلے سوچتے ہیں پھر عمل کرتے ہیں، یعنی اعمال کی بنیاد بھی فکر میں ہوتی ہے اور قومی اعمال ہی عروج یا زوال کا سبب بنتے ہیں۔ اندازِ فکر میں سب سے اہم اور بنیادی بات یہ ہے کہ ہم حقیقت کو اس کے اصلی روپ میں دیکھنے کے عادی ہوں۔ اسلام کی تعلیم یہی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعا کرتے تھے کہ "ربِّ أرنِی حقیقۃَ الاشیاءِ کما ھی" "اے اللہ مجھے اشیاء کی حقیقت دکھا دے جیسی کہ وہ ہے"۔ مسلمان کو اپنا اندازِ فکر و نظر سنجیدہ، مبہم، غیر حقیقت پسندانہ اور پُر فریب نہیں رکھنا چاہیے۔ آپ کو نصاب وہ پڑھایا جا رہا ہے جس میں غیر تاریخی، نیم تاریخی اور فرضی داستانیں بھری ہوئی ہیں جن کی عملی زندگی میں کوئی افادیت نہیں، یہ سب ہمیں خیالی دنیا میں پہنچانے والے اور آنکھیں بند کرنے والے افسانے ہیں جو حقیقت کا چہرہ دیکھنے نہیں دیتے۔ وقت ایک ابدی حال (Eternal present) ہے، آپ کسی سیٹلائٹ میں بیٹھ کر زمین کے مدار سے اوپر اٹھ جائیں تو یہ کرۂ ارض بھی ذرا سا جزیرہ نظر آئے گا، اور بلند ہو جائیں تو ماضی، حال اور مستقبل سب ایک پوائنٹ دکھائی دیں گے۔ اس لیے ایک زندہ اور باشعور قوم کو اپنے حال پر نظر رکھنی چاہیے، مستقبل کے بارے میں حقیقت پسندی کے ساتھ سوچنا چاہیے اور ماضی سے اپنا رشتہ منقطع

نہیں کرنا چاہیے۔ صرف ماضی کی گود میں بیٹھ کر "پدرم سلطان بود" کا وظیفہ پڑھنا اور ماضی کی شان و شوکت کی داستانیں دہرانا لاحاصل ہے۔ اس سے قومیں بے عمل اور خیالی دنیا کی اسیر ہو جاتی ہیں۔ اپنے حال میں فکر و تامل کرنا ہی اسلام کی تعلیم ہے۔ قرآن کریم میں نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کے بارے میں جتنی آیات ہیں ان سے کئی گنا زیادہ وہ آیات ہیں جن میں فکر و نظر کی تاکید کی گئی ہے یعنی اپنے حال اور ماحول میں غور و تدبر کی۔

ہمارے افکار کی تین صورتیں ہیں: کچھ عقیدے سے تعلق رکھتے ہیں جیسے تصورِ آخرت یا ایمان بالغیب۔ دوسری قسم ان افکار کی ہے جو جذبات سے پیدا ہوتے ہیں جیسے شاعری یا فنونِ لطیفہ کی دوسری قسمیں، اور تیسرا گروپ ان خیالات کا ہے جو عقل و دانش کے سرچشمے سے پھوٹتے ہیں سائنس، فلسفہ، ریاضی وغیرہ علوم اسی قبیل کے ہیں۔ اسلام نے ان تینوں میں اعتدال اور توازن قائم رکھنے کا حکم دیا ہے۔ آپ صرف غیب کی باتوں ہی میں الجھ کر نہ رہ جائیں یا صرف شاعری اور موسیقی ہی کے رسیا بن کر نہ رہیں۔ اسی طرح نرے فلسفی اور خشک منطقی بھی نہ بنیں، اِن سب کا خوشگوار امتزاج ہو تو ایک متوازن شخصیت وجود میں آتی ہے اور کسی معاشرے میں ایسی متوازن شخصیتوں کا ایک چھوٹا سا طبقہ ہی اس سوسائٹی کا ضمیر اور اس کا دماغ بن جاتا ہے اس کو قرآن نے " اولو بقیۃ " کہا ہے:

فلولا کان من القرون من قبلکم اولوا بقیۃ ینہون عن الفساد فی الارض الا قلیلا ممن انجینا منہم (۱۱:۱۱۶)

(ترجمہ: سو کیوں نہ ہوئے ان جماعتوں میں جو تم سے پہلے تھیں ایسے لوگ جن میں اثر خیر رہا ہو۔ کہ منع کرتے بگاڑ کرنے سے ملک میں، مگر تھوڑے کہ جن کو ہم نے بچا لیا ان میں سے)

کسی سوسائٹی میں سب ہی فرشتے یا دانشور نہیں ہوا کرتے، اکثریت عوام کالانعام کی ہوتی ہے اور ایک چالاک طبقہ اپنے مفادات کے لیے ان کے جذبات کا استحصال کرتا ہے، مگر ایک چھوٹا سا طبقہ وہ بھی ہوتا ہے جو اس سوسائٹی کا ضمیر بن کر کام کرتا ہے اور اسے فکری روشنی دکھاتا ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کو ایسی رہنما شخصیات ہر دور میں ملتی رہی ہیں لیکن اس زمانے میں امت کو خاص طور سے دھیان رکھنا ہوگا کہ کچھ اہلِ فکر و نظر، صاحبِ دل اور دانشور موجود رہیں اور ان کو دنیا ساز لیڈروں سے بچا کر ان کے مقامِ عظمت و حرمت میں باقی رکھا جائے اور ان کی آواز کو نہ صرف سنا جائے بلکہ موثر بنایا جائے۔ قوموں کے عروج و زوال کی تاریخ کے بارے میں مختلف نظریات رہے ہیں، ایک بہت ہی سیدھا سا اور چھا جانے والا نظریہ تو جبریت کا ہے، یعنی انسان مجبور ہے، خدا کے حکم کے بغیر ایک ذرہ بھی حرکت نہیں کر سکتا:

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

لیکن اگر انسان اپنے اعمال کا مختار نہ ہوتا تو سزا و جزا کے قوانین بھی نہ ہوتے اس نظریۂ جبریت کو سیاسی مقاصد سے اہلِ مذہب نے خوب شائع کیا، جن مذاہب میں عظمتِ آدم کا تصور نہیں تھا وہ اس مغالطے میں آسانی سے مبتلا ہو گئے اور ہزاروں برس اس کے اسیر رہے۔ اسلام جب آیا تو دنیا کے بڑے حصے پر اسی نظریے کی حکمرانی تھی کہ انسان دیوتاؤں کے ہاتھ میں کھلونا ہے، انھیں خوش کرنے کے لیے انسانی جانوں کی بھینٹ بھی چڑھائی جاتی تھی، مگر قرآن نے انسان کو تمام دیوتاؤں کا مسجود بتایا ہے، فرشتوں کے نام سریانی اور عربی زبانوں میں "ایل" کے ساتھ آتے ہیں جیسے اسرافیل عزرائیل وغیرہ اور سریانی میں ایل کے معنی ہیں دیوتا۔ اللہ نے انسان کو اپنا خلیفہ بنایا اور کائناتِ فطرت کی تمام طاقتوں (فرشتوں) کو حکم دیا کہ اسے سجدہ کرو، سب نے سجدے میں سر رکھ دیے، صرف شر اور فساد کا مظہر ابلیس ایسا تھا جس نے سرکشی کی اور اسے لعنت کا طوق گردن میں ڈال کر راندۂ درگاہ کر دیا گیا۔ تو جس انسان کو فطرت کی ساری طاقتیں سجدۂ تعظیم کر چکی ہوں وہ ان کے سامنے مجبورِ محض کیسے ہو سکتا ہے؟ قرآن نے قوموں کے عروج و زوال کا وہ فلسفہ جس پر ابنِ خلدون، کانٹ، دیکو، ہیگل اور ٹوائن بی وغیرہ نے ہزاروں صفحات سیاہ کیے ہیں، صرف چند لفظوں میں بیان کر دیا ہے، اب جو کچھ بھی اس موضوع پر کہا جائے گا وہ اس فرمانِ الٰہی سے باہر نہیں ہو سکتا کہ جس کا مطلب مولانا حالی نے یوں بیان کیا ہے:

خدا نے بھی کبھی اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

جس نے کسی گرامر کی ابتدائی کتاب بھی پڑھی ہوگی وہ جانتا ہے کہ جزا بغیر شرط نہیں ہوتی اپنے بیٹے سے آپ کہیں کہ اگر تم پاس ہو گئے تو میں انعام دوں گا۔ ظاہر ہے کہ وہ پاس نہ ہوا تو آپ بھی کچھ نہ دیں گے۔ اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ ہم کسی قوم کی حالت اس وقت بدلتے ہیں جب وہ اپنی حالت میں تغیر کی ضرورت کا احساس پیدا کر لیتی ہے، اس کی اور زیادہ تاکیدی شکل یہ ہے کہ یقیناً اللہ کسی قوم کا حال نہیں بدلتا ما بقوم میں یہ رمز ہے کہ خواہ وہ کوئی بھی حالت ہو، جب تک وہ خود اپنے نفسوں میں تبدیلی نہ لا دیں۔ ظاہر ہے کہ پہلی ذمہ داری ہماری ہوئی کہ ہم خوابِ خرگوش سے بیدار ہوں، غفلتوں سے باز آئیں، توہمات سے پیچھا چھڑائیں جوش اور جذبات کو حدِ اعتدال میں رکھیں، عقل و ہوش، فہم و تدبر، رواداری اور مصلحت اندیشی سے کام لیں اپنی غلطیوں کا خود احتساب کریں اور ان کا اعادہ نہ کریں، جو اہلِ فکر و دانش کا مختصر سا طبقہ امت میں موجود ہو اس کو پہچانیں اور اس سے دل کی گرمی اور دماغ کی روشنی حاصل کریں، اس طرح ہم اندرونی اور بیرونی فتنوں کا مقابلہ کر سکیں گے۔

قدیم وجدید کے فاصلے: ہندوستان میں امت مسلمہ کے اجتماعی مرض کی کوئی بھی تشخیص کی جائے، دوا ایک ہی کارگر ہو سکتی ہے اور وہ ہے تعلیم ہمیں اپنے دینی مدارس کی مرکزی تنظیم بھی کرنی چاہیے خواہ وہ کسی مکتب خیال کے ہوں بہر حال اسلام ہی کی تعلیم دے رہے ہیں، اگر ان کی ایک مرکزی ہیئت بھی ہو تو کون سا پہاڑ ٹوٹ پڑے گا؟ اس سے ایک نظم و ضبط اور اجتماعی آواز کا اثر تو پیدا ہوگا، دس باتوں میں وہ متفق نہ ہوں، کسی ایک بات پر تو یک زبان ہوں گے۔ مدارس کے نصاب تعلیم میں بھی انقلابی تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔ ان مدارس سے جو طلبہ فارغ ہو کر نکلیں وہ صرف تبلیغ و امامت کے لیے کیوں وقف رہیں؟ انھیں پولیس میں، انکم ٹیکس میں، کچہری میں، بینکوں میں، ہر جگہ ہونا چاہیے تاکہ وہ اپنی نیک معاشی اور بلند کرداری کا سکہ ہر جگہ بٹھا سکیں۔ علوم میں بھی صرف پرانے موضوعات کیوں ہوں؟ جن کی عملی زندگی میں کوئی افادیت نہیں رہ گئی ہے۔ سائنس، ٹکنالوجی، علم الاقتصاد، علم طبیعیات، کیمیا حیوانیات، سب کچھ مدارس میں بھی پڑھایا جا سکتا ہے اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں پڑھایا جا سکتا ہے۔ قدیم اور جدید میں جو فاصلے پیدا ہو گئے ہیں انھیں بہت تیزی سے کم کرنے کی ضرورت ہے ورنہ امت کا انتشار بڑھتا ہی جائے گا۔

ہمیں یہ اعتراف کرنا چاہیے کہ مسلمان اتنے روادار نہیں رہے جتنا انھیں اسلام دیکھنا چاہتا ہے اور جس کا ایک مخلوط سوسائٹی مطالبہ کرتی ہے۔ ہم اپنی جگہ پر اٹل رہ کر دوسروں سے یہ توقع کرتے ہیں کہ وہ بدل جائیں۔ ہم دوسروں کے نقطۂ نظر کو سننا اور سمجھنا بھی نہیں چاہتے۔ آپس ہی میں نہایت حقیر مسائل کو بنیاد بنا کر لڑتے ہیں۔ جس زمانے میں ہندوستان سماجی اصلاحی تحریکوں سے گونج رہا تھا ہمارے علماء یہ بحث کر رہے تھے کہ کوا کھانا حلال ہے یا حرام، میلاد شریف میں قیام کرنا جائز ہے یا ناجائز، اللہ تعالیٰ جھوٹ بول سکتا ہے یا نہیں بول سکتا۔ غور فرمایئے کہ ان مباحثوں کا حاصل کیا ہوا؟ مگر ان پر سیکڑوں صفحات سیاہ کر دیے گئے اور انھیں بنیادی عقائد سے زیادہ اہمیت دے دی گئی۔

بیسویں صدی کے علوم مروجہ میں مسلمانوں کا حصہ کتنا ہے اس کا اندازہ صرف اس بات سے کر لیجیے کہ اب تک ۵۲ یہودی اسکالرز کو نوبل انعام مل چکا ہے اور مسلمانوں میں صرف ایک کو ملا ہے وہ بھی اس طبقے سے تعلق رکھتا ہے جسے پاکستان میں غیر مسلم قرار دیا جا چکا ہے ہماری طرف دیہات میں ایک کہاوت ہے "رات بھر روئے تو ایک ہی مرا، صبح ہوتے وہ بھی اٹھ کر بھاگ گیا"

علم میں مسلمان کیوں پچھڑ گئے؟ وحی الٰہی کا پہلا لفظ جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا وہ "اقراء" تھا یعنی "پڑھ" اللہ نے اپنی ابدی ہدایت کا نام بھی "قرآن" رکھا اور اسے "کتاب" کہا۔ لکھنا پڑھنا تو مسلمان کی گھٹی میں ہونا چاہیے، مسلمان اور جاہل ہو یہ منشاء الٰہی کے خلاف ہے۔ اس دنیا میں مختصر سی زندگی میں انسان بہت سی نعمتوں سے محروم رہ جاتا ہے، بہت ہی تھوڑی سی نعمتیں اس تک پہنچ پاتی ہیں، مگر اچھی طرح غور کیجیے تو سب سے بڑی محرومی اس کا جاہل رہ جانا ہی ہے۔ قرآن نے علم اور جہالت میں وہی فرق بتایا ہے جو روشنی اور تاریکی میں ہے۔

مسلمانانِ ہند اور تعلیم: مسلمانانِ ہند کو اپنی تعلیمی مہم اس پیمانے پر چلانی ہوگی جسے انگریزی میں "Onwar footing" کہا جاتا ہے یعنی حالتِ جنگ کی تیاری کیا جاتا ہے۔ یہ عرب ممالک جو اپنے مالِ مفت کو دلِ بے رحم کے ساتھ لٹا رہے ہیں اگر اس دولت کو مسلمانانِ عالم کی تعلیمی مہم کے لیے وقف کر دیتے تو تیس سال میں دنیا کا توازن بدل جاتا۔

دین اور دنیا دونوں کی تعلیم کو ساتھ لے کر چلنا ضروری ہے بلکہ دنیا اس خصوص میں مقدم ہے، پہلے کھیت میں کچھ بویا جاتا ہے پھر فصل کاٹی جا سکتی ہے، مسلمانوں نے آخر بویا کیا ہے جو فصل کاٹنے کی امید لیے بیٹھے ہیں۔ جو صرف خواہشیں بوئے گا وہ حسرتیں ہی کاٹے گا۔ مسلمان یہ بھی نہ سمجھیں کہ اپنے مذہب، اپنی تہذیب اور اپنی زبان سے رشتہ ٹوٹنے کے بعد انھیں اس ملک میں آسودگی نصیب ہو جائے گی بلکہ "این ہم رفت و آں ہم رفت" والا معاملہ ہوگا اپنی زبان کو بچایئے، اس کی قوت کو پہچانیے اور اس کے لیے قربانی دیجیے کہ یہی آپ کو زندہ رکھے گی۔ تہذیب یا کلچر بھی ایک ذہنی رویے کا نام ہے جسے عمل میں رچا ہونا ہوتا ہے، کوئی کلچر صرف کتابوں کے اندر زندہ نہیں رہتا، یہ ہمارے رہن سہن اور برتاؤ میں پرورش پاتا ہے۔ تعلیمی تنظیم کی مہم ہو یا کلچر اور زبان کے تحفظ کا مسئلہ ہو، پہلی اور بنیادی شرط اتحادِ ملی ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی آواز آزادی کے بعد اتنی دبائی نہیں گئی جتنی وہ خود دبی ہے۔ آپ اردو کے اخباروں اور رسالوں میں اپنی رائے خود ہی پڑھ کر جھوم لیتے ہیں، قومی سطح تک وہ آواز نہیں پہنچتی، اور ہمارا "نیشنل پریس" صرف کہنے کو نیشنل ہے ورنہ ایک مخصوص طبقے کا ترجمان ہے دوسروں کا نقطۂ نظر سامنے آنے ہی نہیں دیتا، اس کا ایک تجربہ مسلم پرسنل لا کے خلاف مہم میں ہو چکا ہے جب اہل شریعت کو اپنے موقف کی وضاحت کا موقع ہی نہیں دیا گیا۔ اس لیے انگریزی اور ہندی میں ہی نہیں بلکہ ہندوستان کی تمام علاقائی زبانوں میں مسلمانوں کے مسائل کی ترجمانی کرنے والے اخبار اور رسالے ہونے چاہییں۔ اپنے ملی مسائل کے علاوہ ملکی اور بین الاقوامی مسائل میں بھی مسلمانوں کا عمل دخل بڑھنا چاہیے۔ ہندوستان میں چھوٹی بڑی درجنوں سیاسی جماعتیں پیدا ہو گئی ہیں جنھیں آپ کسی دیساری یعنی لیفٹ اور رائٹ کے خانوں میں تقسیم کر سکتے ہیں مگر ان میں کوئی ایک جماعت بھی ایسی نہیں ہے جو مسلمانوں کے نظریۂ حیات و کائنات سے پوری مطابقت رکھتی ہو۔ کمیونسٹ گروپ نے مذہب کی جڑ کاٹ دی ہے اور معاشی طبقات کو معاشرتی تنظیم کی بنیاد بنا رکھا ہے تو اس نے مذہب کے

پردے میں سامراج (Imperiation) کو فروغ دیا ہے اور اسرائیل کا خنجر عربوں کی پیٹھ میں ھونک رکھا ہے۔ اس لیے مسلمانوں کا دونوں سے متفق ہونا مشکل ہے اس لیے انھیں اپنا راستہ عمل اپنے مسائل کی روشنی میں متعین کرنا ہوگا۔

اس صدی میں مذہب اور سیاست کا گٹھ جوڑ جس طرح ہوا ہے یا کیا گیا ہے وہ بھی برطانوی سامراج کی سازش کا ایک ثمر تھا اس نے فرقہ پرست بلکہ فرقہ کش جماعتوں کے لیے میدان ہموار کر دیا۔ آج انتہا پسند گروپ یہی زہر پھیلا رہے ہیں، مذہب کے نام پر عوام کو بہکانا آسان ہے اس لیے سامراج مذہب کا سرپرست بن گیا ہے۔ ہندوستانی مسلمان جس دور سے گزر رہا ہے اس کی بھلائی اسی میں ہے کہ مذہب اور سیاست کا دائرۂ کار متعین کرے، مذہب کی قوت کو اخلاقی اور روحانی اصلاح میں لگایا جائے اور سیاست میں وہ راہ اوسط اختیار کی جاوے جو مسلمانوں کے لیے مفید ہو اور ان کے حقوق کا تحفظ کر سکے۔ مسلمان کا مزاج کچھ ایسا بن گیا ہے کہ وہ بغیر تدبیر و تدبر کے رفتار زمانہ کو اپنی مرضی کے مطابق دیکھنا چاہتا ہے، یہ صدیوں کی بے عملی کا پھل ہے اور برسوں تک شاعرانہ جذبات کی پرورش کرتے رہنے کا نتیجہ ہے کہ اسے اپنے تخیل کی دنیا حقیقی دنیا معلوم ہوتی ہے، خواب، حقیقت اور تخیل تینوں دنیائیں الگ الگ ہیں تخیل کی دنیا کو حقیقت بنانے کے لیے کئی نسلوں کو جہاد کرنا ہوتا ہے اس بات کو ہم فراموش کر چکے ہیں۔

ہندی مسلمانوں کو اپنا مستقبل سنوارنے کے لیے اپنی خیالی دنیا سے نکلنا ہوگا۔ قدیم اور جدید ذہنوں کے درمیان فاصلے کم کرنا ہوں گے، مدارس اور نئی تعلیم کے اداروں میں تال میل پیدا کرنا ہوگا، دینی تعلیم کے ساتھ ہی تکنیکی تعلیم اور صنعت و حرفت کی طرف بھی پوری توجہ کرنا ہوگی۔ اگر ایسی انقلابی تبدیلیاں پیدا نہ کی گئیں تو ساری قوم کا مزاج گوسفندی ہو جائے گا۔

فکر مرحوم

جب وہ زندہ تھے تب بھی، اور آج بھی، جب ان کی انگلیاں حرکت کرنے سے معذور ہو چکی ہیں۔ میں فکر کا تصور کرتا ہوں تو بیک وقت چار باتوں کا خیال آتا ہے:

اردو زبان میں وہ تنہا طنز نگار تھا۔ تنہا کروی ہنسی ہنسنے والا، جو طبقاتی رائٹر تھا۔ "چھٹا دریا" سے لے کر آخری چھلکے تک آخری مضمون "میری بیوی" تک دیکھ لو، وہ نہ چھپا سکتا ہے، نہ چھپانا چاہتا ہے، کہ ایک محنت کش دکھی، دلت اور بار بار کے فریب خوردہ طبقے کی ترجمانی میں طنز کرتا ہے اور اسی کی طرح بے محابا ٹھٹھا مارتا ہے —— طبقاتی طنز اس کے رگ و ریشہ میں پنجاب بسا ہوا ہے۔ لہو میں سرسوں کا تیل، پسینے میں سرسوں کے ساگ اور مکئی کی سوندھی مہک۔ یارباشی کے چٹکلوں میں گرم گرم گڑ کا کاڑھا۔ یَن یو۔پی کے شرفا کی طرح، چپکے سے چٹکی کاٹنے کے بجائے پنجاب کے جوانوں کی طرح گھونسا مار کر اور ننگی گالی دے کر یاری جتانے اور ٹہوکے کی چوٹ چھیڑ خانی کرتے رہنے میں اس نے خود کو دہرایا نہیں۔ اس بے تحاشا بے تکلفی سے، بے تحاشا قسم کے طنز کو مذاق کے ٹاٹ کے پردے میں لپیٹ کر وہی ایک بے فکر برسوں اخباری چھاجڑی میں سجا سکتا تھا جسے ہم وطن پنجابی پڑھنے والوں کی شاباش تازہ دم رکھے اور پنجاب کی آب و ہوا کا بخشا ہوا تن من بھی۔ وہ ہر لحاظ سے ایک پنجابی اردو لیکھک تھا —— لیکھک کیا، لکھاڑی۔ لکھاڑ! اسی طاقت سے وہ تب بھی لکھتا رہا، جب دو تہائی بدن فالج کے شکنجے میں تھا۔

فکر مرحوم لفظوں کے طوطا مینا بنانے اور ان سے سیکھی سکھائی بولی بلوانے والا قلمکار نہ تھا۔ اسے جانوروں کی بولی بولتے عار نہ تھا۔ اسے موٹے موٹے، ناصاف، ادھڑ بول کھیلنے اور چھوٹے سے ہچکچاہٹ نہ ہوتی تھی —— وجہ؟ وجہ یہ کہ اسے اپنی غریبی کے دن، جان جوکھم کے دن رات اور اپنے مخاطبوں کی زندگی کے ادھڑپن کا پورا احساس تھا۔ وہ رائے زنی کرنے والے اشراف اور تبصرہ نگار ظ انصاری کی خاطر نہیں، دسوندھا سنگھ شرخان اور سپاہی فتو کر خندار کو سامنے بٹھا کر، موڈل کے طرح آنکھ کے سامنے جما کر لکھتا تھا۔ وہ اپنے لیے نہیں، ان کے لیے لکھتا تھا —— کون ہے مائی کا لال، جو اس پر انگلی اٹھائے۔ وہ مزاح نگار تو یس یوں ہی سا تھا، دراصل ایک ایسا طنز نگار تھا فکر مرحوم کہ اس کے اشک مسکرانے کی کوشش میں پیاز ہو جاتے تھے۔ جلترنگ اور لہو ترنگ میں یہی انتر ہے عزیزو! الہلہا کے، لہک کر ہنسنا، ہنسانا، تڑپ کر رونا، بلکنا، چیخنا دونوں عمل جتنے قدرتی ہیں اتنے ہی آسان ہیں۔ مگر آنسو کو پیاز کے چھل میں ڈال دیا، لہو کو ہنسی میں آنکھ سے ٹپکا پانی بونہ کو پیازی کر دیتا ہے۔ گلابی نہیں پیازی —— یہ کام اسی دکھی، ستم پرور دہ مسخرے کو آتا تھا۔ اس مسخرے نے دو تین برس پہلے حیدرآباد کی عالمی طنز و مزاح کانفرنس میں جب میں اس کو بازوؤں کا سہارا دیے کھانے کے خوان تک لے گیا تو مجھ سے پوچھا: اب تو بتا دو —— تمہاری تحریر میں دلکشی کا راز کیا ہے۔ ایک بار پڑھ کر سیر نہیں ہوتا۔ میں نے کہا فکر —— مذاق نہ اڑاؤ ہمارا۔ کبھی کسی مکھی نے کیا سکرین سے پوچھا کہ اپنی مٹھاس کا راز بتاؤ۔ فکر بڑے دل گردے کا آدمی تھا

(ظ۔ انصاری)

کرشن چندر کی کہانی

رتن سنگھ

ایم ۲- بولی بچر کالونی گواری گھاٹ روڈ۔ جبل پور ۴۸۲۰۰۸

کرشن چندر کی بات شروع کرنے سے پہلے ایک دلچسپ کہانی سن لیجئے۔ عشق و محبت کی انوکھی داستان ہے یہ۔

ایک لڑکی کی جب شادی ہونے لگی تو اس نے اپنے پریمی سے کہا "ہمارے ملنے کی اب ایک ہی صورت رہ گئی ہے کہ تم سادھو بن کر میری سسرال میں ڈیرا ڈال لو"۔ پریمی نے ایسے ہی کیا اور اس طرح وہ پریمی اور پریمیکا برسوں تک ایک دوسرے سے ملتے جلتے رہے۔ کچھ وقت گزر جانے پر لڑکی کے شوہر کو اپنی بیوی پر کچھ شک ہو گیا اور اس طرح اس نے ایک رات اس کا پیچھا کیا اور موقع پا کر سادھو کا قتل کر دیا۔

بات آئی گئی ہو گئی۔ یہ لڑکی ماں بنی۔ پھر دادی اور نانی بھی بن گئی۔

ایک شام کو اس کا شوہر گائے کا دودھ دھو رہا تھا، اور پاس ہی عورت گنڈاسے سے چارہ کاٹ رہی تھی۔

"ذرا پیچھے والے کمرے سے رسی پکڑا دو" مرد نے کہا۔

"خود ہی اٹھ کر لے لو۔ مجھے اس کمرے کے اندھیرے سے ڈر لگتا ہے"۔

"اب کمرے کے اندھیرے سے ڈر لگتا ہے اور تب رات کے اندھیرے سے ڈر نہیں لگتا تھا؟"

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میرے یار کے قاتل تم ہو"۔ یہ کہتے ہوئے بوڑھی عورت نے غصے سے بھر کر اپنے شوہر کی طرف دیکھا اور ہاتھ کے گنڈاسے سے اس کا سر کاٹ کر رکھ دیا۔

یہ سچا واقعہ کسی نے مجھے بھی سنایا تھا۔ میں اس پر کہانی لکھنے کے لیے اپنے ذہن میں تانا بانا بن رہا تھا کہ کرشن چندر کی لکھی ہوئی یہ کہانی چھپ کر آ گئی۔

کہانی پڑھ کر ذہن سے ایک بوجھ سا اتر گیا۔ اور اپنی اوقات بھی پتہ چل گئی۔

کرشن چندر نے اس کہانی کو لکھتے وقت جو پہلو ابھارے تھے، وہ میرے خواب و خیال میں بھی نہیں تھے اس سچے واقعے میں کرشن چندر نے ایسے نقش و نگار بھر دیئے تھے کہ صرف رومانی زندگی کی دلفریب تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی تھی بلکہ عورت کے ذہن اور عمل کو سمجھنے میں بھی بڑی مدد ملتی تھی۔ جھوٹے سماجی بندھنوں سے پیدا ہونے والی پیچیدگیوں کی طرف بھی بڑا خوبصورت اشارہ تھا۔ یہ کہانی میں نے آپ کو اس لیے سنائی کہ یہ کرشن چندر کی ان درجنوں کہانیوں میں سے ایک ہے، جو انھوں نے یوں ہی رواروی میں لکھ دی ہیں۔ یہ کہانیاں محض اس لیے لکھی گئی ہیں کہ کرشن چندر سے کہانی مانگی گئی ہے۔ تار پہ تار آ رہے ہیں۔ اور کرشن چندر بقول سلمیٰ آپا دھلے ہوئے چٹے کپڑے پہن کر کچھ سوچتے ہوئے لکھنے کی میز پر جا بیٹھے ہیں۔

اس طرح کی کہانیاں کرشن چندر نے بھی بہت لکھی ہیں اور منٹو نے بھی۔ جس وقت یہ کہانیاں لکھی جا رہی تھیں اس وقت عام قاری نے انہیں بڑی دلچسپی سے پڑھا۔ ہلکی پھلکی ہونے کی وجہ سے یہ کہانیاں عام قاری کو کرشن چندر یا منٹو کی بہت اچھی کہانیوں کی نسبت زیادہ پسند آئیں۔ ہاں کہانی کے نقادوں نے ان کہانیوں کو پڑھ کر ناک بھوں بھی چڑھائی یا دبی زبان میں کہا کہ یہ کیا لکھا جا رہا ہے۔ مگر اس بات کو وہ بھی مانتے تھے۔ کہ یہ کہانیاں بھی اتنی ہی دلچسپ ہیں جتنی کرشن چندر کی دوسری شہرۂ آفاق کہانیاں۔

کرشن چندر سے پہلی ملاقات میرے ذہن میں ہمیشہ تازہ رہے گی، کیونکہ اس میں میرے چہرے پر رضیہ سجاد ظہیر کا پیار بھی ثبت ہے اور کرشن چندر کی حوصلہ افزائی بھی۔ دہلی کی کسی کلب میں ہوئی تھی میری ان سے پہلی ملاقات۔ جب میں وہاں پہنچا تو کرشن چندر کے علاوہ سجاد ظہیر، رضیہ سجاد ظہیر، ساحر لدھیانوی، علی سردار جعفری اور بہت سے لوگ چھوٹے سے کمرے میں جمع تھے۔ مجھے دیکھتے ہی رضیہ آپا نے مجھے گلے سے لگا کر چوم لیا اور پھر کرشن چندر سے تعارف کراتے ہوئے میرے نام کے ساتھ "نئے کہانی کار" کے لفظ جوڑ دیئے۔

ہاتھ ملاتے ہوئے کرشن چندر نے کہا تھا: "آپا۔ انہیں آپ نیا کہانی کار کہتی ہیں۔ انہیں تو ہم پچھلے پندرہ سالوں سے پڑھتے چلے آ رہے ہیں"۔

کرشن چندر کا یہ جملہ سن کر مجھے بڑی خوشی ہوئی تھی کہ وہ مجھے پڑھتے ہیں یا کم از کم کہانی کار کی حیثیت سے جانتے ہیں۔
اس رسمی تعارف کے بعد میں نے اپنا مجموعہ پیش کیا تو ورق پلٹتے ہوئے کہنے لگے "ارے اس چھوٹے سے مجموعے میں اتنی ساری کہانیاں"
پھر ایک پل کے لیے رکے اور کہا "کہانی کا چھوٹا ہونا بھی ایک خوبی ہے اور اس طرح اختصار سے کام لینا ہر ایک کے بس کی بات بھی نہیں۔ اس سلسلے میں اتنا محتاط ضرور رہنا کہ کہانی اتنی چھوٹی نہ ہو جائے کہ پڑھنے والے کو باقی خود سوچنی پڑے۔
میں نے کرشن چندر سے ان کی کہانی تائی ایسری کا ذکر کیا اور پوچھا کہ کیا یہ بھی کوئی اصلی کردار ہے۔
" اصلی کردار کبھی نہیں ہوتا۔ یا ہوتا بھی ہے تو شاذونادر ہی عام زندگی میں کہانی کار کو جو کردار ملتے ہیں، اگر کوئی من و عن انہیں ویسا ہی پیش کر دے تو اس میں کہانی کار کا کوئی کمال نہیں۔ کمال تو جب ہے کہ زندگی سے ملے اصلی کردار کو کچھ ایسے نین نقش عطا کیے جائیں، اس کے عمل میں کچھ ایسا نیا پن شامل کیا جائے کہ سب کی توجہ اس کی طرف کھنچ جائے، اور پھر پڑھنے والے اس کردار کو حقیقی سمجھ کر ادھر ادھر ڈھونڈنا شروع کر دیں۔
اس میں کوئی شک نہیں کہ تائی ایسری کی کہانی جس نے بھی پڑھی ہے، اُسے تائی ایسری کو ڈھونڈنے کے لیے پنجاب جانے کی ضرورت نہیں۔ ہر ایک بچے کو چاہے وہ بچہ بڑا ہو خود باپ کیوں نہ بن گیا ہو، اس سے ممتا کے جذبے سے پیار کرنے والی تائی ایسری آپ کو ہندوستان کے ہر خاندان، ہر گلی، ہر شہر میں مل جائے گی۔ آپ کے سر پر اپنا پیار انڈیلتی ہوئی، جب وہ آپ کے ماتھے کو پوپلے منہ سے چومتی ہے، یا کانپتے ہوئے جھریوں بھرے ہاتھ سے آپ کی ہتھیلی پر ایک چونی رکھ دیتی ہے۔ تو دولت مند سے دولت مند شخص بھی یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اسے دنیا جہاں کی دولت مل گئی ہے۔ ہر ایک کو اپنا پیار بانٹتی ہوئی تائی ایسری دنیا بھر کی عورتوں کی ممتا کا ایسا نادر نمونہ ہے جسے کرشن چندر سا سلجھا ہوا کہانی کار ہی تخلیق کر سکتا تھا۔
اب کہانیوں کی بات چلی ہے تو میں کرشن چندر کی شہرۂ آفاق کہانیوں مہالکشمی کا پل، کالو بھنگی ــــــ ان داتا، زندگی کے موڑ پر یا اس طرح کی دوسری کہانیوں کا ذکر نہ کر کے کرشن چندر کی اس خوبی کی طرف اشارہ کرنا چاہوں گا۔ جس کی طرف ابھی اتنا دھیان نہیں دیا گیا، جتنا دیا جانا چاہیے تھا۔
میں سمجھتا ہوں کرشن چندر کے ہاں پہلی خوبی ان کے ہاں موضوع کی وسعت ہے۔ ہندوستان کا کون سا ایسا مسئلہ ہوگا، جس پر کرشن چندر نے قلم نہیں اٹھایا۔ سیاست، تعلیم، سائنس، دھرم، تاریخ، جنگ، شہری زندگی، گاؤں کی زندگی اور بھی بہت کچھ ملے گا آپ کو کرشن چندر کے ہاں۔ آپ کو اونچے سے اونچے طبقے کے کردار بھی ملیں گے اور نچلے سے نچلے طبقے کے بھی۔ کہیں کالو بھنگی آہنی زندگی کے تمام اندھیروں میں بھٹکتا دکھائی دے گا تو کہیں کسی باٹلی والا کو یہ ہی پتہ نہیں کہ اتنی ڈھیر سی دولت کا وہ کیا کرے۔ ایک طرف بمبئی کے کسی عالیشان ہوٹل کے پچھواڑے ننھے ننھے بچے بچی کھچی جوٹھن کو ایرانی پلاؤ کا نام دے کر کھا رہے ہیں اور دوسری جگہ شراب کے نشے میں چور زندگی ناچ رہی ہے، متحرک رہی ہے۔
عام طور پر لوگ کرشن چندر کو شاعرانہ ہی نہیں رومانی مزاج کا کہانی کار سمجھتے ہیں۔ کسی اہم شاعر نے یہ کہا بھی تھا کہ "اچھا ہوا کرشن چندر کہانیاں ہی لکھ رہا ہے۔ اگر یہ شاعری شروع کر دیتا تو ہم لوگوں کا نہ جانے کیا حشر ہوتا" لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں کرشن چندر کے پاس ایک دردمند دل تھا۔ جب اس کا دل کسی انسانی حادثے پر خون کے آنسو بہاتا تھا تو اس کے اندر کا کہانی کار کرشن چندر کے ہاتھ میں قلم دے کر کہتا تھا "اس درد بھری داستان میں خون جگر ملا کر لکھ۔ اس داستان کو وقت کے سینے پر بکھیر دے، تاکہ کوئی من چلا اٹھ کر وقت کے دھاروں کو موڑنے کی بات سوچے۔ لکھ اس خوں چکاں کہانی کو لکھ تاکہ کوئی اس کا اثر قبول کر کے روتی ہوئی انسانیت کے آنسو پونچھ دے۔ انہی تاثرات کو ذہن میں رکھ کر کرشن چندر نے زندگی کے اجالوں اور اندھیروں کے درمیان جو فاصلہ ہے اس کو اپنی کہانیوں میں جگہ جگہ نقش کیا ہے۔
اس کی سب سے اچھی مثال " دو فرلانگ لمبی سڑک ہے" جس میں ایک مجبور اپاہج، بیمار، نڈھال عورت ہاتھ میں روپے لیے حلوائی کی دوکان کی طرف گھسٹ رہی ہے تاکہ اپنے لیے زندگی خرید سکے۔ ایسے میں باقی ساری لوکائی ایک تماش بین کی طرح اسے دیکھ رہی ہے، شرطیں لگا رہی ہے کہ یہ وہاں تک پہنچ سکے گی یا راستے میں ہی دم توڑ دے گی۔ اس عورت کی زندگی کا درد دوسروں کے لیے لطف کا سبب بن گیا ہے۔
کوئی یہ نہیں کرتا کہ اسے اٹھا کر حلوائی کی دوکان تک پہنچا دے، تاکہ وہ پیٹ کی آگ کو بجھا سکے۔ روتی بلکتی، بھوکی ننگی، زخمی انسانیت کی یہ پُر اثر تصویر کرشن چندر سا دردمند کہانی کار ہی کھینچ سکتا تھا۔
کرشن چندر کے بارے میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک عوامی کہانی کار تھا۔ اپنے دیش کے عوام اور تمام انسانیت کا درد ان کے سینے میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ اسی لیے کرشن چندر کو تلنگانہ میں جب زندگی نئی کروٹ لیتی ہوئی محسوس ہوئی تو انھوں نے ناول لکھ ڈالا "جب کھیت جاگے" جب چین نے ہندوستان پر حملہ کیا تو کرشن چندر کا ایک جیب کترا کہتا ہے۔

"ارے کیا پوچھتے ہو؟ اپنا دھندہ بہت مندا ہے آج کل۔ جو پاکٹ مار داس میں نیشنل ڈیفنس بانڈ نکلتا ہے" شاموگرہ کٹ نے بڑی ناامیدی سے تین بٹوے کھول کر بھولو ڈبل روٹی والے کے سامنے پھینک دیئے۔ اور بولا "یقین نہ آتے تو خود دیکھ لو"

بہار ریلیف فنڈ کے لیے میں نے خود کرشن چندر کو ساحر، سجاد ظہیر اور سردار جعفری کے ساتھ پنجاب کے شہروں میں بھٹکتے دیکھا ہے۔ خوبصورت شاعرانہ زبان کے بعد کرشن چندر کی سب سے اہم خوبی ہے کہانی کے فن پر عبور اور سماجی سیاسی برائیوں یا خامیوں پر طنز۔ کرشن چندر کی ایک گدھے کی سرگذشت سیاسی ڈھانچے کی تمام خامیوں کو اپنے احاطے میں لیتی ہوئی ایسی طنزیہ داستان ہے کہ شاید ساری مخالف پارٹیاں مجموعی طور پر بھی حکومت پر وہ طنز نہ کرسکی ہوں گی جو اکیلے اس کتاب نے کیا ہے۔

سچائی کو بیان کرنے کے لیے ادیب کے اندر کیسا حوصلہ ہونا چاہیئے، اس کا اندازہ بھی اس کتاب کو پڑھ کر ہوسکتا ہے۔

اسی سلسلے میں ایک اور کہانی سنانے کی اجازت دیجئے۔ یہ بھی اتفاق سے کرشن چندر کی روا روی میں لکھی ہوئی کہانیوں میں سے ایک ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ کہانی کا فن اس میں بھی بلندیوں کو چھوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

ایک صاحب بھوکے مرتے ہوئے بمبئی میں روزی روٹی کی تلاش میں بھٹکتے، سٹہ بازار کی بھیڑ میں پھنس گئے وہاں انہیں بڑے زور کا پیشاب آنے لگا لیکن بازار کی بھیڑ سے نکلنا دشوار ہورہا تھا۔ ایسے میں کوئی سیٹھ اسے غلطی سے دوسرے بڑے سیٹھ کا منیم سمجھ لیتا ہے اور اسے کہتا ہے۔ "بول مال لیا؟"

"ہاں لیا" بے بسی میں اس نے جان چھڑانے کے لیے کہہ دیا۔

وہ ابھی وہیں پھنسا ہوا تھا کہ بیچے ہوئے مال کے بھاؤ اچانک بہت اونچے چلے گئے۔ اور بھی اونچے جانے کی امید تھی۔ اس سیٹھ نے جلدی سے اسے روکا۔ "بول مال دیا؟"

"ہاں دیا" اس نے پھر جان چھڑانے کے لیے کہا۔

سیٹھ نے فوراً منافع کے پانچ لاکھ روپے اسے دے دیئے۔

یہ شخص وہاں سے نکلا تو ٹیکسی سے جاتا ہوا جہاں کھلی جگہ دیکھ کر پیشاب کرنے کے لیے اترتا ہے، وہاں اس پلاٹ کو بیچنے والا ایجنٹ اسے آگے نہیں بڑھنے دے رہا، کہتا ہے سیٹھ یہ پلاٹ خرید لو، بہت بڑھیا سودا ہے۔

وہ آدمی پلاٹ کا ایڈوانس دے کر پیشاب کرتے ہوئے سوچ رہا ہے یہ اس نے زندگی میں سب سے مہنگا پیشاب کیا ہے۔ ابھی وہ پیشاب کر ہی رہا ہوتا ہے کہ پلاٹ کا مالک ایجنٹ سے آکر پوچھتا ہے "ابھی پلاٹ بکا تو نہیں . . . . غرض یہ کہ اس سودے میں بھی اسے اسی وقت پانچ لاکھ اور مل جاتے ہیں۔

یہاں پہنچ کر کرشن چندر اصلی کہانی کو چھوڑ کر کہتے ہیں۔ بچپن میں کشمیر کی پہاڑیوں سے ہم مٹھی میں برف کے گولے بنا کر جب نیچے گھاٹی میں لڑھکاتے تھے تو یہ بہت بڑا تودا بن جاتا تھا۔ اس سیٹھ نے بھی بمبئی کی شاندار مل سے اس صنعت میں ملے دس لاکھ کو جو لڑھکایا تو اب یہ دس کروڑ کا آدمی بن چکا ہے۔

کرشن چندر لکھتے ہیں۔ آج میں نے اس سیٹھ کو دیکھا۔ یہ ایک اسکول میں چیرمین کی حیثیت سے بچوں کو بھاشن دے رہے تھے کہ بچو زندگی میں کامیابی چاہتے ہو تو محنت کرو۔ محنت کے بغیر دنیا میں کچھ نہیں ملتا۔

دیکھا آپ نے اس کہانی میں چھپا ہوا طنز۔ اور پھر کس خوبی سے مٹھی بھر برف کے گولے کو برف کے تودے میں بدل، کہانی کو ایک ہی جست میں کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ کرشن چندر کے فن کی یہی وہ خوبیاں ہیں جو انہیں ہندوستان کا ہی نہیں ایشیا کا اہم کہانی کار بناتی ہیں۔ ایشیا کا ہی کیوں۔ آج دنیا کی اہم ترین چھپن زبانوں میں کرشن چندر کی کہانیوں اور کتابوں کے ترجمے ثابت کرتے ہیں کہ انہیں عالمی سطح پر وہ مقبولیت حاصل ہے جو غالباً ابھی تک ہندوستان کے کسی اور ادیب کے حصے میں نہیں آئی۔ ادب کی دنیا میں یہ مقام حاصل کرنے کے لیے کرشن چندر نے اپنی ذات پر کس قدر کرب جھیلے ہیں اس کا اندازہ ان کی شریک حیات سلمیٰ آپا کے اس تجربے سے ہوسکتا ہے۔

سلمیٰ آپا نے بتایا کہ کرشن چندر کو لکھتے وقت ہمیشہ تخلیے کی ضرورت ہوتی تھی، کسی کو اجازت نہیں تھی کہ لکھتے وقت کوئی ان کے کمرے میں داخل ہو۔ ایسے میں ایک مرتبہ کسی ضروری کام سے ایک دن آپا نے کرشن چندر کی طرف دروازے کی اوٹ سے جھانکا تو وہ کیا دیکھتی ہیں کہ کرشن چندر کا چہرہ بڑا بھیانک لگ رہا تھا۔ انہیں لگا جیسے لکھنے کی میز پر کرشن چندر نہیں کوئی اور ہی شخص بیٹھا ہے سلمیٰ آپا کہتی ہیں کہ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گئیں۔

کرشن چندر نے اس دن اپنی کہانی آدھے گھنٹے کا خدا لکھی تھی اور اس کہانی کا سارا کرب جیسے ان کے چہرے پر امڈ آیا تھا۔

بقول سلمیٰ آپا اور بھی بہت سی کہانیاں ایسی ہیں جن میں کرشن چندر کسی نہ کسی شکل میں کہانیوں میں خود موجود ہیں، جیسے پانچ لوفر، مٹی کے صنم، یادوں کے چنار۔

کہانی کار کی میز سے اٹھتے ہی کرشن چندر پھر سے عام انسان ہو جاتے تھے۔ گھر کے سب افراد یہاں تک کہ نوکروں سے بڑی محبت اور برابری کی سطح پر اتر کر بات چیت کرتے تھے۔

دراصل کرشن چندر کے وجود میں محبت کا ایک دریا ہمیشہ موجزن رہتا تھا۔ زندگی میں جس سے بھی ملے، بانہیں پھیلا کر بڑی گرم جوشی سے ملے۔ محبت کے یہی ریلے کرشن چندر کی کہانیوں میں کچھ اس طرح در آتے تھے کہ قاری کو پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ کب کرشن چندر کے الفاظ کے دھارے میں بہتے بہتے اپنے وجود، اپنی دنیا سے ناتہ توڑ کر کرشن چندر کی کہانی کی عجیب و غریب دنیا میں پہنچ گئے۔ یہاں تک کہ کہانی کے اختتام پر پہنچ کر بھی کرشن چندر کی طلسمی دنیا قاری کو بہت دیر تک اپنے وجود میں جکڑے رکھتی ہے اور قاری دھیرے دھیرے اپنی دنیا میں یوں لوٹتا ہے جیسے خواب کی دنیا سے انسان آہستہ آہستہ بیدار ہوتا ہے۔

سلمیٰ آپا نے بتایا کہ زندگی کے آخری لمحوں میں کرشن چندر محلے کے ایک موچی، اور پان والے کو بہت یاد کر رہے تھے۔ کہنے لگے "سلمیٰ مجھے ایک بار ان کے پاس لے چلو۔"

آخری وقت میں عام طور پر لوگ خدا کو یاد کیا کرتے ہیں لیکن کرشن چندر عالم نزع میں بھی زندگی کے ان حقیقی کرداروں کو پکار رہے تھے، جن کے بارے میں شاید ان کا ذہن کہانی کا تانا بانا بن رہا تھا۔ زندگی کے اسی پیار اور لگاؤ کا کہانیوں میں اظہار کرشن چندر کو کہانی کا خدا بنا دیتا ہے۔

●●

یہ جو رومانی تحریک ہے اور یہ جو حقیقت نگاری کی تحریک ہے اس میں مجھے ایک عجیب سا رشتہ نظر آتا ہے۔ یہ حقیقت نگاری کی تحریک کہیں تو رومانی تحریک کے خلاف ردِ عمل کرتی نظر آتی ہے۔ اور کہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسی کی توسیع ہے۔

اس کی دو مثالیں ہیں۔ مثلاً جو خالص ترقی پسند افسانہ نگار ہے، کرشن چندر ـــ اس کے افسانے کے بارے میں میرا کچھ اس قسم کا تاثر ہے کہ وہ لپٹے اسی رومانی فکشن کی توسیع ہے۔ یعنی ل۔ احمد، نیاز فتح پوری اور مجنوں گورکھپوری جس قسم کا رومانی افسانہ لکھ رہے ہیں، اور جس پر آسکر وائلڈ، ٹیگور قسم کے لوگوں کی چھاپ تھی۔ کرشن چندر کی جو رومانی حقیقت نگاری ہے وہ اس کی توسیع نظر آتی ہے۔ اس کے برخلاف جو دوسرا افسانہ نگار ہے منٹو، تو وہ بالکل شدید ردِ عمل اس قسم کے رجحان کے خلاف ہے تو یہ نیا فکشن جو ۳۶ء کے قریب شروع ہوا، اس میں دونوں لہریں نظر آتی ہیں، بالکل کھری حقیقت نگاری، جس کی منٹو بڑی مثال ہے اور وہ حقیقت نگاری جس میں کہ پچھلی رومانیت کا امتزاج نظر آتا ہے۔ یہ دو رجحانات تو ہیں اور بالعموم اسی سے اس عہد کو پہچانتے ہیں۔ لیکن ہمیں ساتھ ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اسی عہد میں بالکل نئے قسم کے افسانے نے بھی پر پرزے نکالنے شروع کر دیے تھے جس کا مغرب کی بیسویں صدی کے فکشن سے تعلق بنتا ہے یعنی جوائس، جس قسم کی طرز نگارش اور تکنیک کے ساتھ جس کی نمائندگی کرتا ہے اس کی سب سے بڑی مثال تو ہم عسکری صاحب کی لیں گے۔ مثلاً جزیرے کے جو افسانے ہیں۔

(انتظار حسین)

احمد ندیم قاسمی
۴- میکلوڈ روڈ، لاہور- پاکستان

عدم تجربہ

مجھے زندگی سے گریز کا کوئی تجربہ نہیں ہُوا
مجھے ماورا کے جمال سے کوئی کد نہیں
مگر اس زمیں پہ جو آدمی ہیں
میں ان کے چہروں کو، ان کے ذہنوں کو
اپنے دل میں اُتار لُوں تو اُدھر چلوں
میں سمندروں کو سمیٹ لُوں تو اُدھر چلوں
یہ جو ریگزار ہیں، کوہسار ہیں، سبزہ زار ہیں
ان کے حسن کو اپنے گرد لپیٹ لُوں تو اُدھر چلوں
مری کائنات طلوع بھی ہے، غروب بھی
مری سلطنت میں شمال بھی ہے جنوب بھی
یہ مری زمیں کا جو فرش ہے
مرا عرش ہے
میں بلند ہو کے بھی اپنے کرۂ ارض سے ہوں بندھا ہُوا
کہ مرے وجود کی جڑ تو میری زمیں میں ہے
یہ زمیں جو کعبۂ زندگی ہے
جو سجدہ گاہِ فنون ہے
یہ زمین ہی میرا شعور ہے
یہ زمین ہی میرا جنون ہے
مجھے زندگی سے گریز کا کوئی تجربہ ہی نہیں ہُوا!

رفاقتیں

کون کہتا ہے کہ تنہائی مرا مقسوم ہے
میں نے مانا
میری ساری زندگی
ایک ناپیدا کراں صحرا میں گزری ہے
جہاں طوفان در طوفان یوں چلتے ہیں
جیسے شہر میں انسان چلتے ہیں-!
میں نے لیکن بارہا دیکھا کہ ہر طوفان میں میرے ساتھ ساتھ
ریت کے ٹیلے سفر کرتے رہے!

قتیل شفائی

۱۹ر غالب کالونی سمن آباد لاہور۔ پاکستان

گیت

یہ دھرتی کیسی دھرتی ہے
جو ہر بچے ہر بالے سے ماں جیسی محبت کرتی ہے
یہ دھرتی کیسی دھرتی ہے

اس ممتا ماری دھرتی کے ہم پر لاکھوں احسان رہے
یہ ہم پر جان چھڑکتی رہی ہم پھر بھی نافرمان رہے
یہ بھی نہ بتایا اس نے کبھی کیا اس کے دل پہ گذرتی ہے
یہ دھرتی کیسی دھرتی ہے

ہم بھائی بھائی بن کے جئیں سو بار کہا بیچاری نے
پر ہم کو گھیر لیا رنگوں اور نسلوں کی بیماری نے
ہم نادانوں کے لیے پھر بھی جینے کی دعائیں کرتی ہے
یہ دھرتی کیسی دھرتی ہے

تھی آس کہ اس کا ہر بیٹا انصاف کا پرچم کھولے گا
معلوم نہ تھا اس شخص کا سر کٹ جائے گا جو سچ بولے گا
یہ پھر بھی جھوٹے لوگوں میں سچائی کا دم بھرتی ہے
یہ دھرتی کیسی دھرتی ہے

جب اس نے چاہا لہرائے اس کے سینے پر ہریالی
ہم نے خونخوار دھماکوں سے اس کی بنیاد ہلا ڈالی
لیکن یہ اپنی مٹی کے غازے سے اور نکھرتی ہے
یہ دھرتی کیسی دھرتی ہے

دیتا ہے سندیسہ جینے کا ہر دن اس کا ہر رات اس کی
جو موت کے تاجر ہیں ان کے قبضے میں نہیں حیات اس کی
جی اٹھتی ہے صدیوں کے لئے پل بھر کے لئے جب مرتی ہے
یہ دھرتی کیسی دھرتی ہے

★

رباعیات

کچھ لوگ تو مرتے ہیں قضا کے ہاتھوں
کچھ زہرہ جمالوں کی ادا کے ہاتھوں
لیکن مجھے تیرے لیے ڈر ہے یا شیخ
مر جائے گا تو صبر و رضا کے ہاتھوں

اک رند کو ناراض نہ کرائے ساقی
پھر ظلم کا آغاز نہ کرائے ساقی
بولیں گے مرے حق میں ترے جام و سبو
مجھ کو نظر انداز نہ کرائے ساقی

محفوظ پسِ نقاب تو بھی تو نہیں
کانٹے ہیں جو ہم گلاب تو بھی تو نہیں
واعظ تیرے اعمال پہ سب کی ہے نظر
ناواقفِ احتساب تو بھی تو نہیں

تو صاحب اعجاز نہیں ہو سکتا
تجھ پہ تو ہمیں ناز نہیں ہو سکتا
کرتا رہے کائیں کائیں کوا کتنا
کوئل کا ہم آواز نہیں ہو سکتا

ڈاکٹر شہریار
سی-۲۰، میڈیکل کیمپس اے۔ ایم۔ یو علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲

آج کے بعد

آج کے بعد
دیوارِ جاں کی طرف
مجھ کو جاتے ہوتے دیکھنا
(ایسا ہوگا نہیں
پھر بھی گر ایسا ہو)
روک لینا مجھے
میرے ماتھے پہ گردِ ندامت کی تحریر کو
خود بھی پڑھنا مجھے بھی سنانا ذرا
اس ندامت میں حصہ تمہارا بھی ہے

وہ گھڑی کس قیامت کی تھی
مجھ کو تم کو
بہت دیر تک
تجربے لوگ اپنے بتاتے رہے
خواب کی اصلیت اور حقیقت کی سچائی میں
فرق کرنے کی تلقین کرتے رہے
ہم نے سب کچھ سنا
میں نے تم سے یہ پوچھا کہ کیا رائے ہے
تم نے آگے کی جانب اشارہ کیا
ایک ساعت سے آگے کی ساعت تلک
لمبا وقفہ تھا
جب وقت میزان سے
اس کو ناپا گیا
رات تھی، کتنی تاریک اور بیکراں رات تھی
میں نے آواز دی، تم بھی بولے نہیں

آج کے بعد
دیوارِ جاں کی طرف
مجھ کو جاتے ہوتے دیکھنا
(ایسا ہوگا نہیں
پھر بھی گر ایسا ہو)
روک لینا مجھے

امجد اسلام امجد
۲۲۔ ممتاز اسٹریٹ، گڑھی شاہو، لاہور پاکستان

لوگ محبّت کرنے والے

چپکے چپکے جل جاتے ہیں لوگ محبت کرنے والے
پروانوں سنگ نکل جاتے ہیں لوگ محبت کرنے والے
آنکھوں آنکھوں چل پڑتے ہیں تاروں کی قندیل لیے
چاند کے ساتھ ہی ڈھل جاتے ہیں لوگ محبت کرنے والے

دل میں پھول کھلا دیتے ہیں لوگ محبت کرنے والے
آگ میں راگ جگا دیتے ہیں لوگ محبت کرنے والے
پانی بیچ بتاشہ صورت گھل جاتے ہیں آپ
سم کو شہد بنا دیتے ہیں لوگ محبت کرنے والے

خواب خوشی کے بو جاتے ہیں لوگ محبت کرنے والے
زخم دلوں کے دھو جاتے ہیں لوگ محبت کرنے والے
تتلی تتلی لہراتے ہیں پھولوں کی امید لئے
اک دن خوشبو ہو جاتے ہیں لوگ محبت کرنے والے

بن جاتے ہیں نقش وفا کا لوگ محبت کرنے والے
جھونکا ہیں بے چین ہوا کا لوگ محبت کرنے والے
جلی ہوئی دھرتی کو جیسے بادل سبز کرے
بستی پر ہیں فضل خدا کا، لوگ محبت کرنے والے

ابھی تو

ابھی تو رُت بدلنی تھی ابھی تو پھول کھلنے تھے
ابھی تو چاک سلنے تھے ابھی تو زخم بھرنے تھے
ابھی تو سرزمینِ جاں پہ اک بادل کو گھرنا تھا
ابھی تو وصل کی بارش میں ننگے پاؤں پھرنا تھا
ابھی تو کشتِ غم میں اک خوشی کا خواب بونا تھا
ابھی تو سینکڑوں سوچی ہوئی باتوں کا ہونا تھا
ابھی تو ساحلوں پر اک ہوا تے شاد چلنی تھی
ابھی جو چل رہی ہے یہ تو کچھ دن بعد چلنی تھی

افتخار عارف

URDU MARKAZ, 16 SACKVILLE STREET,
PICCADILLY, LONDON W1X 1DA

ایک رات کی کہانی

★

قصۂ شبِ دو ماہ تاب
زندگی سا اک عجیب خواب
اک طرف حجابِ رنگ و نور
اک طرف جمالِ بے حجاب

آنکھ جب کھلی تو صبح دم
حجرۂ ہوس کے فرش پر
اک دیا بجھا ہوا ملا
اک نظر جھکی ہوئی ملی
ایک دل دکھا ہوا ملا

رفعت سروش

ڈی-۲/اے، ڈی ڈی اے فلیٹ، منیرکا نئی دہلی ۶۷-۱۱۰۰

اپنے نام

یہ کیا—! ہر شعر میں غم، تشنگی، احساسِ محرومی
تذبذب، بے بسی، بے اعتباری، کربِ تنہائی
یہ کیا—! ہر لفظ پژمردہ، ہر اک فقرے میں مایوسی
اُداسی، یاس، حرماں، ناامیدی، ناشکیبائی

غموں کے یہ بھنور حلقہ بہ حلقہ ایک دن تم کو
جکڑ لیں گے، تمہاری فکر کو محصور کر دیں گے
تمہارے ذہن کو مفلوج کر دیگی یہ غم کوشی
تخیل کو یہ طوفانِ الم معذور کر دیں گے

یہ طرزِ خود کشی ہے، اِس طرح جینا نہیں ممکن
تقاضا زندگی کا ہے، یہ اندازِ سخن بدلو
زمامِ فکر اپنے ہاتھ میں لو، وقت کو موڑو
جسے ماتم کدہ کہتے ہو تم وہ انجمن بدلو

یہ دُنیا ہے، یہاں تو سانس لینا آفتِ جاں ہے
مگر جب غم کی یورش ہو تو جینا کارِ مرداں ہے

★

چراغِ منزل

جسم کی حد سے پرے، رُوح کے سناٹے میں
میری آواز سرِ شام سنائی دیگی
جب کبھی تم آئینۂ شوق پہ ڈالو گی نظر
میری صورت ہی بہ ہر رنگ دکھائی دیگی

بار بار اُبھرا ہوں، ڈوبا ہوں اُفق پر دل کے
میں وہ سورج ہوں مفر جس سے نہیں ہے ممکن
میرے حلقے میں ہیں صدیوں سے تمہارے دن رات
تم سے پوشیدہ مگر اب بھی ہے میرا باطن

تم رہِ شوق میں سرگرمِ سفر ہر لمحہ
ہم سفر ملتے ہیں اور مل کے بچھڑ جاتے ہیں
اور جب ڈستی ہے تنہائی تمہیں رہ رہ کر
میرے سائے در و دیوار پہ لہراتے ہیں

میں ہی طوفان ہوں اور میں ہی تمہارا ساحل
ہم سفر کوئی بھی ہو، میں ہوں چراغِ منزل

کشور ناہید

۴۲۔حبیب اللہ روڈ، لاہور، پاکستان

بند دروازے سے جھانکتی چیخ

کبھی کبھی سمندر جھاگ بھی اچھا لگتا ہے
لہروں کے بکھرنے کا عنوان
زندگی کے تموج کا اعلان
اور احساس کا ہیجان
جب میں اپنے گزرے ہوئے سالوں کو
قطرہ قطرہ اپنے تکیے میں جذب کرلیتی ہوں
تو کوئی نہیں بتا سکتا کہ میں نے کیا خرچ کیا ہے
اس وقت سمندر کی خشمگیں لہریں
میری کم ہمتی پہ سوچتی ہیں

اندھیری گلی میں رونے والی بلی کی طرح
گھروں میں بلکتی عورتوں کی سی زندگی
مجھے پسند نہ تھی
مجھے یہ بھی پسند نہ تھا
کہ اندر سے تو میں زرد ہو جاؤں
اور باہر سے نکھری نظر آؤں
میں نے اندر کی عورت سے منہ موڑ کر
اکیلے سفر کرنے کا فیصلہ کیا
اپنے کمرے میں بے شمار پھول آراستہ کئے
ملک ملک کے ریکارڈز، کٹ گلاس اور واس
ملک ملک کے لوگوں کی طرح
میرے گھر میں آراستہ ہوتے
سا گھر چیزوں اور آوازوں سے بھر گیا

صبح کی روشنی میں دیکھا
تو زرد عورت پھر موجود تھی
سارے کمرے میں گلاب اور کارنیشن
پتی پتی بکھرے ہوئے تھے
اور میری انگلیاں خزاں زدہ شاخوں کی طرح
بھوسلی بھوسلی تھیں

اس وقت مجھے پھر سمندر کی خشمگیں لہریں
یاد آگئیں
میں نے زرد عورت کو
موم بتی کے پگھلے موم کی طرح
نوچ کر باہر پھینکنے کی کوشش کی
تیز گرم پگھلے موم سے میری پوریں جل گئیں
زرد عورت نے جلی انگلیوں پہ
مکڑی کا جالا رکھ دیا
میرے وجود کے عجائب گھر میں
اب نہ بت ہیں نہ پرانی تصویریں
پرانے زنگ آلود فوارے
کبھی کبھی نکلتے پانی کی طرح
میری آنکھوں سے بہتے پانی کو
سمندر جھاگ یاد آجاتا ہے۔

ڈومیسائل

ہم جنگلوں سے چلے آئے
کہ ہم وحشی جانوروں سے
اپنی جان، اپنی نسلیں
اور اپنا وجود بچانا چاہتے تھے
ہم نے دیہات آباد کئے
کھیتوں کو سجایا اور فطرت سے رشتہ باندھا
کہ ہم آزاد انسان کی طرح
اپنے وجود پہ اعتبار چاہتے تھے
ہم اپنی دولت کی کمائی، دیہات کی کمائی
دیہات تک نہ لانے والے سانپوں کو
پہچاننے کے لئے شہر کے بلوں میں گھس گئے
پٹرول، دھواں اور بسوں کا انتظار
ہماری ہجرت اور ہماری محنت کا اجر تھے
ہمارے خوابوں کے کچے گھروندوں کے سامنے
خوشامد اور مذہب کے سکائی سکریپرز
خود رو گھاس کی طرح پھیلتے گئے
ہم نے اپنی خواہش کے سوکھے ہونٹوں کو
امید کے چند قطروں سے گیلا کیا
اور سر اٹھا کر شہر میں رہنے والوں کو دیکھا
ان کے بدن پہ ہاتھوں کی جگہ بندوقیں
اور آنکھوں کی جگہ گولیاں تھیں
بارود جو قوموں کی تقدیریں
سرحدوں بدلتا تھا
وہ بارود گرد کی طرح اڑاتے شہر والے
مجھ سے پوچھ رہے ہیں
تمہارا اس زمین سے کیا رشتہ ہے
بارود جو قوموں کی تقدیریں
سرحدوں پہ بدلتا تھا
اسے میری دہلیز پہ لانے والوں
کو میں کیسے بتاؤں
میرا اس زمین سے کیا رشتہ ہے

رشتہ دار

ڈاکٹر انور سدید

۱۷۲ ستلج بلاک، اقبال ٹاؤن۔ لاہور۔ ۱۸ (پاکستان)

سچی بات تو یہ ہے کہ اپنے رشتہ داروں کے بارے میں کچھ کہتے ہوئے میں نے ہمیشہ احتیاط سے کام لیا ہے۔ وجہ یہ کہ رشتہ دار ایسی مخلوق ہے جس کے ساتھ خوشگوار تعلقات قائم رکھے بغیر آپ دنیا میں آسودگی کا سانس نہیں لے سکتے اور سانس کا رشتہ چونکہ زندگی کے ساتھ ہے اس لیے رشتہ دار بھی کسی نہ کسی انداز میں آپ کے جسم میں زندگی کی لہریں دوڑاتے رہتے ہیں، یہ لہر کبھی اتنی گرم ہوجاتی ہے کہ آپ کی رگیں خون کا دباؤ برداشت نہیں کرسکتیں اور کبھی اتنی خشک ہوجاتی ہیں کہ آپ رشتہ دار کو بے اختیار دل میں جگہ دے دیتے ہیں، اسے شبنم کی پھوار کی طرح قبول کرلیتے ہیں۔ چنانچہ جب میں کسی ناہنجار شخص کو اپنے رشتہ دار کی مذمت کرتے ہوئے دیکھتا ہوں تو اس کے پاس بیٹھنا بھی پسند نہیں کرتا اور اٹھ کر چلا آتا ہوں۔ بھلا جو شخص رشتہ داروں میں خیر سگالی کی فضا پیدا نہیں کرسکتا وہ امنِ عالم میں اپنا کردار کس طرح مثبت انداز میں انجام دے سکتا ہے۔ اس مفید اقدام کا نتیجہ یہ ہے کہ میری زندگی سکھ چین اور امن و سکون سے بسر ہو رہی ہے۔ اپنے مجھ سے خوش ہیں اور بیگانوں کی پروا کرنے کی مجھے کبھی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ بھلا وہ مخلوق جو بیک وقت خشک بھی ہے اور تر بھی، گرم بھی ہے اور سرد بھی، اس کے خلاف میں کوئی بات کیوں سنوں؟

سجاد حیدر یلدرم نے بڑے عاجزانہ لہجے میں اہلِ جہاں سے درخواست کی تھی کہ "مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ" اس درخواست سے یہ تو عیاں ہے کہ یلدرم صاحب اپنے دوستوں سے اکتائے ہوئے تھے۔ چنانچہ ان کے اس قول میں دوستوں کے خلاف زہرخند کی شدید کیفیت موجود ہے۔ لیکن دیکھیے اس میں رشتہ داروں کے خلاف شکایات کا عنصر موجود نہیں۔ لیکن حقیقت اب اس کے بالکل برعکس ہوگئی ہے، خدا جانے زمانے نے اپنی کیچلی تبدیل کرلی ہے یا قدروں نے اپنی داخلی کیفیت تبدیل کرلی ہے۔ لوگوں کی آنکھوں کا رنگ تبدیل ہوگیا ہے یا خون میں فرق آگیا ہے کہ ہر شخص دوستوں کے لیے تو دیدہ و دل فرشِ راہ کرتا ہے لیکن رشتہ داروں کو ایک لمحے کے لیے قبول کرنا بھی گوارا نہیں کرتا اور اکثر اوقات تو رشتہ دار کو دور سے ہی دیکھ کر پکار اٹھتا ہے کہ

"مجھے میرے رشتہ داروں سے بچاؤ"

میرے ایک دانشور دوست اپنے رشتہ داروں سے اتنے بیزار ہوچکے ہیں کہ انھوں نے اس مقولے کی غیر معمولی تشہیر شروع کردی ہے:

"دوست احباب زمین سے اگتے ہیں، لیکن رشتہ دار آسمان سے نازل ہوتے ہیں۔"

مطلب یہ کہ رشتہ دار بلائے ناگہانی کی حیثیت رکھتے ہیں جن سے نجات حاصل کرنا ممکن نہیں۔ میں ایسے لوگوں کو جو رشتہ داروں کے خاندانی حقوق پر شب خون مارتے ہیں بالکل پسند نہیں کرتا۔ وجہ یہ کہ رشتہ داروں کے خلاف اس قسم کا غیر پسندیدہ اور زہریلا پروپیگنڈہ ہماری خاندانی وحدت اور ایک مضبوط سماجی ادارے کو تباہ کرنے کے درپے ہے اور اس منفی پروپیگنڈے سے بچنے کے لیے قومی سطح پر کوئی اقدام کرنے کی ضرورت نظر انداز نہیں کی جاسکتی۔

رشتہ دار تو ایک عاجز، امن پسند اور دوسروں کے دکھ سکھ میں شریک ہونے والی مسکین طبع اور گربہ مزاج مخلوق ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی ایسی نعمت ہے جو ہوا اور پانی کی طرح ہر کسی کو بن مانگے نصیب ہوتی ہے اور ہمیشہ ساتھ رہتی ہے۔ اس کے انتخاب پر آپ کو قدرت حاصل نہیں، رشتہ داروں کی قرعہ اندازی تو آسمان پر ہوتی ہے اور اس کے لیے کمپیوٹر استعمال کرنے کی ضرورت کبھی نہیں پڑتی۔ جس رشتہ دار کا قرعہ آپ کے نام نکل آئے اسے طمانیت اور سکونِ قلب سے قبول کرنا ضروری ہے۔ لہٰذا آپ کا فرض ہے کہ اس عطیۂ خداوندی پر خدا کا شکر بجا لائیں اور رشتہ داروں کی مذمت کرنے کے بجائے ان کی تعریف و تحسین کریں۔ اپنی صحت کو برقرار رکھنے کا اس سے بہتر نسخہ تاحال دریافت نہیں ہوا۔

شیخ سعدیؒ نے لکھا ہے کہ "دوست وہ ہے جو مصیبت میں کام آئے"۔ کتنے افسوس کا مقام ہے کہ شیخ سعدیؒ جیسے مردِ دانا

نے بھی رشتہ داروں کی شان میں ایک لفظ تک نہیں کہا۔ چنانچہ یہ فریضہ شیخ سعدی کے ایک قریبی رشتہ دار شیخ چلی کو سرانجام دینا پڑا۔

شیخ چلی کی شخصیت کے اس زاویے کو ان کے دشمن بھی سراہتے ہیں کہ وہ عام لوگوں کی طرح سنی سنائی باتوں پر کبھی یقین نہیں کرتا تھا۔ شیخ سعدی تو عمر بھر سنی سنائی باتوں پر اعتبار کرتے رہے، ان سے مقولے بناتے رہے لیکن شیخ چلی نے ہمیشہ اپنے تجربے کو نتیجے کی اساس بنایا اور دنیا کو فلاح کی راہ دکھائی۔

مشہور ہے کہ ایک دن شیخ چلی لکڑی کاٹنے کے لیے جنگل میں گیا۔ ایک تیز دھار آری لے کر درخت پر چڑھا اور اس شاخ کو کاٹنے لگا جس پر وہ خود بیٹھا تھا۔ ایک رشتہ دار کا ادھر سے گذر ہوا تو اس نے ہمدردی اور احتیاط کے پیش نظر عرض کیا:

"شیخ صاحب! شاخ پر آری نہ چلایئے، آپ نیچے گر پڑیں گے۔"

شیخ چلی بزرگ سال خوردہ تھے۔ رشتہ دار کا مشورہ بھلا کیوں قبول کرتے۔ سنا ان سنا کر دیا۔ آری کی رفتار تیز کر دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آری اور لکڑی کے ساتھ شیخ چلی بھی زمین پر دھماک سے آن گرے۔ شیخ چلی کو ضرب شدید لگی۔ خوش قسمتی سے اطراف و جوانب میں کوئی ایسا شخص موجود نہیں تھا جو انھیں بے وقوفی کا طعنہ دیتا۔ جلدی سے اٹھے، آری کو وہیں چھوڑا اور رشتہ دار کے پیچھے بھاگنے لگے۔ رشتہ دار ذرا تیز رفتار تھا۔ اس لیے بھاگ کر جان بچانے میں کامیاب ہو گیا۔ لیکن شیخ چلی کے شعور اور لاشعور دونوں میں کہرام بپا کر گیا۔ وہ دن اور آج کا دن شیخ چلی نے رشتہ داروں کی مذمت کو اپنا شعار بنا لیا ہے اور اب جہاں جاتے ہیں یہ شوشہ چھوڑ دیتے ہیں کہ:

"رشتہ دار وہ ہے جو آپ کے لیے مصیبت پیدا کرے۔"

شیخ چلی صاحب کے درخت سے گرنے کا واقعہ بہت اہم ہے۔ وہ اگر چاہتے تو اس سے زمین کی کشش کا نظریہ بھی اخذ کر سکتے تھے لیکن انھوں نے یہ غیر مفید کام نیوٹن کے لیے چھوڑ دیا۔

اس حقیقت سے تا حال کسی مورخ نے پردہ نہیں اٹھایا کہ نیوٹن دنیا کی محفلوں سے اکتا کر جنگل کی طرف کیوں نکل گیا تھا۔ اور اگر نکل ہی گیا تھا تو سیب کے درخت کے نیچے ہی کیوں بیٹھا تھا جس کی نہ چھاؤں گھنی ہوتی ہے اور نہ غریب الوطنی یاد آتی ہے۔ حقیقت یہ ہے نیوٹن سائنسداں کم اور شیخ چلی زیادہ تھا۔ اس نے جب اپنے بزرگ کا متذکرہ واقعہ سنا تو رشتہ داروں کے بارے میں ان کے نظریے کی جانچ پڑتال کے لیے جنگل کی طرف نکل گیا۔ وہاں اس تھکے ماندے مسافر کو نیند آ گئی اور وہ سیب کے درخت کی چھدری چھاؤں میں سو گیا۔ پھر وہ واقعہ ظہور میں آ گیا جس سے سائنس کی پوری دنیا منقلب ہو گئی۔ اگر شیخ چلی کی طرح آپ بھی رشتہ داروں کے آفت رسیدہ ہیں تو مصیبت پیدا کرنے والی بات آپ کو اچھی لگے گی۔ میں آپ کو اپنی رائے تبدیل کرنے کا مشورہ نہیں دیتا لیکن یہ عرض کرنے کی جسارت کروں گا کہ دوست اور رشتہ دار میں وہی فرق ہے جو شیخ سعدی اور شیخ چلی میں ہے۔ شیخ سعدی حقیقت کے غبارے کو کچھ اس انداز میں پچکاتا ہے کہ اس سے تجربے کا جوہر ٹپک پڑتا ہے اور آپ شیخ سعدی کی بات ماننے اور اس کے تجربے سے استفادے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ شیخ چلی غبارے کو پچکاتا نہیں بلکہ پہلے اس میں مزید ہوا بھرتا ہے اور پھر اچانک سوئی کی نوک غبارے میں چبھو دیتا ہے۔ غبارہ پرزور آواز پیدا کر کے پھٹ جاتا ہے اور آپ کھلکھلا کر ہنسنے لگتے ہیں۔ شیخ سعدی کے قول بلیغ میں انقباض ہے۔ شیخ چلی آپ کے عمل میں بسط کی کیفیت ہے۔ شیخ سعدی آپ کو درخت پر چڑھنے میں روکتا ہے۔ آپ کو خطرات سے منطقی انداز میں آگاہ کرتا ہے۔ شیخ چلی آپ کے وہی عمل کو متحرک کرتا ہے۔ شیخ سعدی آپ کا دوست ہے اور خطرے کی جھنڈی دکھا کر رخصت ہو جاتا ہے۔ شیخ چلی آپ کا رشتہ دار ہے۔ آپ درخت سے گر جائیں تو ہسپتال تک آپ کے ساتھ جاتا ہے۔ اور جب تک آپ بیساکھی کا سہارا لے کر واپس گھر نہ آ جائیں یہ آپ کی تیمارداری سے روگردانی اختیار نہیں کرتا حتیٰ کہ آپ اسے اپنا دوست سمجھنے لگتے ہیں اور اپنے سب سربستہ راز اس پر منکشف کر دیتے ہیں۔ جو لوگ رشتہ کو دوست کی سطح پر نہیں لا سکتے، رشتہ دار واقعی ان کے لیے مصیبت ثابت ہوتا ہے۔ لہٰذا میری گذارش ہے کہ اس مصیبت سے بچنے کے لیے آج ہی رشتہ داروں کو دوستوں کی سطح پر لانے کی جد و جہد جاری کر دیجیے اور پھر دیکھیے کہ وہ آپ کی مصیبت میں کام آتے ہیں یا آپ خود انھیں کسی نئی مصیبت میں مبتلا کر دیتے ہیں۔

رشتہ داروں اور دوستوں کے درمیان خالق کائنات نے ایک مخلوق بھی پیدا کر رکھی ہے جس میں ان دونوں جنسوں کے اوصاف پائے جاتے ہیں، اس مخلوق کو عرف عام میں پڑوسی کہا جاتا ہے۔ پڑوسی نہ آسمان سے نازل ہوتا ہے اور نہ زمین سے اگتا ہے بلکہ یہ ایک ایسا تحفہ ہے جو معاشرہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہے۔ آپ اس سدا بہار تحفے کی خوشبو زندگی بھر سونگھتے ہیں ———— اور خوشبو اگر آپ کی پسند کے مطابق نہ ہو تو اس سے نجات یا فرار حاصل نہیں کر سکتے۔ رشتہ دار اطلاع دیے بغیر آتے ہیں، دوست تشریف لائیں تو دروازے پر دستک دیتے ہیں لیکن پڑوسی ایسی مخلوق ہے جو بظاہر اپنے گھر کی چار دیواری میں محصور رہتی ہے لیکن درحقیقت یہ ہمہ وقت آپ کی خلوت میں انجمن آرائی کرتی ہے۔ بیشک آپ نے اپنے اور پڑوسی کے گھر کے درمیان ایک اونچی دیوار کھڑی کر رکھی ہے اور اس دیوار میں کوئی روزن بھی نہیں چھوڑا۔ آپ کی آنکھیں دیوار کے آر پار دیکھ نہیں سکتیں لیکن یہ دیوار تو سینما کے پردۂ سیمیں کی طرح ہے جس پر شب و روز آپ کے سامنے تماشا ہوتا

ہے اور آپ کے جذبات و احساسات میں جزر و مد پیدا کرتا رہتا ہے۔ چنانچہ پڑوسی کبھی تو دوستوں کی طرح ہمدردانہ مشورے دینے لگتا ہے اور کبھی رشتہ دار کی طرح نکتہ چیں بن جاتا۔ پڑوسی ناراض ہو تو دیوار کے درمیان ـــ دیوارِ چین بن جاتی ہے۔ خوش ہو تو پاسپورٹ اور ویزا کی پابندی بھی اٹھالی جاتی ہے اور دونوں اطراف کی مخلوق دیوار سے سر ابھار کر باہمی مذاکرات کرلیتی ہے۔ خیالات کو پرندوں کی طرح آزادانہ پرواز کی اجازت مل جاتی ہے۔ چنانچہ رشتہ دار اور دوست تو فاصلے پر رہتے ہیں لیکن پڑوسی ہمہ وقت آپ کے قرینۂ دل میں قیام کرتا ہے۔ اکثر اوقات تو رشتہ داروں کو غیر مناسب اور دوستوں کو مناسب اطلاعات بھی پڑوسی فراہم کرتے ہیں، یوں کبھی آپ کا امنِ خانہ خطرے میں پڑ جاتا ہے اور کبھی ہر طرف صلح و آشتی کے پھریرے لہرانے لگتے ہیں۔ آپ کو یہ صورتِ حال پریشان کن نظر آئے تو چنداں فکرمند نہ ہوں۔ کیونکہ خود آپ نے ساتھ والے گھر کی خلوت پر شب خون مار رکھا ہے۔ الف صاحب اگر آپ کے پڑوسی ہیں تو یاد رکھیے کہ خود آپ کو الف صاحب کا پڑوسی ہونے کا شرف حاصل ہے اور انھوں نے ایک اچھے شہری کی حیثیت میں آپ کو برداشت کرنے کی خو اس روز ہی پیدا کرلی تھی جب آپ نے اپنے مکان کی بنیاد میں پہلی اینٹ رکھی تھی۔ آپ بھی آج ہی اپنے پڑوسی کو نعمتِ عظمیٰ کی طرح قبول کرلیں۔

اس سب کے باوجود صداقت یہ ہے کہ پڑوسی پڑوسی ہے اور دوست دوست ـــ اور ان دونوں میں سے کوئی بھی رشتہ دار کی جگہ نہیں لے سکتا۔ رشتہ دار کی اپنی منفرد حیثیت ہے مستقل مقام ہے۔

مجھے رشتہ داروں اور دوستوں سے مل کر خوشی ہوتی ہے لیکن جو مسرت پڑوسی فراہم کرتے ہیں اس کی نوعیت جداگانہ ہے ـــ مثلاً میں دائیں جانب کے پڑوسی کا یہ احسان کبھی نظر انداز نہیں کر سکتا کہ جب میں لکھنے کی میز پر بیٹھتا ہوں تو وہ اپنا ٹیپ ریکارڈر آن کر دیتے ہیں اور کوئی شیریں نغمہ ہوا کے دوش پر تیرتا ہوا مجھ تک آنے لگتا ہے۔ میرے یہ پڑوسی میرے خیر خواہ ہیں۔ وہ غیب سے آنے والے مضامین کو خیال میں اترنے کی اور صریرِ خامہ کو نوائے سروش بننے کی اجازت نہیں دیتے۔ سفید کاغذ سیاہ ہونے سے بچ جاتا ہے اور میں فوراً نیند کی وادی میں چلا جاتا ہوں۔ نیند آغوشِ عافیت میں لے لے بائیں جانب کے پڑوسی کی موٹر سائیکل گلی میں یہ صدا لگاتی ہوئی داخل ہو جاتی ہے:

"اٹھو سونے والو کہ میں آ رہی ہوں"

اور مجھ پر بیداری کا سارا فلسفہ اپنا اسرار کھول دیتا ہے۔

کبھی پڑوس میں میاں اور بیوی کا تبادلہ افکار جمہوری روایات پر چل پڑے تو مارشل لا کی زبان بندی نعمت محسوس ہونے لگتی ہے ہے جس خاندانی منصوبہ بندی کو قومی زندگی کے لیے غیر معینہ تصور کرتا ہوں لیکن جب پڑوس میں چند ہی سالوں کے دوران آبادی کے ساتھ غربت میں بھی اضافہ ہوگیا اور کنبہ بڑا اور گھر چھوٹا ہوگیا تو میں نے اپنے خاندان کو محدود رکھنا ہی مناسب سمجھا۔ اتنے اچھے پڑوسی میسر نہ آتے تو یہ سب باتیں مجھے کیونکر معلوم ہوتیں۔

اس سب کے باوجود حقیقت یہ ہے کہ پڑوسی پڑوسی ہے اور دوست دوست ـــ ان دونوں میں سے کوئی بھی رشتہ دار کی جگہ نہیں لے سکتا۔ رشتہ دار کی اپنی منفرد حیثیت اور اپنا مستقل مقام ہے۔ میرا ذاتی تجربہ تو یہ ہے کہ رشتہ دار نہ صرف مصیبت میں کام آتے ہیں بلکہ وہ آپ کو کسی ناگہانی مصیبت میں الجھ جانے سے بچاتے بھی ہیں۔ مثال کے طور پر اگر آپ کو کسی فوری ضرورت کے لیے قرض لینا ہو تو رشتہ دار بڑے سلیقے سے انکار کر دیتے ہیں۔ آپ کو ان کا انکار برا بھی لگے گا لیکن اس حقیقت کو نظر انداز نہ کیجیے کہ رشتہ دار نے آپ کو قرض کی لعنت سے بچانے میں مثبت کردار ادا کیا ہے۔ دوسری طرف اگر خود انھیں قرض لینا ہو تو وہ آپ کو انکار کا موقع ہی نہیں دیں گے اور نیکی کے اس کام میں آپ کی شرکت آسان بنا دیں گے۔ آپ کے کچھ رشتہ دار اگر اپنے بچوں کی فوج ظفر موج کے ساتھ آپ کے ہاں قدم رنجہ فرماتے ہیں اور آپ کے ڈرائنگ روم کا حلیہ تبدیل کر دیتے ہیں تو آپ کو ان کا شکر گذار ہونا چاہیے۔ کہ انھوں نے آپ کو نہ صرف . . . . مہمان نوازی کا شرف عطا کیا ہے بلکہ یہ موقع بھی فراہم کیا ہے کہ آپ اہلِ محلہ کو اپنے خاندان کی افرادی قوت سے مرعوب کر سکیں۔ دور دراز سے آنے اور دیر تک قیام کرنے والے رشتہ دار بھی نعمتِ غیر مترقبہ ہوتے ہیں، ان کی آمد سے اطراف و جوانب کے لوگوں پر آپ کی دھاک بیٹھ جاتی ہے۔ مجلسی عزت میں ہزار گنا اضافہ ہو جاتا ہے۔ دوست مشکل میں منہ موڑ سکتا ہے۔ مصیبت میں ساتھ چھوڑ سکتا ہے۔ آڑے وقت میں طرح دے سکتا ہے لیکن رشتہ دار تو آپ کے ازل اور ابد کے ساتھی ہیں۔ آپ کے خون میں رچے بسے ہوئے ہیں۔ یہ وہ تاگے نہیں جنھیں آپ اپنی مرضی سے توڑ سکیں۔ لہٰذا آئیے۔ آج ہی عہد کرلیں کہ رشتہ داروں کے لیے آپ کے دل میں جگہ نہ بھی ہو لیکن آپ کے گھر کا دروازہ ان کے لیے ہمیشہ کھلا رہے گا۔ اور وقت بے وقت وہ جب بھی آئیں گے، آپ ان کا استقبال خندہ پیشانی سے کریں گے۔ ●●

بعد مرنے کے

محمد شریف ارپن

بابا فرید شوگر ملز لمیٹڈ۔ اوکاڑہ۔ پاکستان

جوں ہی ہمارے ذہن میں موت کا تصور آتا ہے، آہ و فغاں، نعش، کفن، قبر وغیرہ بھیانک علامتوں کی صورت میں آنکھوں کے سامنے گھوم جاتی ہیں اور دل سہم سا جاتا ہے لیکن یہ ایک ایسا بھیانک تجربہ ہے جس سے کوئی گھر نا آشنا نہیں۔ بعض مرنے والے اپنے پیچھے ماتم گساروں کا ایک گروہ چھوڑ جاتے ہیں۔ کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے مرنے پر نہ کوئی ماتم ہوتا ہے نہ دکھ۔

یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہمارے ہاں ہر بات رسم و رواج کی پابند ہو کر رہ گئی ہے۔ شادی، بیاہ، پیدائش، موت سب ہی خود ساختہ رسموں میں جکڑی ہوئی ہیں۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ آج تعلیمی شرح پہلے سے کئی زیادہ ہو جانے کے باوجود بھی ہم ان رسموں کی قیود میں جکڑے ہوئے ہیں۔

چنانچہ روایت پرستی کی عجیب عجیب مثالیں کسی فرد کے مرنے پر مختلف قبیلوں میں مختلف انداز میں دیکھنے میں آتی ہیں۔ لہذا ایک طرف تو اہل خانہ اس ناگہانی حادثے پر آہ و فغاں سے نڈھال ہوتے ہیں۔ دوسری طرف ان رسوم کا بھی لاشعوری طور پر اہتمام کرنا پڑتا ہے جو ہمیں سماج سے ورثے میں ملتی ہیں۔

اہل محلہ کی ہمدردی ایسے موقعوں پر کھل کر سامنے آتی ہے۔ جن لوگوں کو دن بھر ادھر ادھر بیٹھ کر حقہ پینے یا تاش کھیلنے کے سوا کوئی کام نہیں ہوتا۔ ایسے مواقع پر ان کے لیے ضروری کام نکل آتے ہیں۔ کچھ لوگ جو ذرا رواداری کا دامن تھامے ہوتے ہیں۔ نہایت بے کسی کے ساتھ کسی اہم کام کا عذر کر کے اہل خانہ سے اجازت لیتے ہوئے یہ یقین دلا کر مارتے ہیں کہ وہ نماز جنازہ میں ضرور شریک ہوں گے۔ لیکن انہیں نہ آنا ہوتا ہے نہ آتے ہیں۔ اور یہی حال کم و بیش رشتے داروں کا ہوتا ہے۔

سب سے زیادہ کوفت ہمسایوں کو ہوتی ہے۔ اکثر و بیشتر ہمارے معاشرے میں ہمسایوں کے مابین تعلقات خراب ہی ہوتے ہیں۔ اہل محلہ کو منہ دکھانے کی خاطر ایسے سانحہ پر شرکت بادل نخواستہ بھلانا پڑتی ہے۔ رسم ہے کہ جنازہ اٹھنے تک چولھا نہ جلایا جائے۔ چنانچہ ایسے موقع پر عقبی دروازے سے پکا پکایا کھانا بازار سے منگوا کر شکم سیری کر لی جاتی ہے۔ یہ صورت مشکل ہو تو نہایت احتیاط سے اندر ہی اندر کھانا تیار کر لیا جاتا ہے اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔

نہ جانے جنازہ کب اٹھے! بھلا اتنی دیر کون انتظار کرے!

محلے کی مسجد کے امام صاحب اس روز حجرے میں کم ہی دکھائی دیتے ہیں۔ انھیں تلاش کیا جاتا ہے۔ نہایت بے رخی سے منہ بنا کر گھڑی کی طرف دیکھیں گے اور نماز جنازہ کا وقت دریافت فرمائیں گے۔ پھر بڑی شان بے اعتنائی سے حامی بھر لیں گے۔ ان کا روز کا مشاہدہ ہے کہ لوگ ماسوائے ڈیڑھ دو گز لٹھا کی جا نماز کے کچھ نہیں دیتے۔ کسی نے زیادہ ہی فراخدلی کا مظاہرہ کیا تو ساتھ دو چار روپے بھی تھما دیے۔ بھلا اس مہنگائی کے دور میں اتنی حقیر رقم کے لیے کیوں خود کو آمادہ کیا جائے؟

مرحوم کے لیے کفن کا کپڑا اور دیگر ضروری سامان خریدنا ایک الگ مسئلہ ہے۔ لوگ ایسے موقع پر نرخ پر جھگڑنا نامناسب نہیں سمجھتے اور دکاندار اس مجبوری سے پورا پورا فائدہ اٹھانے پر قادر ہوتے ہیں۔ خصوصاً اس صورت میں جب دکاندار کو کپڑے کے لیے رات کے وقت گھر سے اٹھا کر دکان پر لایا جائے۔

یوں تو غریب اقارب سے ہمیشہ اجتناب برتا جاتا ہے۔ لیکن ایسے موقع پر ان غریب رشتہ داروں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ چنانچہ یہی سادہ لوح لوگ اس دن ہر چھوٹا بڑا کام سرانجام دینے میں پیش پیش ہوتے ہیں۔ ہم مرتبہ یا اونچی حیثیت کے رشتہ دار تو موت پر بھی سوٹ پہن کر ہی آتے ہیں۔

پھر ایک اور جاں گسل مرحلہ درپیش آتا ہے اور وہ ہے غسّال کی تلاش۔ بھلا کسے خیال ہوتا ہے کہ ہمارے محلے کا غسّال کون ہے یا یوں کہہ لیجیے کہ ہم کس غسّال کی حدود میں واقع ہوئے ہیں۔ نتیجتاً تلاش بسیار کے بعد جو حضرت ملتے ہیں ان کے تیور دیدنی ہوتے ہیں۔

پہلے تو وہ یہ فیصلہ سنا دیتے ہیں کہ مرگ ان کے علاقے میں نہیں ہوئی۔ وہ علاقہ فضل کریم کا ہے لہٰذا ان سے رابطہ قائم کیا جائے۔ اس سلسلے میں پولیس والوں کا خیال ذہن میں آتا ہے۔ وہ لوگ کچھ اسی قسم کا عذر تلاش کرتے ہیں۔ جب ان سے کسی حادثہ کی رپورٹ کے لیے کہا جائے۔ خیر! یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ بڑی منت و سماجت سے غسال صاحب کو تیار بھی کر لیا جائے تو وہ یا تو بیماری کا بہانہ کریں گے یا وہ دو تین گھنٹے بعد آنے کا۔ ظاہر ہے یہ سب کچھ منہ مانگی فیس کے ہتھکنڈے ہوتے ہیں۔ آیا انھیں شرعی انداز میں غسل دینا بھی آتا ہے یا نہیں یہ ایک الگ مسئلہ ہے۔ :

ان تمام مراحل سے گزر کر جب مرحوم کو اس کی آخری آرام گاہ کی طرف لے جایا جاتا ہے۔ اس وقت حق ہمسائیگی کا منظر دیکھنے کے بعد مشکل سے ہی یقین آتا ہے کہ یہ سب لوگ مسلمان ہیں؟! پورے محلے میں سے بمشکل آٹھ افراد جنازہ کے ہمراہ دکھائی دیں گے۔ کراچی جیسے شہروں میں تو دیکھا گیا ہے کہ صرف اہل خانہ ہی غسل سے دفن کرنے تک کے امور سرانجام دیتے ہیں۔ یہاں تک بھی نوبت پہنچی ہے کہ جنازے کے لیے صرف تین آدمی موجود ہیں اور چوتھے آدمی کے لیے دو گھنٹے تک کوشش جاری رہی تاکہ جنازہ اٹھایا جاسکے۔ اب تو ویگن سسٹم کے اجراء سے یہ مسئلہ کافی حد تک حل ہو گیا ہے۔

دولت کی ہوس اور کسب معاش میں جنوں کی حد تک مصروفیت نے ہم سے ہمدردی اور ایک دوسرے کے دکھ درد بانٹنے کی حس ہی چھین لی ہے۔ ابھی گذشتہ دنوں اخباروں میں یہ خبر بھی آپ کی نظروں سے گزری ہوگی کہ کیلیفورنیا کی ایک عورت نے جب دیکھا کہ اس کے خاوند کے جنازہ میں ایک فرد بھی شریک نہیں ہو رہا تو اس نے اعلان کروا دیا کہ جنازہ میں شریک ہونے والے ہر فرد کو ۵ ڈالر اور زار و قطار رونے والے کو ۵۰ ڈالر عوضانہ دیا جائے گا۔ اس اعلان کے باوجود بھی بہت کم لوگوں نے اس کے شوہر کے جنازے میں شرکت کی۔ خیر! مغرب کی الگ بات ہے ہمارے مذہب نے ہمیں انسانیت کا دکھ بانٹنے اور بندوں کے حقوق ادا کرنے کی سخت تلقین کی ہے لیکن وائے صنعتی انقلاب کہ تمام قدریں ریت کی دیوار کی مانند گرتی جا رہی ہے۔!!

بات ذرا دور جا نکلی۔ ہاں تو جب مرحوم کو مٹی دے کر لوٹتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ابھی بہت سے مراحل طے پذیر ہیں۔ ایک بوڑھا مرد اور تین چار میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس لڑکے مرحوم کے کسی وارث کا گھیراؤ کر کے کھڑے ہو جائیں گے۔

"صاحب جی! آپ کے حاجی صاحب (مرحوم کی طرف اشارہ) بڑے خوش نصیب تھے جنھیں یہ جگہ مل گئی۔ پچھلے دنوں ایک بہت بڑا سیٹھ والا ادھر آیا تھا پر ہم نے ایک دم انکار کر دیا تھا۔ ہم قسم سے بولتا ہے تمہارا حاجی بڑا خوش نصیب"... وارث جھنجلا کر ان کا معاوضہ جاننا چاہتا ہے۔ "پچاس روپے"

"ایں پچاس روپے؟؟ تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے"؟

وارث نڈھال ہو کر پوچھتا ہے۔ جواب میں تفصیلات بتائی جاتی ہیں۔ وہ کچھ اس طرح کی ہوتی ہیں: کرایہ پانچ بالٹیاں پانی۔ کرایہ ایک عدد کدال۔ ایک عدد کھرپہ وغیرہ" اور اس کے ساتھ ساتھ ہی قبر کی کھدائی میں مرحوم کے رشتہ دار کارکنوں کی مدد اور انھیں گاہے گاہے ٹھنڈا پانی پلانا وغیرہ وغیرہ!!"

آخر کار بڑی لے دے کے بعد چالیس روپے پر فیصلہ ہو جاتا ہے۔ ذرا آگے بڑھتے ہیں تو ایک گیسو دراز سیاہ لباس پہنے ملنگ بابا نظر آئیں گے جن کے ہاتھوں میں پلاسٹک کے بڑے بڑے کنگن ہوں گے اور گلے میں موٹے موٹے موتیوں کے ہار۔ بڑی سنجیدگی اور پروقار سے افسوس کا اظہار فرمائیں گے اور پھر مرحوم کی قبر پر ہر رات تلاوت کرنے۔ پانی چھڑکنے۔ اگربتی جلانے اور قبر کو مانس خور جانوروں سے بچانے کا ذمہ لیں گے۔... اتنے ڈھیر سارے کاموں کا معاوضہ وہ صرف دس روپے مانگیں گے۔ وارث دو روپے ان کی ہتھیلی پر رکھتے ہیں۔ وہ لینے سے انکار کر دیتے ہیں۔ آخر تان بمشکل ۵ روپے کے نوٹ پر ٹوٹتی ہے۔

ورثاء بڑبڑاتے ہوئے تیز قدموں سے گھر کی جانب لوٹ رہے ہوتے ہیں کہ ایک آواز دور سے سنائی دیتی ہے پلٹ کر دیکھتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ ایک صاحب ہاتھ ہوا میں لہراتے ہوئے دوڑے چلے آ رہے ہیں۔ ان کی آواز اور بھاگنے کے انداز سے یوں محسوس ہوتا ہے گویا مُردہ اچانک زندہ ہو گیا ہے۔ وارث حیرانگی کے عالم میں اس کا انتظار کرتے ہیں۔

وہ پھولے ہوئے سانس کے ساتھ قریب آ کر کہتا ہے "جی جی۔ وہ۔ ایں۔ اینٹوں اور۔ اور سلوں اور تخ۔ تختوں کے پے۔ پیسے رہ گئے!!!"

●●

بے ادب کہانیاں

ظفر پیامی

۱۹- اے، نگل مہر پارک۔ نئی دہلی

آخری آدمی

گورودیو پُراسرار غار کے اندر بیٹھے ہر ایک بھگت کو ایک ایک کرکے درشن دیتے اور ایک منتر اس کے کانوں میں پھونک دیتے۔ گورو منتر لے کر بھگت چرن چھوتا اور باہر آکر اپنے دوستوں اور ساتھیوں کی بھیڑ کو مشکوک خاموشی کے ساتھ تاکنا شروع کر دیتا۔ کچھ لمحے بعد وہ اپنے پرانے دوستوں اور نئے دشمنوں کی موجودگی سے قطعاً بے نیاز ہو کر اپنی نگاہیں غار کے اوپر جھکی ہوئی ایک چٹان پر گاڑ دیتا۔ چٹان کے اوپر سنہرے پروں، روپہلی گردن، کالی چونچ اور کالے پنجوں والا ایک بے ہنگم پرندہ گھٹنوں سے ساکت و جامد بیٹھا تھا۔ نہ جانے کس کے انتظار میں۔

گورو دیو کے بھگتوں کی بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی کہ گورو دیو اپنے ہر بھگت کو الگ الگ نہال کرنے پر مصر تھے۔

"مگر گورو دیو نے تو برسوں صرف میرے ہی کان میں مجھے اور صرف مجھے ہی بلایا تھا، دوسرے کان تک کو اس بلاوے کی خبر دینے کی مناہی کر دی تھی، پھر یہ بھیڑ کیسے اکٹھا ہو گئی؟"

"ہو سکتا ہے کہ گورو دیو نے..."

"مگر نہیں، گورو دیو ایسا نہیں کر سکتے۔"

"تو پھر؟"

بھیڑ میں شامل ہر شخص اس خود کلامی میں مصروف اُس طلسمی پرندے پر نظریں جمائے ہوئے تھا جو یوں چپ چاپ بیٹھا تھا جیسے موم کا بنا ہو۔ جو شخص بھی گورو منتر پا کر بھیڑ میں شامل ہوتا اپنے آس پاس سے غیر متعلق ہو کر اُسی عجیب و غریب پرندے کی جانب دیکھنے لگتا جو شکل و صورت سے کبھی راج ہنس لگتا، کبھی باز، کبھی گدھ اور کبھی جنگلی کوّا۔

جب گورو دیو کا آخری بھگت بھی گورو منتر پا کر غار سے باہر آکر بھیڑ میں شامل ہو گیا تو سنہرے پروں، روپہلی گردن لعلیں آنکھوں کالی چونچ اور نیلے پیروں والا پُراسرار پرندہ تیزی سے اُڑتے ہوئے دور اُفق کی جانب بڑھنے لگا۔ اُڑنے والے پُراسرار پرندے کی رہنمائی میں بھیڑ نے ایک دوسرے پر گرتے پڑتے، لڑھکتے سنبھلتے اور اٹھتے ہوئے بے تحاشا دوڑنا شروع کر دیا۔ پہلے وہ لوگ غار کے اوپر ایستادہ چٹان پر چڑھے پھر اس کے سامنے پھیلے ہوئے چٹیل میدان میں بھاگے پھر کانٹے دار جھاڑیوں سے اَٹی ہوئی پہاڑیاں انھوں نے پار کیں پھر کبھی صحرا اور کبھی دریا انھوں نے اپنے قدموں تلے روند ڈالے۔ وہ بے تحاشا دوڑتے چلے گئے۔ حتیٰ کہ پُراسرار پرندہ بھی انھیں خلا کے بے پناہ ویرانے میں چھوڑ کر سُرمئی بادلوں میں کہیں کھو گیا۔

دوڑتے دوڑتے انھیں یہ بھی نہ یاد رہا تھا کہ وہ کب دوڑے تھے، کہاں سے دوڑے تھے اور دوڑتے وقت کل کتنے تھے۔ کبھی وہ سب گہرے دوست تھے۔ ایک دوسرے کے دکھ کے ساتھی اور سکھ میں ہم نوالہ اور ہم پیالہ۔ مگر اب دوڑ میں وہ ایک دوسرے کا نام کیا چہرے تک بھول چکے تھے۔

مگر ایک دوسرے پر وہ اب بھی نگاہیں جمائے رہتے کہ ہر ایک ڈرتا تھا کہ دوسرا کہیں آگے نہ نکل جائے۔ دوڑ میں شریک ہر شخص کو یقین تھا کہ گوہرِ مقصود اُسے ہی ملے گا۔

جب اُنھوں نے دوڑنا شروع کیا تھا تو سورج شاید ان کی پیٹھ کے پیچھے تھا۔ انھیں پتہ ہی نہ چلا کہ کب سورج ان کی آنکھوں کے سامنے آیا، کب اُن کی آنکھوں نے اندھیرے میں دوڑنے کا فن سیکھا اور کب انھوں نے دُور دھرتی اور سمندر کی کوکھ سے کسی نئے آفتاب کے پیدا ہونے کا نظارہ کیا۔ رفتہ رفتہ مگر وہ یہ بھول گئے کہ سارے کے سارے راستے قطعاً ویران ہیں۔ میلوں تک نہ کوئی جاندار نظر آتا ہے نہ پانی کی ایک بوند اور نہ گھاس کی ایک پتی۔ اپنے زخمی پیروں پر اپنا خالی پیٹ اور بے نور آنکھوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے وہ بھاگتے رہے کہ شام و سحر سے اس بے نیازی کے باوجود راستے سے وہ اسی طرح واقف تھے جس طرح ان سے پہلے بھاگنے والے شہر تمنا کے ان گنت مسافر۔

بیسویں صدی کی دہلی ہے؟

شہرِ تمنا جس کے مکانوں کے دروازے چاندی کے تھے اور چھتیں سونے کی تھیں۔ شہرِ تمنا جہاں تمنائیں لب تک آنے سے پہلے پوری ہو جاتیں۔ شہرِ تمنا برسوں بعد صرف ایک شخص کو داخلے کی اجازت دیتا تھا۔ وہ خوش نصیب جو ہر بدنصیب کو پیچھے چھوڑ کر اوّل آتا۔

دوڑتے، گرتے اور گر کر دوڑتے ہوئے آگے جانے والے جب بھی پیچھے مڑ کر دیکھتے انھیں پیچھے آنے والی بھیڑ پہلے کی نسبت کم دکھائی دیتی۔ پیچھے رہ جانے والے جب ہانپتے کانپتے آگے دیکھتے تو انھیں بھی آگے جانے والوں کی قطاریں ذرا خالی خالی سی دکھائی دیتیں۔

دوڑنے والوں کی گنتی مسلسل گرتے رہنے کے باوجود بھاگنے والے بھاگتے رہے اور گرنے والے گرتے رہے۔ کسی کو فرصت نہ تھی یہ دیکھنے کی کہ کون گر رہا ہے یا کون دم توڑ گیا ہے۔

دوڑنے والوں کے درمیان فاصلے اب بڑھ رہے تھے، دلوں کی دوریوں کی مانند۔

پھر نہ جانے کیسے اور کیوں دوڑنے والوں میں سے کسی کو خیال آیا کہ راستے میں گرنے والوں کو بے سہارا و بے کفن چھوڑ جانا نہ تو شرافت کی دلیل ہے اور نہ ہی دانش مندی کی علامت۔

ایک دوسرے سے کچھ کہے بغیر سب کے سب اچانک ایک گرنے والے پر یوں ٹوٹ پڑے جیسے کسی صدائے غیبی نے ان سب کے کان میں کوئی شیطانی منتر پھونک دیا ہو۔

پہلے بھی اس راستے پر گرنے والے شاید اس طرح صاف ہوئے ہوں گے کہ شہرِ تمنا کے بیابان راستے ہیں نہ کہیں کوئی لاش ملی تھی اور نہ کسی مرنے والے کا کوئی اور نشان۔ دوڑ کی اس روایت سے بھاگنے والوں کو اخلاقی قوت اور جسمانی تقویت ملی۔

اب بھاگنے والوں کی ایک آنکھ منزل کی طرف رہتی اور دوسری آنکھ اپنے ساتھی کا تعاقب کرتی رہتی کہ کب وہ گرتا ہے۔ گرنے والے کو پل بھر میں صاف کر کے بچے کھچے لوگوں کے پاؤں میں ایک نئی تیزی آجاتی اور وہ زیادہ انہماک سے دوڑنے لگتے کہ نہ جانے کب کون اور کہاں گر جائے۔

اپنے کمزور اور ناتواں ساتھیوں کو صاف کرنے والوں کا جم غفیر اب ایسے مٹھی بھر لوگوں میں بدل چکا تھا جن کی نگاہیں بیک وقت شہرِ تمنا کے دور ایستادہ دروازے پر بھی تھیں اور اپنے کسی قریب المرگ ساتھی کے گرتے پڑتے قدموں پر بھی کہ ناموں کی دنیا اب پوری طرح نمبروں کے جنگل میں بدل چکی تھی۔

اور پھر نہ جانے کون سے جذبے سے بیتاب ہو کر سب سے آگے بھاگنے والے نے آس پاس مڑ کر دیکھا۔ اسے آس پاس آگے اور پیچھے کوئی بھی نظر نہ آیا۔ اچانک اس نے اپنے سفر بریدہ قدموں کی رفتار کو اور بھی تیز کر دیا۔ کانٹوں، کنکروں اور ساتھیوں کی ہڈیوں سے چھلنی اس کے پاؤں کسی انجانی اور ان دیکھی برقی قوت کے سہارے اڑنے لگے۔ آہستہ آہستہ اس کے جسم گویا ریزہ ریزہ بکھر گیا، مگر وہ سرپٹ بھاگتا رہا، بھاگتا رہا، بھاگتا رہا اور بھاگتا ہی چلا گیا۔ شہرِ تمنا سے بہت آگے۔

کہانی کار یہ فیصلہ نہیں کر سکا کہ آخری آدمی کے قدم کیوں نہیں رکے؟ کیا آخری آدمی کو کسی پیچھے والے کا خوف تھا کہ قدم رکنے کا مطلب تھا گرنا اور فنا ہو جانا؟

یا آخری آدمی کی آنکھیں محرومِ بصارت ہو چکی تھیں کہ وہ منزل کو پہچان نہ سکا؟ یا آخری آدمی کے پاؤں بھاگنے کے اس قدر عادی ہو چکے تھے کہ شہرِ تمنا سے شہرِ فنا تک جا پہنچے؟

اندھے مہاراج کی پتنی

وہ تھی ایک راج کماری —
سندر، چنچل، من موہک اور سوشیل
راج کماری کا وِواہ ہوا مہاراج ادھیراج سے۔
مہاراج ادھیراج کے پاس سب کچھ تھا — دولت، طاقت اور شان۔ نہ تھی تو صرف ایک ہی چیز۔ دیکھنے کی شکتی۔
نئی بیاہتا راج کماری، مہارانی بیچاری۔ وہ کیسے دیکھے وہ سب کچھ جو اس کے پتی کو دکھائی نہ دے۔
تب مہاراج ادھیراج کی مہارانی نے پتی ورتا دھرم کا پالن کیا —
اپنی آنکھوں پر سدا کے لیے پٹی باندھ لی اندھے مہاراج کی پتنی نے۔
مہاراج ادھیراج کے کال میں بہت کچھ ہوا۔

ایک ونش کے ساتھ گھورا نیائے
جوئے میں داؤ پر لگائی گئی ایک پتنی
جوئے میں ہار گئی پتی ورتا پتنی کا چیر ہرن۔
بھائیوں کا بھائیوں کے ہاتھوں ستیاناس
ایک سروناشی مہان یدھ
مہاراج ادھیراج دکھی ہوتے رہے سب کچھ سُن کر
مہاراج ادھیراج مگر کچھ نہ کر پائے۔
نیائے اور انیائے کی پہچان آنکھوں بغیر نہیں ہوسکتی
اندھے مہاراج کی پتنی بھی کچھ دیکھ نہ پائی، کچھ کر نہ پائی۔ وہ بھی کیول دکھی ہوتی رہی اپنے پتی پرمیشور کی طرح۔
برسوں بیت گئے۔
اندھے مہاراج کی پتنی نے ودھوا پر ستھا میں پرویش کیا۔
اپنی آنکھوں سے اس نے پٹی اُتاری
تب تک لیکن اندھے مہاراج کی پتنی کی آنکھیں روشنی کھو چکی تھیں۔
بیچاری اندھی ودھوا، اسے آج تک پتہ نہیں چل پایا کہ مہاراج کیول کائر تھے، اندھے نہیں۔۔۔

پرتگیا

"حضور کوتوال صاحب! ساری سڑکیں راہگیروں پر بند کیوں ہیں؟" عام آدمی نے ہاتھ جوڑتے ہوئے سپاہی سے پوچھا۔
"اندھا ہے کیا؟ دیکھتا نہیں کہ مہاراج اپنی پیاری جنتا سے ملنے آرہے ہیں۔"
"مگر سرکار۔۔۔ سڑکوں پر یہ قالین کاہے بچھ رہے ہیں۔"
"مہاراج نے پرتگیا کی ہے کہ جب تک جنتا کا ایک بھی آدمی ننگے پاؤں رہے گا وہ بھی ننگے پاؤں رہیں گے۔"
سپاہی نے لاٹھی گھما کر دخل در معقولات عام آدمی کو بھگاتے ہوئے جواب دیا۔

سمجھوتہ

نئی بیاہی بیوہ اپنے نئے گھر میں جب کبھی اداس ہوتی تو ٹھنڈی آہ بھر کر کہتی۔ "ہائے رے میرے پہلے گھر والے۔"
ایک روز چڑھ کر عورت کے شوہر نے اس سے پوچھ ہی لیا۔ "تم جو مرنے والے کو ہر وقت یاد کرتی رہتی ہو تو میں کیا بُرا ہوں؟"
عورت نے شاید یہ سوال سُنا نہیں۔
عورت کھانا پکانے کے لیے پُرانے اسٹوو کی جلی ہوئی بتیوں کی نوک پلک کاٹنے میں مصروف رہی، ایک کند قینچی کے ساتھ۔
مرد نے پھر وہی سوال دہرایا۔
عورت اب اسٹوو کی ٹیڑھی ٹیلی صاف کر کے اسٹوو میں گیس بھرنے لگی۔
مرد نے تیسری بار ذرا غصے سے پوچھا۔
"بولتی کیوں نہیں؟ پہلے والے کے مقابلے میں مَیں کیا بُرا ہوں؟"
اسٹوو میں ہوا بھرتے بھرتے عورت نے جواب دیا۔
"تم بھی اچھے ہو بھائی۔"
اور وہ پھر اسٹوو میں ہوا بھرنے میں مصروف ہو گئی۔

●●

کشکولیات

مختار زمن

غالب لائبریری ناظم آباد ۲ کراچی ۱۸ (پاکستان)

جس طرح بھیک کی مختلف اقسام و اصناف ہیں، اسی طرح بھکاری بھی مختلف النوع ہوتے ہیں۔ ان کے طریق کار، یونیفارم، آلات پیشہ، صدا لگانے اور پیسہ اگلوانے کے انداز الگ الگ ہوتے ہیں، مطالعے اور مشاہدے سے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ حصول مقصد کے تکنیک و طریقے اکثر تاریخی، آزمودہ اور برسوں کے تجربے کا نچوڑ ہیں، اس لیے کہ گداگری بھی خاصا قدیم پیشہ ہے۔ مشتے نمونہ از خروارے۔ آپ پہلے معمولی بھکاری یعنی گریڈ نمبرا کے فقیر یا فقیرنی کو لیجیے — کراچی کے کسی چوراہے پر گاڑی روکیے۔ مَیلے، کالے یا کتھئی برقعے میں ملفوف شے آپ کی طرف بڑھے گی۔ شہادت کی انگلی اٹھائے گی اور ایسی لجاجت سے فریاد کرے گی کہ اگر زمین پر رینگنے والے حقیر کیڑے بولتے تو اسی انداز سے بولتے۔ "بابو! بچہ دو دن کا بھوکا ہے۔ اللہ کے نام پر دے دو۔" ہو سکتا ہے کہ وہ فریم میں جڑا ہوا بھیک کا سرٹیفکٹ یا دوا خریدنے کے لیے دو تین بوتلیں بھی لیے ہو — یہ طریقہ صاف اور سیدھا، اندازِ بیاں سہل ممتنع ہے، بھکاری کی یونیفارم اور آلات پیشہ وراں میں میلا برقعہ اور دبلا پتلا بچہ شامل ہیں جو بر سہا برس تک ۸ – ۹ ماہ کا ہی معلوم ہوتا ہے۔ وہ نہ دودھ پیتا ہے نہ شناختی کارڈ رکھتا ہے اس لیے یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہی بچہ ہے جو آپ نے سالِ گذشتہ دیکھا تھا — لیکن سائز ہمیشہ ایک ہی رہتا ہے۔ سنا ہے اس عمر اور ساخت کے بچے کرائے پر ملتے ہیں۔ بھکارن اپنی انگشتِ شہادت اس طرح اٹھاتی ہے کہ آپ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ جیسے آپ پر انگلیاں اٹھائی جا رہی ہیں —

میں نے سابق مشرقی پاکستان کی ایک ساری پوش بنگالن کو دیکھا جس کی بھیک کا آلہ صرف ایک ۶ – ۷ سات برس کی لنگڑی بچی تھی۔ میرے ساتھ وہ صاحب بھی تھیں جن سے میری پرانی یاد اللہ ہے اور جن کے دولت خانے پر میرا مستقل قیام ہے۔ وہ بڑی خدا ترس اور رحمدل واقع ہوئی ہیں۔ چنانچہ انھوں نے بنگالن کو ملازمت اور لنگڑی بچی کے علاج کی پیشکش کی۔ بنگالن نے اسے حقارت سے ٹھکرا دیا اور بولی۔ "آپ کتنا طلوب دینے سکتا۔ ہم بھیک سے ایک ہزار روپیہ کماتا ہر ماہینہ" — اُسے روزانہ فوری نقدی کی ضرورت تھی، ماہانہ طلوب یا تنخواہ کی نہیں — بچی کا لنگ اُسے خرچ سے تنگ نہیں ہونے دیتا۔

بعض بھکاری اس سے مختلف یونیفارم اور الگ ہی ادا سے نمودار ہوتے ہیں۔ لمبا کرتہ، سر پر رومال، لمبے بال، منھ پر داڑھی، ہاتھ میں کدو کا کالا کشکول۔ ان کا انداز خطیبانہ اور کلام فلسفیانہ ہوتا ہے۔ آواز میں چیلنج اور دو ٹوک قولِ فیصل کا رنگ — "مجھے دے جو دیتا ہے، آخرت میں سَو گُن لینا۔"

میں نے ایک روئیں تن ستم فگن بھکاری کو دیکھا، چار ابرو کا صفایا گلے میں کبوتر کے انڈوں کے برابر منکوں کی مالا اور خون کبوتر کی طرح سرخ آنکھیں اور آنکھوں کے گرد سیاہ کاجل کا حاشیہ، فربہ بدن پر سبز رنگ کا چغہ جیسے فیشن ایبل خواتین میکسی پہنتی ہیں۔ ہاتھ میں کڑوا تیل پلایا ہوا ڈنڈا، ڈنڈے پر چار انچ کے بعد پیتل کی چوڑیاں کسی ہوئیں۔ بھاری آواز میں وہ دبدبہ جیسے شیر ڈکارتا ہوا ضیغم بھارے۔ بھیک مانگنے کا انداز ایسا تھا جیسے پرانے زمانے میں سود پر روپیہ چلانے والے اپنے قرض داروں سے قرضہ مع سود وصول کیا کرتے تھے — وہ ڈنڈے سے آپ کو ٹھوکا دے کر صرف اتنا کہتا "نکال ایک روپیہ، نہ ایک پائی کم نہ ایک پائی زیادہ" مگر لوگ مارے گھبراہٹ ایک کا نہیں، پانچ کا نوٹ پیش کر دیتے۔

میں نے اپنے بچپن میں دو کمبل پوش بھکاریوں کی جوڑی دیکھی۔ ایک چمٹا بجا کر غزل کا مطلع گاتا۔ دوسرے کے پاؤں میں گھنگھرو بندھے ہوتے۔ وہ پاؤں کو ماہر رقاص کی طرح زور زور سے زمین پر مارتا۔ پھر اس چھن چھن کے ساتھ وہ باری باری صدا لگاتے "اللہ ہی دے گا۔ مولا ہی دے گا۔ دھوم قلندر، جھولی بھر دے، چنبل بھر دے، اللہ ہی دے گا۔"

ایک صاحب تھے، تار کی کمانی والی عینک چھوٹی سی سفید داڑھی، سر پر دوپلی ٹوپی، معمولی کرتہ، پاجامہ، نری کا جوتا، شکل کے وائس پرنسپل معلوم ہوتے تھے... وہ سڑک پر تیز تیز چلتے آپ کی طرف آتے۔ آپ سمجھتے کوئی شریف آدمی ہے، راستہ پوچھنے یا وقت معلوم

کرنے آرہا ہے۔ بے چارہ جلدی میں ہے۔ وہ بڑے رازدارانہ انداز میں آپ کے کان کے پاس منھ لاکر کہتے " میں نے کیا کچھ دوگے۔ تمھارے بھلے کی کہہ رہا ہوں۔ اتی خلقت جاری ہے پر آج تمھارا نمبر ہے۔ کیا کروں دِس کا اوپر والے کا یہی حکم ہے۔ سوچ لو"۔۔۔ اکثر انسانوں میں وہم کا کچھ نہ کچھ عنصر ہوتا ہے۔ وہ ماہرِ نفسیات بھکاری اس کا فائدہ اٹھاتا ہے۔ لوگ سمجھتے کہ آسمانی حکم نے کر آیا ہے۔ بھیک دیتے ہی بنتی۔

کاماسُترا اور اسی قبیل کی کتابیں اکثر حضرات پڑھتے ہیں مگر بیوی یا بے بی کے ڈر سے اعتراف کم لوگ کرتے ہیں، میں کہتا ہوں میں نے پڑھی ہیں۔ اب آپ یا "وہ صاحبہ" جو چاہے بگاڑ لیں۔۔۔ اس بیش قیمت کتاب میں بھکارن کو بھی بڑی اہمیت دی گئی ہے معلوم ہوا کہ پراچین بھارت میں بھکارن کا مجذوقتی مگر نہایت سود مند تہنر پیشہ یہ بھی تھا کہ وہ پری رخوں کی پیغام بری کا کام انجام دیتی تھی۔ بلکہ انھیں ورغلانے کا کام بھی کرتی اور ڈبل بھتہ یا بھیک پاتی۔ اسی لیے مصنف لکھتا ہے کہ بھکارنوں سے بنا کر رکھو وہ بہت کام آتی ہیں۔ پتے کی بات کہی ہے۔ اس لیے کہ بیچاری پھٹے حال بھیک مانگنے والی پر کسی کو شک نہیں ہوتا اور یہ خطرہ بھی نہیں کہ ؎ بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا۔ مردانے زنانے کی قید نہیں۔ اس کے لیے ہر دروازہ کھلا ہے، ہر جگہ جاسکتی ہے۔ ہر ایک سے بھیک مانگ سکتی ہے۔ گویا دل پھینک اور دل ستا دولوں کے لیے بھکارن ایک چلتا پھرتا ٹیلیفون ہے، اور وہ بھی پاکستانی فون نہیں جو اکثر خراب رہتا ہے بلکہ اصلی ولایتی فون۔ میرا خیال ہے کہ ایسی بھکارن کے لیے تو دل سے دُعا نکلنی چاہیے جو ظالم سماج کی آنکھوں میں دھول جھونک کر دو پریم کرنے والوں کو ملانے کا بندوبست کرتی تھی۔ آہ بھکارن واہ بھکارن، سچ ہے اے مرحومہ بھکارن سہ

تو برائے وصل کردن آمدی ؎ نے برائے فصل کردن آمدی

تاریخ کشکولیات کو غور سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ میدانِ عشق و محبت میں خود عاشق بھی ایک قسم کا بھکاری ہوتا ہے۔۔۔ اب تو خیر یہ قبیلہ سوٹ بوٹ، بندھی شلوار میں ملبوس نظر آتا ہے۔ صحرا نوردی کے بجائے کاروں میں اڑا پھرتا ہے۔ اب قاصدوں اور پیغام بروں کو پھیرے پہ پھیرے نہیں کرنے پڑے، ڈائیل گھمایا اور فون پر "آہ، اوی" کرلی۔۔۔ لیکن پرانے زمانے میں عشاق کی پہچان ہی یہ تھی کہ وہ "فاسٹنگ بُدھا" یعنی مہاتما گوتم بُدھ بحالتِ صوم نظر آتے تھے، ایک ایک لیلیٰ کی لو۔۔۔ سینہ سرکنڈے کی بَجق، گالوں کے گڈھے ہمارے عزیز شہر کی سڑکوں کے سمان، آنکھیں بجھے دیے، بالکل جھاڑ جھنکاڑ۔۔۔ اور یونیفارم ان بیکس سائیلوں کا لباسِ عریانی۔۔۔ یعنی تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلتے تھے۔ یہ حضرات بھکاری لگتے بھی تھے اور ہوتے بھی تھے اس لیے کہ شربتِ وصل کی بھیک مانگا کرتے تھے۔۔۔ نہ پیسہ، نہ کوڑی، نہ کپڑا، نہ لتا۔۔۔ بس ایک گلاس شربتِ وصل کا سوال ہے۔۔۔ مگر شاباش ہے اس زمانے کے نفیس طبع، عالی وقار محبوبانِ گل عذار کی وسعتِ قلب کو کہ اپنی روایتی اور پیشہ ورانہ غفلت شعاری اور ظلم و جور کی مصروفیات کے باوجود وہ ایسے اول جلول ٹٹ پونجیوں کو بھی کبھی کبھی منھ لگا ہی لیتے جنھیں آج کل "پوش" علاقوں میں گھسنے کی بھی اجازت نہ ملے گی جبھی تو کہا گیا ہے سہ

درد سے میرے ہے تجھ کو بیقراری ہائے ہائے

کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے

قبیلہ عشاق میں قیس عامری مرحوم کا بڑا نام ہے۔ یوں بھی تو سبھی عشاق بھکاری تھے لیکن موصوف نے تو غضب کردیا کہ باقاعدہ بھیک کا پیالہ لے کر درِ محبوب پر پہنچ گئے اور گداگروں کی قطار میں کھڑے ہوگئے۔ چنانچہ تاریخ میں یہ واقعہ یوں درج ہے کہ سہ

سنتے ہیں لیلیٰ کا یہ دستور تھا ؎ بھیک دیتی در پہ جو آتا گدا

ایک دن مجنوں بھی کاسہ ہاتھ لے ؎ جا پکارا در پہ کچھ للہ دے

آئی لیلیٰ اُن سبھوں کو کچھ دیا ؎ ہاتھ سے مجنوں کے کاسہ لے لیا

اس کے بعد تاریخ میں مختلف بیانات ہیں۔۔۔ کوئی لکھتا ہے کہ لیلیٰ نے کہا "ہائے اللہ تم! کوئی دیکھ لے تو" کسی مورخ نے لیلیٰ کے ابا آرہے ہیں اس لیے وہ جھپاک سے اندر جانے لگی مگر زیادہ تر اس پر اتفاق ہے کہ لیلیٰ شرمائی، دوپٹے کا پلو انگلی پر لپیٹنے لگی اور بڑے ناز و انداز سے اس نے یہ شعر گا کر پڑھا سہ

تیرا صدقہ اور تجھی کو بھیک دوں!

جی میں آتا ہے کہ کاسہ پھینک دوں (پھینک ضرورتِ شعری ہے)

واقعہ کچھ بھی ہو آنسہ لیلیٰ نے عشق کی عزت رکھ لی۔ عاشقوں کی فہرست سے قیس کا نام نہیں کٹا۔ ورنہ انھوں نے جو حرکت کی تھی اس کے باعث عجب نہیں کہ مردم شماری کا محکمہ ان کے نام پیشہ ور بھیک منگوں، فقیروں، کشکول برداروں اور گداگروں کی فہرست میں ٹانک دیتا۔

ہمارے معاشرے پر زکوٰۃ، خیرات، صدقہ، بھیک، دان، پُن کی چھاؤنی چھائی ہوئی ہے۔ شعرا کرام نے بھی ان موضوعات کو

تو ستھرے ڈھنگ سے باندھا ہے۔ اور ہمارے بزرگ اور عظیم شاعر حضرت جگر مراد آبادی نے تو وہ طریقہ بتا دیا کہ گرہ سے دھیلا خرچ نہ ہو اور زکوٰۃ ادا ہوتی رہے۔ اقیموا الصلوٰۃ ہو یا نہ ہو آتوا الزکوٰۃ ہوتا رہے گا اور ثواب ملتا رہے گا ؂

پیہم جو آہ آہ کیے جا رہا ہوں میں
دولت ہے غم زکوٰۃ دیے جا رہا ہوں میں

اس شعر سے یہ تو معلوم ہو گیا کہ جگر مراد آبادی صاحب نصاب تھے مگر انھوں نے مستحقین کا ذکر نہیں کیا۔ زکوٰۃ نکلتی تھی تو پھر کس کے کشکول میں جاتی تھی؟ نیز کیا زکوٰۃ کمیٹی کے چیرمین اس زمانے میں بھی تھے یا نہیں؟ ـــ ایک اور نکتہ یہ ہے کہ باوجود عاشق مزاج شاعر ہونے کے جگر صاحب نے کاسۂ گدائی ہاتھ میں نہیں لیا ـــ ہاں اُن کا قبیلہ مرزا غالب دراز قد، خوش پوش ترک نژاد اور رئیس زادے تھے مگر لگتے گدا تھے۔ کم از کم محبوبہ کے در دولت کا چوکیدار جو پاسبانی کے لیے ہر دم بلم لیے کھڑا رہتا اُسے مرزا یقیناً گدا ہی معلوم ہوتے تھے۔ خود مرزا کا بیان ہے ؂

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

اس وقت یقیناً مرزا کا چار گرہ کپڑے کا گریباں چاک ہوگا، اونی فرغل اور جو گوشیہ ٹوپی گھر پر چھوڑ آئے ہوں گے، ان کا شوق بھی ہر رنگ رقیب سر و سامان ہوگا تو ظاہر ہے وہ عین مین گدا معلوم ہوتے ہوں گے اس میں غریب خان کا کیا قصور؟ بہت دیر ہو گئی، نہ در دولت وا ہوا، نہ دیدار کی کوئی صورت نظر آئی، مرزا آخر رئیس طبع اور نک چڑھے تھے ـــ برداشت کی قوت جواب دینے لگی تو مجبوراً چوکیدار کے قدم لیے جو شاید نٹ بھر کے پشاوری چپل میں چھپے ہوئے تھے۔ اب تو خان تاڑ گیا کہ اس گدا نما آدمی کا مطلب بھیک لینا نہیں ہے بلکہ مطلب سعدی دیگر است ـــ پھر کیا ہوا؟ تاریخ کشکولیات و عشقیات دونوں خاموش ہیں۔ کیا چوکیدار نے مرزا کو صرف یہ کہہ کر بھگا دیا "خوچہ، ابی جاؤ، ابی میم صاحب آرام کرتا ہے۔" یا بدکلامی کی کہ "خنزیر کا بچہ، ام تمھارا گردن زدنی کرے گا ـــ" مرزا نے خود بھی کوئی تفصیل نہیں بتائی البتہ "شامت" آنے کے ذکر سے یہ اشارہ ضرور ملتا ہے کہ خان و مرزا کے مراسم یقیناً خوشگوار نہیں رہے بلکہ ناگفتہ بہ رہے۔ مگر یہ طے ہے شربتِ وصل کے ایک قطرے کی بھیک بھی نہ ملی ـــ آج کل بھیک کی ایک اور قسم بہت معروف ہے۔ اور وہ ہے ووٹ کی بھیک۔ اس میدان میں آپ کو اسی طرح کا الٹا نقشہ نظر آئے گا جیسے کہا گیا ہے کہ ؂ مجنوں نظر آتی ہے، لیلیٰ نظر آتا ہے

یعنی اکثر دولت مند حضرات جو اپنے خزانوں پر کوڑیالے سانپ بنے بیٹھے رہتے ہیں دو کوڑی کے ووٹروں سے ووٹ کی بھیک مانگتے نظر آتے ہیں۔ وہ اپنی پھنے خانی پھنکار بھی فی الحال اس وقت تک کے لیے ملتوی کر دیتے ہیں ـــــــ ـــــــ جب تک وہ جیت نہ جائیں، لیکن مستثنیات بھی کافی ہیں جیس طرح رویئں تن فقیر ڈنڈے کے زور سے بھیک لیتا ہے اسی طرح دیہات کے طرّے باز زمیندار ووٹ لیتے ہیں۔ گویا بھیک رویئں تن کا اور ووٹ طرّے باز کا پیدائشی اور موروثی حق ہے۔

گداگری کی ایک جدید قسم ایسی ہے جو گداگری نہیں کہلاتی۔ اُسے ایڈ، امداد، قرض، ہدیہ دوستی، گرانٹ وغیرہ قسم کے نام دیے جاتے ہیں۔ لیکن کتنی پھندنے، غلاف، پیکنگ، لفافہ اتار دیجیے تو اندر سے وہی چیز نکلتی ہے جو تونگر فقیر کے کشکول میں ڈالتا ہے۔ آنجہانی ولیم شیکسپیئر نے فرمایا۔ "گلاب کو کسی نام سے یاد کیجیے، خوشبو وہی رہے گی ـــ" اسی طرح بھیک کو کچھ بھی کہیے، بو وہی رہے گی۔

مجھے خیال آیا کہ ہمارے محلّے میں ایک صاحب ثروت حاجی صاحب رہتے ہیں۔ کاروبار بہت پھیلا ہوا ہے۔ سعودی عرب اور شیوخ زدہ خلیجی ریاستوں میں ان کے گماشتے مقرر ہیں۔ ماشاء اللہ صاحب ریش اور سخت مذہبی آدمی ہیں وہ صرف ان قوانین کو مانتے ہیں جو قرآن و حدیث میں آتے ہیں۔ اُن کے بقول نہ قرآن میں اسمگلنگ کا ذکر ہے۔ نہ اس پر قدغن۔ یہی حال حدیث کا ہے۔ لہٰذا اس دنیائے دنی کے گنہگار ریاستوں نے اسمگلنگ کے خلاف جو قوانین نافذ کر رکھے ہیں انھیں توڑنا جائز بلکہ عین ثواب ہے ـــ یہی پالیسی اور چند اور باتیں ان کی دولت مندی کا راز ہیں۔ ہر بقرعید کے موقع پر وہ ایک درجن ایسی گائیں ذبح کرتے ہیں جیسی بنی اسرائیل کو ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ تین دن تک ان کے درِ دولت پر بھکاریوں، بھکارنوں اور کھالیں جمع کرنے والوں کا میلا لگا رہتا ہے۔ یہ لوگ جوئے خون میں شناوری کر کے سر سے پاؤں تک بھیگ کر سری پائے اور گوشت حاصل کرتے ہیں۔

حاجی صاحب کا ذکر سُنا تو نہ معلوم کیوں مجھے امریکہ یاد آگیا۔ چچا سام کے دست و بازو کو نظر نہ لگے۔ بہت لمبے اور تگڑے ہیں۔ ان کے درِ دولت پر بھی ایشیا، افریقہ، لاطینی امریکہ بلکہ یورپ تک کے گداگروں کی کثیر تعداد نظر آتی ہے ـــ

سامانِ خورد و نوش اور اسباب حرب و ضرب سے لے کر نقدی تک ہر شے اس باب عالی سے تقسیم ہوتی ہے مگر یہاں کا دستور نرالا ہے آپ فقیر کو بھیک دیتے ہیں تو اس سے حساب نہیں لیتے۔ حساب مانگ کر دیکھیے تو جو اٹھنی، روپیہ آپ نے دیا ہے وہ آپ کے منہ پر مار کر چلا جائے گا۔ مگر نئی دنیا کا معاملہ عجیب ہے۔ گداگر بڑھیا سے بڑھیا سوٹ پہن کر آتے ہیں۔ اعلیٰ ہوٹلوں میں قیام فرماتے ہیں بلکہ جتنا غریب ملک ہوگا اسی قدر قیمتی سوٹ پہن کر اس کا نمائندہ کشکولِ گدائی لیے یہاں آئے گا۔ ان کی یونیفارم بین الاقوامی قسم کی ہے۔

بھکاری پہلے سال گذشتہ کی بھیک کا حساب پیش کرتا ہے۔ تونگر سخی داتا اس کی جانچ پڑتال کرتا ہے۔ بے جا خرچ ہوا تو ڈانٹ پڑتی ہے۔ پھر اگلے برسوں کے روٹی کپڑے، تیل پھلیل، آتشبازی وغیرہ دوسری ضرورت کی فہرست پیش ہوتی ہے۔ بھیک کی مقدار پر بحث چلتی ہے۔ مقدار مقرر کرکے اسے لشت از بام کیا جاتا ہے۔ یہاں یہ اصول نہیں چلتا کہ دائیں ہاتھ سے دو تو بائیں کو خبر نہ ہو۔ کمیٹیوں اور میٹنگوں میں بحث ہوتی ہے۔ تب کہیں جاکر پیسے یعنی ڈالر کے روئے زیبا کی زیارت نصیب ہوتی ہے۔ لطف یہ کہ بھکاری بڑے فخر سے اپنی یافت کو مشتہر کرتے ہیں جو جتنی زیادہ بھیک لائے وہ ملک میں اسی قدر محترم سمجھا جاتا ہے۔ اب تو ایسا لگتا ہے کہ پورا ملک ایک عظیم الشان، وسیع و عریض کشکول کی صورت اختیار کر چکا ہے مگر کیا کیجیے ہمارا کشکول بھی پرانا ہو چکا ہے۔ اس میں متعدد سوراخ ہو گئے ہیں۔ یار لوگ بڑے تیز طرار ہیں۔ انھوں نے نلکیاں اٹھا رکھی ہیں۔ ایک سرا کشکول کے پیندے کے سوراخ میں، دوسرا اپنی جیب میں۔ کشکول میں جو کچھ گرتا ہے اس کا کچھ حصہ نلکیوں کی راہ سے ان محترم جیبوں میں چلا جاتا ہے۔ بس جو کچھ بچ گیا وہی کشکول کا حصہ رہا۔ مگر دینے والا ہر سال حلق میں انگلیاں ڈال کر سود اور ادائیگی قرض کے نام پر اسی بھیک کا بڑا حصہ خود لے جاتا ہے۔ آخر کو وہ مخدوم ہے۔ اس کا حق ہے۔ ہم خادم لوگ یہ کہہ کر اگلے سال کا انتظار کرنے لگتے ہیں کہ:

بھیک دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

اردو تنقید میں سماجیات کے شعور کو عام کرنے کے محرک یقیناً اختر حسین رائے پوری ہیں۔ لیکن اس کی توسیع میں احتشام حسین، مجنوں گورکھپوری اور ممتاز حسین کا حصہ وقیع ہے۔ آج بھی بہت سے ترقی پسند نقاد جن میں ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر قمر رئیس، ڈاکٹر شارب ردولوی اور محمد علی صدیقی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں، اسی سماجی شعور کے حوالے سے اختر حسین رائے پوری کے راستے پر گامزن ہیں۔ البتہ اسے محمد حسن عسکری، سلیم احمد اور مظفر علی سید وغیرہ نے پاکستان میں اور شمس الرحمٰن فاروقی اور اسی قبیل کے دوسرے نقادوں نے ہندوستان میں بہت ضعف پہنچانے کی کوشش کی۔ انھوں نے سماجیات سے مطلقاً قطع نظر کرکے انفرادیت پر زور دیا۔ تعقل و تفکر سے زیادہ جذبے، وجدان اور تخیل پرستی کو اور نہایت ہی موہوم مبہم تخیلی خطوط کو ایک ایسی مابعد الطبیعیات میں دریافت کیا جن کے ہیولے بھی قائم نہیں ہوسکتے، بالخصوص محمد حسن عسکری اور سلیم احمد نے تو رینے گینوں جیسے کمزور فلسفی کا سہارا لے کر سادہ لوح مبتدی ادیبوں اور ادب کے طالب علموں کو خواہ مخواہ بہکایا۔ اگر آپ غور کریں تو تیسری دنیا کے معاملے میں سرمایہ دار اور سرمایہ پرست ممالک کی یہ کھلی سازش تھی کہ سماجی شعور عام نہ ہو سکے اور اس راستے میں زیادہ سے زیادہ موانع پیدا کیے جاسکیں اور وہ جو اسٹریم آف کانشس نس پیدا ہو کر پھیل رہی تھی، اس کے تمام منابع کو بند کر دیا جائے۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ غیر ضروری انتہا پسند انفرادیت پرستی، رومانی تخیل پرستی، جذبے اور وجدان کی اندھی تقلید کو چھوڑ کر سماجی علوم کی وقعت کو پہچانا اور پہچنوایا جائے۔ تاریخی، معاشرتی، معاشی اور عمرانی محرکات اور عوامل کو سمجھا اور سمجھایا جائے۔ اس سیاق و سباق میں جو تنقیدی شعور پیدا ہوگا وہی مذکورہ بالا روایت کو آگے بھی بڑھائے گا۔ اور وہ ادب کی صحت مند قدروں کو اجاگر بھی کرے گا۔

(ڈاکٹر آغا سہیل)

سیمناری

عظیم اختر

سی۔۱۸۵، منٹو روڈ کمپلکس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

صاحبو! ہمیں نہیں معلوم کہ اردو دنیا میں سیمنار کی طرح کب اور کس نے ڈالی اور صوتی اعتبار سے ثلاثہ شلثہ سے قربت رکھنے کے باوجود انگریزی کا یہ لفظ سین ہی سے کیوں اور کس لیے لکھا جاتا ہے۔ تاریخ اردو ادب، اردو املا اور املا نامہ جیسی معتبر اور مستند کتابیں اس لفظ کے املا کے بارے میں خاموش ہیں۔ اردو املا اور املا نامہ کے فاضل مولفین نے چونکہ متقدمین کے کام پر ہی ہاتھ صاف کیا ہے (یا تو صاف کرنا بطور محاورہ استعمال نہیں کیا گیا ہے اس لیے آپ کوئی اور معنی اخذ نہ کریں) اور متقدمین بے چاروں کے زمانے میں سیمنار ہوتے ہی نہیں تھے اس لیے ان دونوں مستند اور معتبر و مشہور زمانہ کتابوں کی خاموشی تو سمجھ میں آتی ہے لیکن حیرت تو اس بات پر ہے کہ ہماری یونیورسٹیوں میں تھوک کے بھاؤ میں ڈھالے جانے والے ذہین ریسرچ اسکالروں کو بھی ابھی تک اس موضوع پر کام کرنے کا خیال پیدا نہیں ہوا۔ اور ایک اچھا خاصہ موضوع کیسے دسترس سے باہر رہ گیا۔ ممکن ہے ہمارے اس مضمون کو پڑھ کر کوئی قابل ریسرچ اسکالر" اردو میں سیمنار کی ابتدا اور اردو زبان کے فروغ میں اس کی اہمیت" کے موضوع پر قلم اٹھا کر دُور دُور کی کوڑیاں لے آئے اور اردو ادب کے دامن کو بیش بہا معلومات سے بھر دے لیکن ہم تو بس یہ جانتے ہیں کہ اردو دنیا میں جب سے سیمناروں کا چلن شروع ہوا ہے نثر نگاروں کے دن پھر گئے ہیں اور نقاد و محقق حضرات بھی معتبر اور مستند سمجھے جانے لگے ہیں، ان کی قدر و منزلت بڑھ گئی ہے ورنہ ایک زمانہ تھا کہ محقق بے چارے کرم خوردہ کتابوں کو چاٹ کر، نم زدہ اور بوسیدہ مخطوطوں کو پڑھ کر تحقیق کے میدان میں جوہر دکھاتے، نقاد حضرات شاعروں کو تنقید کی ڈانٹڈیوں میں کھپچیاں لگا کر بٹھاتے، ادب عالیہ مینوفیکچر کرنے اور کنویں کا ٹھنڈا پانی پی کر گراں مایہ ادبی خدمات انجام دیتے۔ کبھی کسی قلیل الاشاعت رسالے میں کوئی مضمون چھپ جاتا تو مہینوں اس مضمون کا تذکرہ کرتے یا بات بات میں حوالہ دیتے۔ عام آدمیوں کا ادب، تحقیق یا تنقید سے کیا تعلق اور کیا واسطہ؟ اس لیے نقاد اور محقق حضرات کے پڑوسی بھی ان کی قابلیت اور علمیت سے ناواقف رہتے اور انھیں ان کے اہلِ قلم ہونے کا پتہ تک نہ ہوتا۔ ہمارے ایک نقاد دوست تو برسوں کی محنت کے بعد اپنی سسرال والوں کو یہ باور کرا سکے کہ وہ اہلِ قلم بھی ہیں اور ادبی دنیا میں جانے پہچانے جاتے ہیں۔

یہ یقیناً حالات کی ستم ظریفی تھی کہ نقاد اور محقق بے چارے اپنی تمام تر قابلیت اور علمیت کے باوجود سماجی طور پر "برمزارِ ما غریباں، نے چراغے، نے گلے" کی تفسیر پیش کرتے جب کہ ان کے برعکس اکثر شعرائے کرام مشاعروں میں خالص عشقیہ اشعار سنا کر اور سنا ئیکی کے جوہر دکھا کر نہ صرف ادبی اور سماجی حلقوں میں مشہور ہو جاتے بلکہ مشاعروں میں شرکت کرنے کے لیے منہ مانگے پیسے بھی وصول کرنے لگتے۔

صاحبو! ہمارے اور آپ کے بزرگ کہہ گئے ہیں کہ بارہ برس کے بعد کوڑی کے بھی دن پھر جاتے ہیں۔ نقاد اور محقق بے چارے تو روزِ ازل سے ہی تغافل اور بے اعتنائی کا شکار تھے، ان کے دن کیوں نہیں پھرتے۔ یہ تو سب مانتے ہیں کہ خدا کے گھر دیر ہے اندھیر نہیں۔ وہ جب دینے پر آتا ہے تو چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔ اس نے نقادوں اور محققوں کو دینے کے لیے کوئی چھپر تو نہیں پھاڑا، کیوں کہ آج کل لوگوں نے چھپر ڈالنے ہی بند کر دیے ہاں البتہ ادب کے نام پر کھلنے کھلانے کے لیے سیمناروں کے در عزو در کھول دیے۔ کالج اور یونیورسٹیوں کی سطح پر سیمنار تو پہلے بھی ہوا کرتے تھے لیکن ان کی نوعیت خالص تعلیمی ہوا کرتی تھی۔ لیکن جب سے ریاستی اردو اکیڈمیوں نے اردو کو فروغ دینے کے لیے مشاعروں اور قوالیوں کے ساتھ ہر قسم کے ادبی اور غیر ادبی موضوعات پر سیمنار منعقد کرنے شروع کیے ہیں، اردو دنیا میں سیمناروں کی وبا ایک متعدی بیماری کی طرح پھیل گئی ہے۔ ہمارے ایک دوست کا خیال ہے کہ آج کل ادب میں جمود طاری ہے اور ہماری اردو اکیڈمیوں کے پاس خرچ کرنے کے لیے کافی پیسہ ہے اس لیے ادب کے جمود کو توڑنے اور اکیڈمیوں کے فنڈز کو خرچ کرنے کے لیے سیمناروں سے بہتر کوئی اور مناسب طریقہ اور مصرف نہیں ہو سکتا۔ بہر حال یار لوگوں نے ادب کے جمود کو توڑنے اور اکیڈمیوں کے فنڈز کو کنارے لگانے کے جوش میں مشاعروں کی طرح سیمناروں کے معیار کو اس درجے تک پہنچا دیا ہے کہ ہر وہ شخص جس نے کبھی کلاس میں کوئی مضمون لکھا ہو مقالہ نگار کی حیثیت سے سیمنار میں سرفراز کیا جانے لگا ہے۔

بہر حال اب عالم یہ ہے کہ ہمارے نقادوں، محققوں اور دوسرے نثر نگاروں کو سیمیناروں سے فرصت نہیں۔ مشاہرہ باز شعراء کی طرح ہر قسم کے سیمیناروں میں جانے کے لیے ہر وقت پابہ رکاب رہتے ہیں اور اردو کے عام شاعروں کی طرح آمد و رفت کا فرسٹ کلاس کا کرایہ لے کر دوسرے درجے میں سفر کرتے ہیں۔ ممکن ہے آپ اسے چھوٹی حرکت کہیں، لیکن ہمارے خیال میں کفایت شعاری اسی کا نام ہے۔ شیخ سعدی کی گلستاں، بوستاں سے لے کر مولانا محمد اسماعیل میرٹھی تک کی نظموں میں کفایت شعاری کی تعلیم دی گئی ہے۔ شاید اسی ابتدائی تعلیم کا نتیجہ ہے کہ اردو کے قلم کار سخت کفایت شعار واقع ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ حضرات اردو اخبارات اور رسائل کی خریداری پر پیسے ضائع کرنے کی بجائے صرف وہی اخبار و رسائل پڑھتے ہیں جو ان کو اعزازی طور پر بھیجے جائیں۔ خیر سے ایسے بھی حضرات کی کمی نہیں جو اعزازی طور پر آئے ہوئے اخبارات و رسائل کی ردی بیچ کر آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام کھرے کرتے ہیں۔

محترم قارئین معاف کیجیے گا یہ باتیں تو برسبیلِ تذکرہ نوکِ قلم پر آگئیں، ورنہ ہم تو سیمیناروں کی باتیں کر رہے تھے۔ سیمیناروں کی اس بھیڑ میں وہی سیمینار بڑے اور کامیاب سمجھے جاتے ہیں جن میں سامعین کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہو، ٹھوک کے بھاؤ سے مقالات پڑھے جائیں اور مندوبین وغیرہ کو لذیذ اور خوش ذائقہ کھانا کھلایا جائے۔ ان سیمیناروں سے اردو کو کتنا فروغ ہوا، ادب میں جمود کی وہ سِل کس حد تک اور کتنی ٹوٹی اس کے بارے میں تو پروفیسر قسم کے نقاد ہی حتمی رائے دے سکتے ہیں ہم تو بس یہ جانتے ہیں کہ بس سب سے بڑا فائدہ ہم جیسے بے گھر اور بے در لوگوں کو پہنچا ہے جو ان سیمیناروں کی بدولت مہینے کے بیشتر دنوں میں پیٹ بھر کھانا کھانے لگے ہیں۔ ہمارے خیال میں سیمیناروں کا سب سے بڑا اور افادی پہلو یہی ہے کہ مندوبین اور مقالہ نگار حضرات کے ساتھ سامعین کو بھی لنچ میں دعوتِ طعام دی جاتی ہے۔ ویسے بھی بھولے بھٹکے آئے ہوئے سامعین مسلسل خاموشی سے بوجھل اور غیر دلچسپ مقالات سن کر لنچ کے مستحق تو ہو ہی جاتے ہیں۔ بہر حال لذیذ اور خوش ذائقہ کھانے اردو سیمیناروں کی سب سے بڑی کشش ہے اور یہی کشش ہم کو بھی ہر سیمینار میں کشاں کشاں لے جاتی ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ بہت سے اردو والے عین لنچ کے وقت ہی ہال میں در آتے ہیں، لیکن ہم چونکہ حق حلال کی روٹی کھانے کے قائل ہیں اس لیے ادھر ادھر گشتی کرنے اور مارے مارے پھرنے کی بجائے صبح سے شام تک باقاعدگی سے سیمینار کی تمام نشستوں میں شرکت کرتے ہیں اور لنچ بریک میں عمدہ اور لذیذ کھانا کھا کر مندوبین اور مقالہ نگار حضرات کی طرح ہال ہی میں قیلولہ کرتے ہیں۔ آپ کو شاید یقین نہ آئے لیکن عام طور پر لنچ بریک کے بعد ہال میں صرف مقالہ پڑھنے والا ہی جاگتا رہتا ہے اور صاحبِ صدر اور باقی حضرات اونگھتے رہتے ہیں، جو مندوبین مقالہ پڑھنے کے فرض سے عہدہ برآ ہو چکے ہوتے ہیں وہ ہال کی پچھلی نشستوں پر آرام سے سوتے ہیں۔ اچھا اور پیٹ بھر کھانا کھا کر ہمیں بھی نیند آنے لگتی ہے، اس لیے ہم بھی پڑھے لکھے اور معزز لوگوں کی پیروی کرتے ہوئے سر نیہوڑا کر پلک جھپک لیتے ہیں اور کبھی کبھی چونک کر مقالہ پڑھنے والے کی طرف دیکھ کر گردن ہلا دیتے ہیں۔

صاحبو ان سیمیناروں میں باقاعدگی سے شرکت کرتے رہنے سے ہماری ادبی معلومات اور قابلیت میں کتنا اضافہ ہوا اس کا تو ہمیں آج تک خود بھی اندازہ نہیں ہو سکا ہاں یہ ضرور کہہ سکتے ہیں سیمیناروں کے مرغن اور لذیذ کھانوں سے ہماری صحت بہتر ہو گئی ہے، وزن میں اضافہ اور چہرے پہ خاصی رونق آگئی ہے ورنہ ایک زمانے میں تو ہم دور سے ہی نزار مریض نظر آتے تھے لیکن اب معقول آدمی نظر آتے ہیں۔ یہی نہیں سیمیناروں میں باضابطہ شریک ہونے والے پیشہ ور قسم کے مقالہ نگار، محقق و نقاد حضرات ہمیں بھی ادبی اور پڑھا لکھا ہوا آدمی سمجھنے لگے ہیں اور ہمیں دیکھتے ہی بڑے خلوص اور تپاک سے ملتے ہیں۔ اور بسا اوقات اپنے مضامین کے بارے میں ہماری رائے بھی طلب کرتے ہیں۔ کبھی کبھی ہمارا دل چاہتا ہے کہ منہ پھٹ لوگوں کی طرح کہہ دیں کہ آپ ادب کے نام پر بھاڑ جھونک رہے ہیں لیکن کیا کریں تہذیب اور اخلاق آڑے آتا ہے۔ ممکن ہے آپ کو ناگوارِ خاطر گزرے اور آپ ہمیں برا کہیں لیکن سچ تو یہ ہے کہ اس تہذیب اور اخلاق نے ہم اردو والوں کو سچائی سے گریز کرنے کا عادی بنا دیا ہے جس کے نتیجے میں اردو والے سماجی زندگی میں ہی نہیں بلکہ ادب میں بھی مصلحت اور منافقت کے تابع ہو کر رہ گئے ہیں۔ اس لیے ہم بھی مصلحت سے کام لیتے ہوئے نہ صرف دل کھول کر تعریف کرتے ہیں بلکہ اردو تحقیق و تنقید میں بیش بہا اضافہ قرار دیتے ہیں۔ جب کنکر کو موتی اور موتی کو لعل ٹھہرانا ہی ادب میں رواج بن گیا ہے تو ہم سچائی کا اظہار کر کے بُرے کیوں بنیں۔ اور پھر ہماری اوقات ہی کیا، ہم ٹھہرے سیمیناروں کے ایک سامع، ہم تو یہی چاہتے ہیں کہ ادب ترقی کرے یا نہ کرے بس سیمیناروں کا سلسلہ اسی طرح چلتا رہے، یار لوگ ادب کے نام پر کھاتے کماتے رہیں اور ہم جیسے سامعین دعوتِ طعام و دہن اڑاتے رہیں۔ ویسے پیارے قارئین ان سیمیناروں میں پڑھے جانے والے مقالات کے معیار کو دیکھ کر ہمارے دل میں بھی مقالہ نگار بننے کی خواہش انگڑائی لینے لگی ہے، کیوں کہ جب ہم اپنی نصف بہتر کو طویل اور خالص رومانی خطوط لکھ سکتے ہیں جو کہ خالص تخلیقی عمل ہے تو مقالہ کیوں نہیں لکھ سکتے۔ مقالہ لکھنا تو بہر حال آسان کام ہے، کسی خاص موضوع پر مختلف کتابیں پڑھیں، ادھر ادھر سے کچھ پیرے گراف نقل کیے اور اپنی طرف سے کچھ جملے گھٹائے بڑھائے اور سیدھے سیمینار میں پہنچ گئے۔

بہر حال وہ دن دور نہیں جب آپ ہمیں بھی سیمیناروں میں مقالہ پڑھتے ہوئے دیکھیں لیکن خدارا اس وقت یہ نہ کہیے گا کہ سیمیناروں کا معیار انحطاط پذیر ہے کیوں کہ جس چیز کا کوئی معیار ہی نہ ہو وہ انحطاط پذیر کیسے ہو سکتی ہے۔؟ ●●

غلام ربانی تاباں

۲۲۰- ذاکر نگر، نئی دہلی ۲۵

★

بستیوں میں ہو نیکو حادثے بھی ہوتے ہیں
پتھروں کی زد پر کچھ آئینے بھی ہوتے ہیں

عافیت سفینوں کی سیلِ آب میں معلوم
بات یہ ہے کچھ مانجھی سرپھرے بھی ہوتے ہیں

شہرِ آشنائی کی ریت کچھ نرالی ہے
قربتوں کے پیمانے فاصلے بھی ہوتے ہیں

گود میں بیاباں کے تشنگی بھی پلتی ہے
دور تک سرابوں کے سلسلے بھی ہوتے ہیں

دشتِ شوق میں کس کو دادِ خستگی دیجے
ہم سفر مسافر کے راستے بھی ہوتے ہیں

موجِ گل کے موسم سے موجِ خوں کے موسم تک
طے کتنی غمِ دل کے مرحلے بھی ہوتے ہیں

گردِ رہگزر تاباں تنگِ رہگزر کیوں ہو
گرد میں چھپے اکثر قافلے بھی ہوتے ہیں

پروفیسر جگن ناتھ آزاد

اے-۲۵ گورنمنٹ کوارٹرز گاندھی نگر، جموں توی-۱۸۰۰۰۴

تری دوری کا مجھ کو غم نہیں ہے
کہ فرقت میں بھی لذّت کم نہیں ہے

حجاباتِ نظر حائل ہیں ورنہ
تجلّی آج بھی کچھ کم نہیں ہے

کہاں جائے گا تیرا غم مرے بعد
مجھے اپنا تو کوئی غم نہیں ہے

زباں تیغِ رواں بننے نہ پائے
زباں کے زخم کا مرہم نہیں ہے

جنوں کی مشکلیں آساں ہیں کیونکر
خرد اس راز کی محرم نہیں ہے

بجز اک عالمِ شامِ جدائی
نظر میں اب کوئی عالم نہیں ہے

جو آنکھیں ہوں تو کس ذرّے میں آزاد
نمودِ جلوۂ پیہم نہیں ہے

قتیل شفائی

۱۹، غالب کالونی، سمن آباد لاہور۔ پاکستان

اُس کی زُلف کے سائے سائے چلا کرو
جاتے لوگو کچھ تو اپنا بھلا کرو
پیار کی آنچ نکھار کا باعث بنتی ہے
جلنا ہے تو پیار کی آگ میں جلا کرو
پیڑ یہاں کچھ سدا بہار بھی ہوتے ہیں
کوئی موسم ہو تم پھولا پھلا کرو
کوئی منظر پاؤں کی زنجیر نہیں
وادی وادی آزادی سے چلا کرو
جان بچاؤ تنگ نظر انسانوں سے
کچھ اپنا کچھ خلق خدا کا بھلا کرو
پھندا جس کو پورا آئے پھانسی چڑھے وہی
کس نے کہا تھا سامنے اپنا گلا کرو
غم کو اور بڑھاتی ہے یہ ہنسی قتیلؔ
چہرے پر یہ غازہ کم کم ملا کرو

سورج میرے دِل میں جَل رہا ہے
یہ موم کا گھر پگھل رہا ہے
اُٹھا تھا دُھواں بس اک مکاں سے
اَب شہر کا شہر جل رہا ہے
یہ شہر جو اب ہے نوحہ نوحہ
پہلے تو غزل غزل رہا ہے
اُس گھر سے ہوائیں بے خبر ہیں
جس گھر میں چراغ جل رہا ہے
اِس دھوپ میں یہ بھی ہے غنیمت
سایا میرے ساتھ چل رہا ہے
بن جائے نہ ایک روز ایندھن
یہ پیڑ جو پھول پھل رہا ہے
کیچڑ میں تو چل رہی ہے دُنیا
اور پاؤں مرا پھسل رہا ہے
سُنتے ہیں قتیلؔ، پھر سے موسیٰ
فرعون کے گھر میں پل رہا ہے

حسن نعیم

سی-۷، شالیمار، ٹونگ نگر دہسر، (ایسٹ) ممبئی-۶۸

بچھڑیں تو شہر بھر میں کسی کو پتہ نہ ہو
تم کو بھی کچھ ملال ہمیں بھی گلہ نہ ہو

مجلس کہ خواب گاہ، جہاں بھی نظر ملی
ان کو یہی تھا خوف، کوئی دیکھتا نہ ہو

جن حادثوں کی آگ سے دامانِ دل جلا
ممکن نہیں چراغِ سخن بھی جلا نہ ہو

میری غزل میں جیسا ترنم ہے سوز ہے
اکثر ہوا گماں کہ اسی کی صدا نہ ہو

ان سے الگ ہوا تو یہی فکر ہے نعیم
ان کا تپاک دھر کہیں واقعہ نہ ہو

مظفر وارثی

۲۵ ستلج بلاک علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور ۱۸ (پاکستان)

★

زندگی خواب کی طرح دیکھی
ناؤ گرداب کی طرح دیکھی
میری عریانیوں کو ڈھانپ لیا
گرد کمخواب کی طرح دیکھی
عمر بھر چھیڑتی رہی ہم کو
سانس مضراب کی طرح دیکھی
راستے کی تھکن بھی کاندھے پر
مال و اسباب کی طرح دیکھی
عشق نے اس کے راکھ کر ڈالا
برف تیزاب کی طرح دیکھی
غرق ہو ہو گئے پسینے میں
دھوپ سیلاب کی طرح دیکھی
امن کے تاجروں نے یہ دنیا
ایک قصاب کی طرح دیکھی
ہم نے زندہ دلی مظفر ہیں
اہلِ پنجاب کی طرح دیکھی

★

جب کبھی روشنی میں ہم آئے
اپنی پرچھائیوں سے ٹکرائے
ہم ہیں وہ دردناک گیت جسے
زندگی جھوم جھوم کر گائے
موتیوں کی ہمیں بھی خواہش تھی
ہم بھی دامن میں سنگ بھر لائے
غائبانہ ہے راہ و رسم اپنی
دور کے لوگ بھی ہیں ہمسائے
گفتگو ختم ہو نہیں سکتی
جتنے الفاظ اتنے پیرائے
لوٹنے لگ گئی ہیں تہذیبیں
زندگی بھی کہیں نہ مر جائے
کر گئی تار تار ہم کو ہوا
پرچموں کی طرح جو لہرائے
پیار بھی ہم کو بے پناہ ملا
اور دھوکے بھی ان گنت کھائے
کبھی رو کر سکون ملتا تھا
اب مظفر سکوں بھی تڑپائے

★

میں ہرے موسموں میں جلتا رہا
خوشبوؤں سے دھواں نکلتا رہا
آگ پر ہونٹ رکھ دیئے تھے کبھی
آخری سانس تک پگھلتا رہا
روح سے پھوٹتی رہیں کرنیں
جسم پرچھائیوں میں ڈھلتا رہا
میں اکیلا بھی کارواں کی طرح
راستوں کے بغیر چلتا رہا
حادثے مجھ کو پیش آتے رہے
اور زمانے کا جی بہلتا رہا
میری آواز منحرف نہ ہوئی
وقت کا فیصلہ بدلتا رہا
زندگی مجھ کو قتل کرتی رہی
موت کی وادیوں میں پلتا رہا
کاروبارِ سخن کیا میں نے
یا مظفر لہو اگلتا رہا

مظہر امام

۷، پرتاپ پارک فلیٹس ریڈنسی روڈ، سرینگر

★

ترے خیال کا شعلہ تھما تھما سا تھا
تمام شہرِ تمنا بجھا بجھا سا تھا

نہ جانے موسمِ تلوار کس طرح گزرا
مرے لہو کا شجر تو جھکا جھکا سا تھا

ہمیں بھی نیند نے تھپکی دی سو گئے تم بھی
تمام حادثۂ شب سنا سنا سا تھا

بلائے شام کے سائے تھے اور وادیِ دل
اگرچہ صبح کا چہرہ دھلا دھلا سا تھا

چراغِ منزلِ دل پر جلا کے کیا کرتے!
وفا کا قافلہ کب سے رکا رکا سا تھا

وہ نام جس کے لیے زندگی گنوائی گئی
نہ جانے کیا تھا، مگر کچھ بھلا بھلا سا تھا

مخمور سعیدی

۳۲۰۷، پھاٹک تیلیان ترکمان گیٹ - دہلی-۶

سینے میں کسک بن کے اُترنے کے لیے ہے ہر لمحۂ حاصل، کہ گزرنے کے لیے ہے

سنورے گا نہ اِس شام سرِ آئینہ کوئی یہ شام تو تیرے ہی سنورنے کے لیے ہے

ناموسِ گلستاں کا تقاضا سہی، کچھ بھی خوشبو تو مگر قید نہ کرنے کے لیے ہے

تم ریت میں چاہو تو اُسے کھے نہ سکو گے کشتی، جو سمندر میں اُترنے کے لیے ہے

کچھ اور نہیں، دل کی تمنّاؤں کا حاصل اِس شاخ کا ہر پھول بکھرنے کے لیے ہے

سوئی ہوئی ہر ٹیس کبھی جاگ اُٹھے گی جو زخم ہے اِس دل میں نہ بھرنے کے لیے ہے

تصویرِ غمِ دل بھی کہیں ماند پڑی ہے! مٹتا ہوا ہر نقش اُبھرنے کے لیے ہے

یہ قافلۂ عمرِ رواں راہِ طلب پر دو چار قدم چل کے ٹھہرنے کے لیے ہے

مخمورؔ! یہ دُنیا وہ رسدگاہِ اجل ہے

زندہ ہے یہاں کوئی تو مرنے کے لیے ہے

شہاب جعفری

آر پی - ۴۹ موریہ انکلیو پیتم پورہ - دہلی ۳۴

مجھکو تو پہلے کا سب سچ ، ناٹک جیسا لگتا ہے

تم کو اور کسی آغوش میں ، اکثر کیسا لگتا ہے

ہم کتنے سچے تھے ، سچ کی لاج میں جھوٹ بھی کہہ جاتے

سچ کہنا ، اُسی جھوٹ کی سوگند ، اب کیا سچا لگتا ہے

مدت بعد نگاہ ملی ، دو اکتارے جھنکار اٹھے

دو سناٹے چپ چپ پوچھیں ، اب تو مرا کیا لگتا ہے ؟!

ہاتھ دھندلکوں سے مت لہرا ، بندھن کی پتوار سنبھال

جنموں کے پاتال کے مانجھی ! گھاٹ تو ڈوبا لگتا ہے !!

باتیں بہت تھیں ! اتنے دنوں میں چیخ بنیں یا چپ کی چٹان !

اب جاؤ - یہ سنسنانا * پھر ، چیخا چیخا لگتا ہے

تیرا بُرا چاہیں پھر رو دیں - جی کو تو کیا تسکین ملے !

تم سکھ ، ہم دکھ - بٹ گیا سب کچھ - سب کچھ ادھا لگتا ہے ،

کچھ سنسان سا شور سا تھا - ہاں سپنے سب محفوظ ہیں نا ؟

ہاتھ ان آنکھوں پر رہنے دو - شور اب اچھا لگتا ہے

ہر انجان سے اپنا پا - اک انجان اُس کا اپنا تھا !

خود ہی شہاب سے مل دیکھو نا ! - پگلایا سا لگتا ہے

---

* سنسنانا - ایک اور نئے لفظ کی تخلیق اردو زبان کی بارگاہ میں نذر کر رہا ہوں - شہاب

عبدالعزیز خالد

۱۸۲-ڈی، ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی لاہور کینٹ، پاکستان

جو مستِ ذات ہو ناکردہ کار کہلاتے
کوئی زمانہ بھی دیوانے کو نہ راس آتے
نگاہِ حق میں اَنا الحق، اَنا علی الحق ہے
مگر یہ بات فقیہوں کو کون سمجھائے
تپائے خیمۂ سرمازدہ کو جیسے الاؤ
یونہی لگاؤ بھری آنکھ دل کو گرمائے
اندھیرے پاکھ میں چنگاریوں سے کھیلے چکور
کہ جیسے یادوں سے مہجور خود کو بہلائے
مزے بھی ہم نے اٹھائے وصال راتوں کے
فریبِ وعدۂ بوس و کنار بھی کھائے
لگے چُرانے غزالانِ خوش نظر آنکھیں
یہ دن بھی ایک دن آنے تھے ہم پہ، سو آئے

زمیں نژاد ہیں لیکن زماں میں رہتے ہیں
مکاں نصیب نہیں لامکاں میں رہتے ہیں
سوادِ سود مبارک ہو اہلِ حرفت کو
ہم اہلِ حرف فراخ زباں میں رہتے ہیں
پڑوس اپنوں کا، اپنا ہی شہر ہے لیکن
لگے کہ جیسے زدِ دشمناں میں رہتے ہیں
وہ ڈول ڈالیں کسی کارِ پائیدار کا کیا
جو بے ثباتیٔ عمرِ رواں میں رہتے ہیں
ہم ایسے اہلِ چمن گوشۂ قفس میں بھی
حسابِ خار و خسِ آشیاں میں رہتے ہیں
نہ بود و باش کو پوچھو کہ ہم فقیر منش
سخن کے معبدِ بے سائباں میں رہتے ہیں
کہاں تلاش کرو گے ہمیں کہ ہم تو مدام
حضوریٔ دلِ بے خانماں میں رہتے ہیں
نشے کی لہریں خُمِ خُم لنڈھا کے آبِ حیات
سرابِ زندگیٔ جاوداں میں رہتے ہیں
نئی محبتیں خالد! پرانی دوستیاں
عذابِ کشمکشِ بے اماں میں رہتے ہیں!

ڈاکٹر بشیر بدر
شعبۂ اُردو، میرٹھ یونیورسٹی میرٹھ

مری زندگی کبھی مری نہیں یہ ہزار خانوں میں بٹ گئی
مجھے ایک مٹھی زمین دے یہ زمین کتنی سمٹ گئی

مجھے لکھنے والا لکھے کبھی کیا مجھے پڑھنے والا پڑھے کبھی کیا
جہاں میرا نام لکھا گیا وہیں روشنائی اُلٹ گئی

تری یاد آئے تو چپ رہوں جو میں چپ رہوں تو غزل کہوں
یہ عجیب آگ کی بیل تھی مرے تن بدن سے لپٹ گئی

مری بند پلکوں پہ ٹوٹ کر کوئی پھول رات بکھر گیا
مجھے سسکیوں نے جگا دیا مری کچی نیند اچٹ گئی

وشوا ناتھ درد

۲/۲۶۸ پشچم پوری، نئی دہلی ۱۱۰۰۶۳

★

در کھلا جب بھی کسی فریاد کا
چھڑ گیا چرچا تری بیداد کا
یوں کسی کی یاد آکر چھو گئی
جیسے عنواں ہو کسی رُوداد کا
کیا کریں اپنی اسیری کا گلہ!
کھٹکھٹایا ہم نے در صیّاد کا
دیر تک سکتے کے عالم میں رہے
جب خیال آیا دلِ ناشاد کا
ہر طرف دیوار بے مہری ملی
کس جگہ سر پھوڑتے فریاد کا
آج تک زندہ رہا احساسِ غم
ہے کرم یہ بھی کسی کی یاد کا
اپنی بربادی پہ رونا آگیا
حشر دیکھا جب کسی برباد کا

پروفیسر عنوان چشتی

بی-۱۱۷، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

دشت کو گلزار صحرا کو سمندر دیکھتا
کیا عجب دیوانہ تھا وہ خواب اکثر دیکھتا

کیا مزہ آتا، سرِ مقتل یہ منظر دیکھتا
میری صورت دیکھ کر، وہ اپنا خنجر دیکھتا

زندگی میں جو بھی کچھ ہے وہ یقیں کا نور ہے
کوہ ساروں کے عقب میں کون لشکر دیکھتا

محو تو میں بھی خود اپنے دل میں ہوں اس کی طرح
کاش وہ میری طرح گاگر میں ساگر دیکھتا

دور سے دھندلا نظر آتا ہے چہرہ شوق کا
کاش وہ دل کو، مری آنکھوں میں چھپ کر دیکھتا

زندگی کیا ہے، حقیقت خیز خوابوں کا سفر
پھول کھل جاتے وہ انگاروں پہ چل کر دیکھتا

اس کی تو گوشہ نشینی پر نہ اتنا طنز کر
اس سے وہ ملتا، جسے اپنے برابر دیکھتا

آشکار اس پر بھی ہو جاتی حقیقت عشق کی
وہ کبھی میری طرح شبنم سے جل کر دیکھتا

اس کو پانا تھا جو اے عنواںؔ رازِ زندگی
صرف تحریریں نہیں، چہروں کو پڑھ کر دیکھتا

غلط ہے یہ کہ تو شبنم ہے یا شرارہ ہے
ترا جمال محبت کا استعارہ ہے

شکن شکن ہی سہی میری روح کی چادر
یہ تیرا "شیش بدن" بھی تو پارہ پارہ ہے

ورق ورق ترے چہرے کو یوں پڑھا جائے
نئی کتاب ہے جیسے نیا شمارہ ہے

وہ حادثہ تو الگ ہے کہ گھر نہیں سالم
بدن پہ درد کی چادر بھی پارہ پارہ ہے

بدن کا رنگ بھی ہے روح کی علامت بھی
کتابِ عشق تو فطرت کا گوشوارہ ہے

نگاہ سے نہیں ہونٹوں سے اس کو پڑھنا ہے
"کتاب چہرہ" تمنا کا گوشوارہ ہے

فقیرِ عشق سے ملیو ضرور دلّی میں
وہ ایک شخص نہیں مستقل ادارہ ہے

باوا کرشن گوپال مغموم

کوٹھی نمبر ۱۳۱۷، سیکٹر نمبر ۱۸ بی، چنڈی گڑھ ۱۶۰۰۱۸

★

حُسن کی جنتِ گل فام کہاں سے لاؤں
پیار کی خلوتِ آرام کہاں سے لاؤں

گھر میں اک اُن کے نہ ہونے سے ہے ہُو کا عالَم
گنگناتے سے در و بام کہاں سے لاؤں

وقت نے سینۂ ماضی میں جنھیں دفن کیا
میں وہ رنگیں سحر و شام کہاں سے لاؤں

جن سے مہکا تھا کبھی عہدِ جوانی میرا
وہ مہکتے ہوئے پیغام کہاں سے لاؤں

صحبتِ شاہدِ فطرت کے وہ لمحاتِ فراغ
اے مری گردشِ ایّام! کہاں سے لاؤں

کنجِ گلشن میں گل و لالہ کو پہروں تکنا
آج وہ عشرتِ بے نام کہاں سے لاؤں

گیسوئے یار کی خوشبو میں نہائی، مغموم
لب و رخسار کی وہ شام کہاں سے لاؤں

★

ابھی فرقہ پرستی نت نئے فتنے اُٹھائے گی
ابھی دہشت پسندی خونِ انسانی بہائے گی

سمجھ لیں گے ہماری منزلِ مقصود آ پہنچی
ہماری کشتیِ عمرِ رواں جب ڈگمگائے گی

ہمیں بدنام کر دے گا نفاقِ باہمی اپنا
کہانی اپنی ذلت کی لبِ عالم پہ آئے گی

اندھیرا ہے ابھی ہر دل میں نفرت کا، عداوت کا
خُدا جانے محبت کب دلوں میں جگمگائے گی

مصائب کی بھیانک آندھیوں نے ہم کو گھیرا ہے
مگر ناپید ہے تدبیر جو ہم کو بچائے گی

ہمیں بیگانہ ہو بیٹھے ہیں جب اوصافِ انساں سے
خُداوندا! تری رحمت بھی ہم سے مُنہ چھپائے گی

سیاست اور مذہب کو ملانے والے مت بھولیں
وطن کی سالمیت کو یہ سازش چاٹ جائے گی

سبھی اشجارِ گرد و پیش جھوم اٹھیں گے مستی میں
ہماری بانسری مغموم! جب تانیں اڑائے گی

★

اے دل! ہر ایک غم کا اندھیرا مٹا کے دیکھ
اک بار تو چراغِ محبت جلا کے دیکھ

خوشبو سے جس کی باغِ سخن عطر بار ہو
شاعر ہے تو تو پھول اک ایسا کھلا کے دیکھ

اے حسن! میں بھی عشق کا اک شاہکار ہوں
گر پاس آ کے دیکھ، کبھی دور جا کے دیکھ!

دیکھے گا تو کہ غیر بھی ہے دوستی میں فرد
ممکن جو ہو تو غیر کو اپنا بنا کے دیکھ

نغماتِ آتشیں مرے دل سے اُبل پڑیں
اے حسن! مجھ پہ برق اک ایسی گرا کے دیکھ

فن کو مرے پرکھ، مگر اے ناقدِ سخن
پردہ تعصباتِ نظر کا اٹھا کے دیکھ

مغموم! فکرِ شعر سے فرصت اگر ملے
فطرت کی جلوہ گاہِ طرب میں بھی جا کے دیکھ

کمال احمد صدیقی

بلاک نمبر ۲ اولڈ کیمپس جواہرلال نہرو یونیورسٹی نئی دہلی ۶۷-۱۱۰۰

★

شراب خانہ ترا ایسا انتخاب نہیں ہے
خواص پیتے ہیں، سب کے لئے شراب نہیں ہے

تو اپنے منصبِ ساقی گری کی لاج بھی رکھ کچھ
عجب نظام ہے میخانہ کا شراب نہیں ہے

شکار ظلم کا جو ہیں اُنھیں پہ ہے ہر شدّت
وہ جو ہیں ظالم اُن پر کوئی عتاب نہیں ہے

یہ تیرا فرض ہے ساقی، ملے سبھی کو برابر
ہے تیرا منصب ساقی، کوئی خطاب نہیں ہے

یہاں تو کوئی نہیں آدمی، سبھی ہیں فرشتے
مرے علاوہ یہاں کوئی بھی خراب نہیں ہے

فروغِ کیفیتِ بادہ سے ہوا ہے یہ شاداب
نہ پڑھ یہ چہرہ مرا، یہ کوئی کتاب نہیں ہے

سراب، واہمہ، نظروں کے سامنے موجود
دھڑک رہا ہے جو ادراک میں سراب نہیں ہے

کمالؔ جبر وہ ہے، جس کا سدِّ باب نہیں ہے
اور اس کو سہتے رہیں، اس کی ہم میں تاب نہیں ہے

ق

نظام بدلے، تو بدلے گا دورِ دردو محن
علاج اس کا بجز ایک (انقلاب) نہیں ہے

مغیث الدین فریدی

ڈی-۱۳، ریڈرس لائنز یونیورسٹی کیمپس دلّی یونیورسٹی دہلی ۱۱۰۰۰۷

گھر سے جب باہر قدم نکلے تو یہ منظر ملے
راہ میں نیزے ملے، نیزوں کے اوپر سر ملے

گھر میں جب تک بند تھے ہر در میں اک دیوار تھی
گھر سے باہر آئے تو دیوار میں بھی در ملے

ہر جگہ بیداریِ احساس کام آتی رہی
دشت میں کانٹے چبھے تھے شہر میں پتھر ملے

جسم پر آنے نہ دی ہم نے کبھی کوئی خراش
زخم جب دُنیا نے ڈھونڈے روح کے اندر ملے

اُن کو چھو لینے کی حسرت دل ہی دل میں رہ گئی
رنگ بن کر سامنے آئے مہک بن کر ملے

سوز بن کر جو فریدیؔ رُوح میں پیوست ہے
کاش اُس احساس کو بھی لفظ کا پیکر ملے

ملتی ہے نظر اُن سے تو کھو جاتے ہیں ہم اور
منزل کے قریب آ کے بہکتے ہیں قدم اور

مارے ہوئے ہیں کشمکشِ وہم و یقیں کے
ٹوٹے ہوئے ہر بُت سے تراشے ہیں صنم اور

یہ بات سمجھتے ہی نہیں حضرتِ ناصح
سِلتا ہے اگر چاک تو کھُلتا ہے بھرم اور

تدبیر کا ہر نقش دل آویز ہے لیکن
ہے کاتبِ تقدیر کا اندازِ رقم اور

جذبات پہ مہریں نہ لگی ہیں نہ لگیں گی
ہوتی ہے زباں بند تو چلتا ہے قلم اور

شاید یہ صِلہ ترکِ طلب کا ہے فریدیؔ
بڑھتی ہی گئی وُسعتِ دامانِ کرم اور

پروفیسر حامدی کاشمیری

شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی حضرت بل سرینگر

نگاہِ شوق کیوں مائل نہیں ہے
کوئی دیوار اب حائل نہیں ہے
سحر دم ہی گھروں سے چل پڑے سب
کوئی جادہ، کوئی منزل نہیں ہے
سبھی کی نظریں ہیں کشتی کے رخ پر
مگر اس بحر کا ساحل نہیں ہے
کریں کس سے توقع منصفی کی
کوئی ایسا ہے جو قاتل نہیں ہے

شنا سائے حقیقت ہو گئے ہیں
وہ سب تصویرِ عبرت ہو گئے ہیں
دکھاتے ہیں وہ رستہ قافلوں کو
جو محرومِ بصارت ہو گئے ہیں
فصیلِ شہر کے اندر نہ جانا
وہ سارے گرگ صورت ہو گئے ہیں
فروزاں ہیں الاوے ساحلوں کے
اسیرِ موجِ ظلمت ہو گئے ہیں
جبینوں پر رقم آیاتِ شفقت
قتیلِ تیغِ نفرت ہو گئے ہیں

ظفر گورکھپوری

اے/۲-۳۰۲- فلور ینڈا، شاستری نگر اندھیری (ویسٹ)، بمبئی ۵۸ ۰۰۰ ۴

★

نوکِ قلم کا شہد نہ چھوٹا، مدت ہوئی جنابی چھوٹے
کاغذ پر تہذیب بچی ہے، کیسے خوش القابی چھوٹے

مٹھی دو مٹھی پر چھائیں اور چھپالیں آنکھوں میں
کیا جانے کس موڑ پہ آ کر، ہم سے خانہ خرابی چھوٹے

دن بیوہ کے آنچل جیسا پژ مردہ، بے رنگ اداس
رات آتے ہی قریۂ جاں میں یادوں کی مہتابی چھوٹے

ایک اسی مخلص کے دم سے لگتا ہے ہم زندہ ہیں
یارب ایسا وقت نہ آئے جب دل سے بے تابی چھوٹے

دریا تیری گود کشادہ، ندی تیری بانہہ بڑی
بات اپنی پہچان کی ٹھہری، جھیل سے کیوں مرغابی چھوٹے

وقتِ سفر ہے، اپنے لہو کی خوشبو اپنے ساتھ رکھو
جانے کب منظر کھو جائیں، جانے کب شادابی چھوٹے

محسن زیدی

۱۷۷- راؤز ایونیو، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

★

وہ موت کا منظر جو تھا دن رات وہی ہے
منہ سے نہ کہو صورتِ حالات وہی ہے

لفظوں کے الٹ پھیر سے بدلے گا نہ مطلب
امداد جسے کہتے ہو خیرات وہی ہے

گل کرنا چراغوں کا تو اک کھیل ہے اس کا
واضح ہے پسِ پردۂ ظلمات وہی ہے

زنجیر میں موسم کی ہیں جکڑے ہوئے دن رات
سردی وہی گرمی وہی برسات وہی ہے

ہم نے تو اسی طرح گزارے ہیں شب و روز
اپنے لئے ہر دن وہی ہر رات وہی ہے

کچھ میرے ہی مانند ہے طرزِ سخن اس کا
اندازِ اشارات و کنایات وہی ہے

دونوں ہی طرف آگ برابر کی ہے محسن
دونوں ہی طرف گرمئ جذبات وہی ہے

ناصر زیدی

پوسٹ بکس نمبر ۸۸۔ راولپنڈی پاکستان

★

تم تو اوروں پہ نہ پتھر پھینکو
آئینہ خانوں میں رہنے والو!
کچھ تو ہو صورتِ تجدیدِ وفا
میں بھی سوچوں ذرا تم بھی سوچو
میں بہر حال تمہارا ہوں، مگر
کاش! تم بھی مجھے اپنا سمجھو
نہ سنو ٹوٹے ہوئے دل کی صدا
دو گھڑی پاس تو آکر بیٹھو
کھول کر بند دریچہ ناصر!
ڈوبتے چاند کا منظر دیکھو

شاہد ماہلی

کے ۲۰۔ سی، شیخ سرائے فیز II نئی دہلی ۱۱۰۰۱۷

مہتاب کو دھمکایا ہے سورج سے لڑا ہے
وہ شخص سرِ راہ جو خاموش کھڑا ہے
پگھلا ہے مِرے کانوں میں الفاظ کا سیسہ
احساس کا خنجر مِرے سینہ میں گڑا ہے
لاشوں کے سوا، شہر میں ہر چیز گراں ہے
اس وقت نہ آؤ کہ یہاں قحط پڑا ہے
محسوس یہ ہوتا ہے مجھے کھڑکی پہ ہر رات
سایہ سا کوئی زلف کو بکھرائے کھڑا ہے
لکھا ہے مِرا نام زمانے کی جبیں پر
دیوار پہ کیلوں سے مِرا جسم جڑا ہے

مشتاق احمد قریشی

۲۴- سعید منزل، آئی آئی چندریگر روڈ کراچی۔ پاکستان

★

مجھ پر جو کرم ہیں کہیں پاتے نہیں جاتے
مولا ترے احسان گناتے نہیں جاتے

اُلفت سے بھرا دل ہے، پیاسی ہیں نگاہیں
ہر آنکھ کو انوار دِکھاتے نہیں جاتے

ہوں محوِ تماشائے رُخِ یار کچھ ایسے
کھوئے ہوئے مجھ سے کہیں پائے نہیں جاتے

حالانکہ ہے ساقی بھی، مئے ہوش رُبا بھی
بے تشنہ لبی جام پلاتے نہیں جاتے

خود بڑھ کے لبوں تک مرے آتا ہے ترا جام
وہ مست ہوں خود ہاتھ بڑھاتے نہیں جاتے

بے شیشہ و بے جام ہی پی جاتے ہیں ہم مست
ہونٹوں سے تو یہ جام لگائے نہیں جاتے

مجبور ہوں بے پر ہوں تو کیا جذبِ محبت
تجھ سے کبھی پر شوق لگاتے نہیں جاتے

کچھ مصلحتِ شوق تھی یا رازِ محبت
انسان تو سرِ عرش بلاتے نہیں جاتے

تیری چاہت دل میں بسائے کتنا زمانہ بیت گیا
یاد کا تیری دیپ جلائے کتنا زمانہ بیت گیا

دید کو ترسی میری آنکھیں ایک جھلک بھی دیکھ نہ پائیں
تیری گلی میں دھونی رمائے کتنا زمانہ بیت گیا

ڈھونڈ رہا ہوں تجھ کو کب سے کون بتائے تیرا پتہ اب
آنکھوں میں اپنی تجھ کو چھپائے کتنا زمانہ بیت گیا

اشکوں کی برسات میں ڈوبے ایسے ہم خاموش ہوئے
خشک ہیں آنکھیں آنسو بہائے کتنا زمانہ بیت گیا

سائل ہوں میں اور در پہ تیرے آن کھڑا ہوں
دِل کو تھامے، ہاتھ اُٹھائے کتنا زمانہ بیت گیا

درد کی لذت اتنی بڑھی کہ زخمِ جُدائی بھول گیا
آپ ہنسے اور تجھ کو ہنسائے کتنا زمانہ بیت گیا

اشرف جاوید

پوسٹ بکس ۱۸۱، جنرل پوسٹ آفس لاہور پاکستان

بات کرتا ہے کہ خوشبو کو بدن دیتا ہے

اُس کا لہجہ تو گلابوں کو دہن دیتا ہے

چُبتا رہتا ہے پسِ خواب بھی خوابوں کی مہک

سارِ بے سار کو پیراہنِ فن دیتا ہے

گونج اُٹھتا ہے اُسے چھو کے طلسماتِ سکوت

دشتِ امکاں کی ہواؤں کو چلن دیتا ہے

اُس کی آنکھوں میں مسافت کی دھنک روشن ہے

دیکھ لیتا ہے تو عمروں کی تھکن دیتا ہے

نارسائی کی حدوں سے بھی پرے ہے اشرفؔ

پھر بھی وہ خون کو قندیلِ سخن دیتا ہے

منوّر رانا

۲۱- زکریا اسٹریٹ کلکتہ-۷۰۰۰۷۳

میں اس کو چھوڑ نہ پایا بری لتوں کی طرح

وہ میرے ساتھ ہے بچپن کی عادتوں کی طرح

ہنسا ہنسا کے رلاتی ہے رات دن دنیا

سلوک اس کا ہے عیّاش عورتوں کی طرح

وفا کی راہ ملے گی اسی تمنّا میں

بھٹک رہی ہے محبت بھی اُمتوں کی طرح

متاعِ درد لٹی تو لٹی یہ دل بھی کہیں

نہ ڈوب جائے غریبوں کی اُجرتوں کی طرح

یہاں یہ دفن ہیں معصوم خواہشیں راناؔ

ہمارا دل بھی ہے بچّوں کی تربتوں کی طرح

معافی

میرزا ادیب

لالۂ صحرا۔ چوہان روڈ۔ کرشن نگر۔ لاہور (پاکستان)

اب تو یہ رواج نہیں رہا یا بہت حد تک ختم ہو گیا ہے کہ کسی گھر میں کوئی بیمار پڑ جاتا تھا یا صحت یاب ہوتا تھا تو محلّے کے بچوں کو بلا کر انھیں میٹھے چاول کھلائے جاتے تھے یا ہر ایک بچے کو ایک ایک دو دو پیسے دیے جاتے تھے۔ مٹھی بھر "مرونڈا" بھی ہر بچے کی جھولی میں ڈال دیا جاتا تھا۔ 'مرونڈا' گندم کے میٹھے دانوں کو کہتے ہیں۔ بنایا اس طریقے سے جاتا تھا کہ گڑ کی خاص مقدار کو کسی برتن میں پگھلا کر اس کے اندر حسبِ ضرورت گندم کے دانے ڈال دیے جاتے تھے۔ اسی طرح یہ دانے میٹھے ہو جاتے تھے اور بچے انھیں بڑے شوق سے کھاتے تھے۔

کچھ زیادہ مدت نہیں گذری کہ لاہور کی گلیوں میں ایسی آوازیں گونجا کرتی تھیں۔ بالو، کڑیو! ونڈی دے پیسے لے لاو یا بالو! کڑیو! میٹھے چاول کھا لو" مطلب ان آوازوں کا یہ رہتا تھا کہ گلی محلّے کے بچے ایک خاص گھر میں آ کر پیسے لے لیں یا میٹھے چاول کھا لیں۔ موجودہ دور میں شاذ و نادر ہی کوئی ایسی آواز سنائی دیتی ہے۔

وہ ایک شام تھی اور میں بڑا خوش تھا کیونکہ میری جھولی میں ڈھیر سارا مرونڈا پڑا تھا۔ مرونڈا مجھے بڑا لذیذ لگتا تھا۔ بڑے شوق سے کھاتا تھا۔ کوشش یہ ہوتی تھی کہ کہیں سے جتنا مرونڈا ملا۔ اپنی بہنوں کو کچھ دیے بغیر سارے کا سارا خود کھا لوں اور اس شام زیادہ خوشی کی وجہ یہ بھی تھی کہ بہنوں کی اپنی جھولیاں مرونڈے سے بھری رہتی تھیں اور میرا مرونڈا صرف میرے لیے تھا۔

ہماری گلی کے مکانوں میں دیے جل چکے تھے۔ لالٹینیں روشن ہو گئی تھیں۔

وہ شام جلدی اپنے ساتھ اندھیرا لے کر نہیں آ گئی تھی۔ اِدھر اُدھر قدرے روشنی نظر آ رہی تھی۔ میں نے مرونڈا تو جھولی سے نکال کر مٹی کے اس بڑے پیالے میں ڈالا جس میں میری امّی کبھی کبھی دوپہر کا بچا ہوا سارا سالن ڈال دیتی تھیں کہ رات کو کھانے کے کام آئے اور ہانڈی دھو کر الگ رکھ دیتی تھی۔ پیالہ لے کر میں کوٹھری میں چلا گیا کہ مزے سے کھاؤں گا اور دادا جان کی کتابیں بھی دیکھتا رہوں گا۔ یہ میرے لیے بڑا دلچسپ اور من پسند شغل ہوتا تھا۔

ان دنوں دادا جان کی کتابوں کا صندوق کوٹھری ہی میں رکھا جاتا تھا اور میں یا میری کوئی بہن وہیں جا کر کوئی کتاب نکال کر اس کی ورق گردانی کیا کرتی تھی۔ کتابوں میں آدھے سے زیادہ قلمی نسخے تھے اور کچھ چھپی ہوئی کتابوں میں تصویریں بھی تھیں۔ ہماری زیادہ دلچسپی انہی تصویروں والی کتابوں سے وابستہ تھی۔

میں نے نصف کے قریب مرونڈا کھا لیا۔ پھر پیالے کو ایک طرف رکھ کر صندوق کھولا۔ اس میں سے ایک کتاب نکالی۔ اس کتاب میں سب سے زیادہ تصویریں تھیں۔ پہلا ہی صفحہ پلٹا تو جو تصویر سامنے آئی اس میں ایک پیڑ کے نیچے ایک باریش آدمی کو دکھایا گیا تھا جو تنے سے اپنی پشت لگائے، ہاتھ میں چھڑی پکڑے کھڑا تھا۔

میں نے اس تصویر کو بارہا دیکھا تھا۔ اس شام نہ جانے کیا بات تھی کہ نظریں اس تصویر سے ہٹتی ہی نہیں تھیں۔ یہ تصویر مجھے بڑی بھلی لگ رہی تھی۔ چوڑی پیشانی۔ سر پہ گھنے بال۔ ٹھوڑی پر چھوٹی سی سیاہ داڑھی۔ آنکھیں چمکتی ہوئی سی۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ پہلی نظر ہی میں چہرے پر چھائے ہوئے تقدس کا احساس ہو جاتا تھا۔

میں کئی لمحے متواتر اسے دیکھتا رہا۔ اچانک میرے ذہن کے پردے پر وہ نقوش اُبھر آئے جو دادی اماں نے دادا جان کا ذکر کرتے ہوئے کئی بار سنائے تھے۔ میں ایک مبہم سی خواہش کے زیرِ اثر تصویر کے خد و خال اور دادی اماں کے بتائے ہوئے دادا جان کے چہرے کے نقوش میں مشابہت ڈھونڈنے لگا اور جس طرح بارش کے دوران فضا کی بلندی پر بجلی چمک اٹھتی ہے میرے دل میں یہ خیال جگمگا اٹھا کہ تصویری خد و خال اور دادا جان کے نقوش میں بڑی مشابہت ہے۔

کتاب میرے ہاتھ سے گرتے گرتے بچی۔ میرے اندر ایسی پُراسرار کیفیت در آئی جسے لفظوں میں بیان کرنا میرے لیے آج بھی اسی قدر مشکل ہے جتنا اس زمانے میں مشکل تھا۔ یہ ایک قسم کی مرعوبیت کی کیفیت تھی۔ یوں لگا جیسے میں اپنے قریب دادا جان کو دیکھ رہا ہوں۔

اس وقت یہی جی چاہا کہ کوٹھری سے نکل کر بھاگ جاؤں اور میں اسی لمحے باہر آگیا۔

امّی روٹیاں پکانے کے لیے چولہے میں آگ جلا رہی تھیں۔ چولہے میں دو تین لکڑیوں کے سروں پہ ہلکے سے شعلے دھواں اگل رہے تھے۔ بہنیں پیڑیوں پر بیٹھی تھیں اور مزے لے لے کر مرونڈا کھا رہی تھیں۔

میں وہاں ایک طرف مونڈھے پر بیٹھ گیا۔ امّی نے توا چولہے کے اوپر رکھنے کے بعد میری طرف دیکھا۔ یہ ایک سرسری سی نظر تھی۔ ان کے لیے یہی جان لینا کافی تھا کہ میں کوٹھری سے نکل کر ان کے پاس آگیا ہوں اور اب سب کے ساتھ مل کر روٹی کھاؤں گا۔

"امّی! پتا ہے "دادے" نے دوبارہ مرونڈا لیا تھا۔ ہمیں ایک ایک بار ملا تھا۔" میری بہن زبیدہ نے شکایتاً کہا۔ بہنیں مجھے 'دادا' کہتی تھیں۔

"دادا! بری بات! ماسی شیداں کو پتا چلا تو بہت برا مانے گی۔"

یہ بات اوپر بتانا چاہیے تھی کہ اس روز مرونڈا ماسی شیداں نے اپنے پوتے کی شفایابی کی خوشی میں بانٹا تھا اور وہ معمول کے مطابق ہر بچے کی جھولی میں ایک ایک مٹھی مرونڈے کی ڈال رہی تھیں۔ میں دو مرتبہ ان کے سامنے چلا گیا تھا۔ بے دھیانی میں انھوں نے مجھے دو مرتبہ مرونڈا دے دیا تھا۔

کھانے سے فارغ ہو کر سب بانو اپنی چارپائیوں کی طرف چلے گئے یا اپنے اپنے کام کرنے لگے۔ اباجی جلد سو جانے کے عادی تھے۔ وہ حقّہ پی کر آہستہ آہستہ خود کو نیند کے حوالے کر دیتے تھے۔ امّی سلائی کے لیے کوئی کپڑا لے کر بیٹھ جاتی تھیں اور میں ڈیڑھ دو گھنٹے کتاب پڑھتا رہتا تھا۔

اس رات امّی دیر تک کوئی کپڑا سینے کی بجائے برتن مانجھتی رہیں اور میں ہاتھ میں کتاب لیے لیٹا رہا۔ فارغ ہوئیں تو مشین کے سامنے پیڑھی کے اوپر بیٹھ گئیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اب ان کا وہ کام شروع ہونے والا تھا جسے انھوں نے اپنا معمول بنا رکھا تھا۔ ادھر میری حالت یہ تھی کہ کتاب کا ہر صفحہ پڑھنے کے بعد مجھے دادا جان کی اس کتاب کا خیال آجاتا تھا جس کی ایک تصویر کے خدوخال اور دادا جان کے چہرے کے نقوش میں میں نے بڑی مشابہت پائی تھی۔

عین اس وقت کہ میں نے ابھی آدھا صفحہ ہی پڑھا تھا کہ امّی کی آواز آئی۔

"دادا!"

میں نے کتاب کے صفحے سے نظریں ہٹا کر انھیں دیکھا۔ انھوں نے ایک ہاتھ میں قینچی پکڑ رکھی تھی۔

"جی امّی!"

"بات کیا ہے پتر!"

"کتاب پڑھ رہا ہوں امّی!"

امّی مسکرائیں۔ "دادا! کتاب اس طرح تو نہیں پڑھی جاتی۔" یکلخت میرے ذہن میں یہ خیال ابھرا کہ امّی نے میری کیفیت کا اندازہ لگا لیا ہے۔ میں نے ٹالنے کے لیے کہہ دیا۔

"امّی! کہانی اچھی نہیں ہے۔"

"اچھا؟" ان کا لہجہ سوالیہ تھا۔

وہ جانے لگیں مگر جاتے جاتے رک گئیں۔

"دادا!" انھوں نے پھر مجھے مخاطب کیا۔

میں اٹھ کر بیٹھ گیا تھا اور کتاب ہاتھ سے رکھ دی تھی۔

وہ خاموشی سے میری طرف دیکھ رہی تھیں —— جیسے یہ سوچ رہی ہوں کہ جو کچھ وہ کہنا چاہتی تھیں اس کے لیے مناسب الفاظ کیسے ہونے چاہئیں۔ دو تین لمحوں میں انھوں نے لفظوں کا انتخاب کر لیا تھا۔

"دادا! تمھارے دادا جان کو تمھاری اس حرکت کا پتہ چلتا تو وہ ——"

فقرہ انھوں نے مکمل کیے بغیر چھوڑ دیا۔ ظاہر ہے انھوں نے فقرہ مکمل کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

"آئندہ خیال رکھنا پتر!" یہ کہہ کر وہ واپس اپنی پیڑھی پر بیٹھ گئیں۔ "اب سو جاؤ۔ صبح اسکول جانا ہے۔" انھوں نے پیڑھی پر بیٹھنے کے بعد مشین کی ہتھی گھماتے ہوئے کہا۔

اباجی جاگ اٹھے تھے۔ انھیں حقّے کی طلب ہوئی۔ امّی جلدی سے چلم لے کر چلی گئیں۔

بعد میں امّی اور اباجان کے درمیان کچھ باتیں ہوئیں جنھیں میں بالکل نہ سن سکا۔ میرے ذہن میں ایک سوچ جاگ اٹھی تھی جس نے مجھے بیقرار سا کر دیا تھا۔

"امّی یہی کہنا چاہتی تھیں ناکہ دادا جان کو تمھاری اس حرکت پر دکھ ہوتا۔ میں نے دادا جان کو دکھ دیا تھا۔"
میں اپنی اس حرکت پر متاسف تھا لیکن سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کروں تو کیا کروں۔"
اسکول میں بھی یہی سوچ میرے ذہن کو اُلجھاتی رہی۔ اس روز میری کوشش یہ رہی کہ اپنے دوستوں سے الگ تھلگ رہوں اور میں قریب قریب الگ تھلگ ہی رہا۔
میں نے ایک واقعہ سنا تھا۔ یہ واقعہ میرے ایک دوست اکبر نے مجھے سُنایا تھا۔
موہن لال ہمارے محلّے کا ایک نرباف تھا۔ اس کے اپنے بیٹے سوہن لال سے لڑائی ہو گئی تھی۔ سوہن لال اپنی نوکری کے سلسلے میں امرتسر گیا اور جب واپس آگیا تو باپ بیٹے میں صلح ہو چکی تھی۔ پتا چلا کہ سوہن لال نے امرتسر سے اپنے باپ کو ایک خط لکھا جس میں ان سے معافی مانگ لی تھی۔
یہ واقعہ مجھے یاد آگیا اور میں نے سوچ لیا کہ دادا جان سے مافی مانگ کر انھیں راضی کرلوں گا۔ مگر دادا جان ہیں کہاں جو ان سے معافی مانگوں گا۔ دماغ میں یہی خیال چھایا ہوا تھا جب میں کوٹھری کے اندر چلا گیا تھا۔
کافی دیر سوچنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچ گیا۔ اٹھا۔ اپنی دوات، قلم اور کاپی لے کر واپس آگیا۔ کاپی کا ایک ورق پھاڑ کر اس پر لکھا۔ "دادا جان! میں اپنی حرکت پر شرمندہ ہوں۔ مجھے صاف کر دیں" اور اس سطر کے نیچے اپنا نام دلاور علی لکھ دیا۔
سیاہی گیلی تھی۔ میں نے چند لمحے کاغذ کو لہرایا۔ جب سیاہی سوکھ گئی تو کاغذ کو لپیٹ کر دادا جان کی کتابوں والے صندوق سے وہ کتاب نکالی جس میں ان کی مشابہت والی تصویر دیکھی تھی۔ تہہ کیا ہوا کاغذ میں نے تصویر کے نیچے رکھ دیا۔ کتاب بند کی اور اسے اپنی گود ہی میں پڑے رہنے دیا۔
کئی منٹ گذر گئے اور میں اسی عالم میں بیٹھا رہا۔
میں نہیں کہہ سکتا کہ کیسے میرے ہاتھوں کو جنبش ہوئی اور کیسے میں نے کتاب کھولی۔
تصویر میری آنکھوں کے سامنے تھی اور ایک دم یوں لگا کہ وہ چہرہ مسکرا رہا ہے۔
میرے اندر ایک پُر سرور خوشی کے سوتے پھوٹنے لگے۔ میں کتاب رکھ کر تیزی سے باہر آیا۔ امّی آٹا گوندھ رہی تھیں۔ میں بے اختیار بول اٹھا
"امّی! دادا جان نے مجھے معاف کر دیا ہے۔"
امّی پہلے تو حیران ہو گئیں پھر مسکرا کر اپنا سر ہلانے لگیں۔

●●

کہانی دراصل ایک ندی ہے جو اپنے نشیب پر آپ ہی آپ بہتی چلی جاتی ہے اور اِس بہاؤ کے دوران آگے پیچھے ہونے کے باوجود اوّل تا آخر ایک ساتھ بھی ہوتی ہے اور اِسی طرح پڑھنے والے کے دل و دماغ میں اتر آتی ہے۔ اور یہیں اپنا سفر طے کرتے ہوئے اس کے شعور میں ڈوب جاتی ہے۔ پڑھنے والے کو اگر تنقید کی دعویٰ داری ہو تو وہ سورج کی شعاعوں میں روپوش ہو کر ندی کو کھارے پانیوں سے بوند بوند اڑا لیتا ہے اور پھر جب موسلا دھار برستا ہے تو ندی ایک انوکھی بہار لیے پھر چڑھ آتی ہے۔ نقّاد کے اِس تخلیقی منصب کے پیشِ نظر اسے وشنو بھگوان سے منسوب کیا گیا ہے جو شعور کے سمندر میں سیس ناگ کی سیج پر سے کائناتی روابط پر نظر رکھے ہوتا ہے۔ تخلیق کار جہاں اپنی تخلیق کے اسباب کا جویا ہوتا ہے، وہاں نقّاد ان اسباب کے سراغ میں لگا ہوتا ہے۔ ادبی تنقید کا یہی رول اسے تخلیق کا اعتبار عطا کرتا ہے۔"

(جوگندر پال)

پُرانے باغ کا راستہ

اے حمید

این-۴۵۴-راہ چمن-سمن آباد-لاہور (پاکستان)

ایک مدّت کے بعد تمہیں خط لکھ رہا ہوں۔

تم کولمبو چھوڑ کر لاہور چلے گئے اور میں بمبئی چلا آیا۔ نہ تم نے پھر انا پورن کے دیش کی خبر لی اور نہ میں بمبئی کی فلم انڈسٹری کے جھمیلوں سے نکل سکا۔ پچھلے دنوں ایک فلم کی شوٹنگ کے سلسلے میں کولمبو گیا ہوا تھا۔ جب ہماری ویگن لوکیشن کی تلاش میں ماؤنٹ لیونیا کے ساحل سمندر پر پہنچی تو مجھے بے اختیار تم یاد آگئے اور پھر وہ رات بھی یاد آگئی جس رات کولمبو کے گہرے نیلے استوائی آسمان پر کوئی چاند نہیں تھا اور گہرے سبز سمندر کی پُرسکون لہریں چاندی ایسا جھاگ سمیٹے بڑی محبت سے لیونیا بیچ کے بلند ناریل کے خاموش جھکے ہوئے سایوں کی ٹھنڈی ریت کو چوم کر واپس چلی جاتی تھیں۔ تمہیں وہ رات یاد ہوگی۔ ہم ماؤنٹ لیونیا کلب کی ٹیرس پر پام کے گملوں کے پاس بالکنی کی آرام کرسیوں پر بیٹھے سیلون کی اعلیٰ ترین خوشبودار چائے پیتے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ ہال کی کھلی کھڑکیوں کے باریک ریشمی پردے سمندر کی طرف سے آنے والی ہوا میں لہرا رہے تھے۔ ہال کے اندر خواب آور دھیمی روشنی میں جوڑے ایک دوسرے سے لگے رقص کر رہے تھے۔ مسز ڈی کوسٹا کے پیانو بجانے کی سریلی آواز ہمارے کانوں کو چھو کر گزر رہی تھی۔ مسز ڈی کوسٹا کے نرم و نازک انگلیوں والے زرد ہاتھ پیانو کے سُروں پر گردش میں تھے۔ اور پیانو کے چمکیلے براؤن ٹاپ گلدان میں سُرخ کنول کے پھول خاموش تھے۔ تم کہا کرتے تھے کہ ہالینڈ کی اس خاتون کی موسیقی اور کولمبو کے جنگلوں کے گل مہر کے سُرخ پھول مجھے مدورا اور رامیشورم کے ان قدیم مندروں میں لے جاتے ہیں جن کے سنگین دالانوں پر کبھی سیاہ چشم حنائی پاؤں والی راج نرتکیاں گھنگھروؤں کی جھنکار میں رقص کیا کرتی تھیں۔

پھر تم نے مجھے پنکج ملک کا گیت سنایا تھا۔

"پیا ملن کو جانا۔"

کتنی پریم دیوانی تھی وہ راج نرتکی کہ اندھیری رات میں آنکھوں پہ ہاتھ رکھے اپنے بن باسی محبوب کو ملنے سنگلاخ قلعے میں سے نکل کھڑی ہوئی تھی۔ وہ اپنے پائل کی جھنکاروں کو سمیٹے گنجان جنگل کے اندھیرے راستوں پر اکیلی چلی جا رہی تھی۔ اب پھر تم اس راج نرتکی کا ذکر کرتے ہوئے چائے کا گھونٹ پی کر سگریٹ سلگاتے ہوئے سامنے پھیلے ہوئے گہرے سبز سمندر کی وسعتوں میں کھو گئے تھے اور یاد ہے تم نے مجھے اوسین کی انگریزی نظم کا اُردو ترجمہ سنایا تھا۔ مجھے اس نظم کا ایک بند آج بھی یاد ہے۔

"اے ڈھلتی ہوئی رات کے تارے! تیری جگ مگ جھلمل میں کتنی سندر ہے۔ اے چمکیلی آنکھ والے! تو کیا دیکھ رہا ہے۔ اچھالے ننھی سی جوت! اللہ بیلی! مجھے اپنے بچھڑے ہوئے ساتھی دکھائی دے رہے ہیں۔ اس نے سالگر کی قبر دیکھی تھی۔ جس میں مرمریں سینے والی کولما سو رہی ہے۔ کولما جب پہاڑ کی چوٹی پہ بیٹھی تھی تو وہ جو گیت گا رہی تھی اس کو سنو۔ سالگر! رات کا سماں ہے اور میں اکیلی ہوں۔ اس پہاڑ کی چوٹی پر جہاں طوفان کا بسیرا ہے۔ ہوا پہاڑوں کے اوپر سے پکار رہی ہے۔ کوئی ایسی جھونپڑی نہیں جو مجھے بارش سے پناہ دے۔

اے چاند! بادلوں کے پیچھے سے نکل۔ اے رات کے تارو! مجھے کوئی ایسی روشنی دو جو مجھے اس جگہ پہنچا دے جہاں میرا سالگر شکار سے تھک کر اکیلا سستا رہا ہے۔ اے ہوا، تھوڑی دیر کے لئے رُک جا۔ اے ندی، تو دم بھر کے لئے چپ ہو جا تاکہ میری آواز سنی جا سکے۔"

پھر تم چپ ہو گئے تمہاری آواز سمندری لہروں کی دھیمی موسیقی میں گم ہو گئی۔ ناریل کے درختوں کی طرف سے مرطوب ہوا کا جھونکا چائے کی کیتلی کو چھوتا ہوا گزر گیا۔ اس ہوا میں مولسری کے پھولوں کی مہک تھی۔ تم نے سگریٹ اپنے ہونٹوں سے الگ کرتے ہوئے پوچھا تھا۔

"کیا انا پورنا نہیں آئی؟"

انا پورنا نہیں آئی تھی۔ انا پورنا کے بال لمبے اور سیاہ تھے۔ جنوبی ایشیائی سمندروں کی گہری پراسرار خوشبوؤں بھری راتوں کی طرح گہرے سیاہ۔ اس کی آنکھیں سیاہ بھونروں کی یاد تازہ کرتی تھیں۔ ان آنکھوں میں لنکا اور سنگل دیپ کے ان سمندروں کی گہرائیاں تھیں جن کی کوکھ سے نکلے ہوئے سفید اور سیاہ موتی لنکا اور سنگل دیپ کی راجکماریاں اپنے کانوں میں سجایا کرتی تھیں۔ اس کی آواز میں آدھی رات کے بعد چلنے والی جزیرائی ہوا کی سرگوشیاں تھیں۔ تم نے پہلی بار اس کا تعارف کرایا تو میں اسے لنکا کی دوشیزہ سمجھا لیکن تم نے بتایا کہ انا پورنا کا خاندان جنوبی ہند سے سیلون میں

آکر آباد ہو گیا تھا۔ انا پورنا ریڈیو سیلون پہ کام کرتی تھی۔ اس رات پہلی بار تم نے مجھے انا پورنا سے اپنے پریم، اپنی محبت کی داستان سنائی۔ وہ ریڈیو سیلون کی سنہالی سروس میں سکرپٹ رائٹر تھی۔ جب تم نے اسے پہلی بار دیکھا تھا تو انا پورنا نے ہلکے فیروزی رنگ کی ساڑی پہن رکھی تھی۔ اس کے ماتھے پر سرخ بندیا تھی اور کانوں میں سبز موتی چمک رہے تھے۔ وہ ریڈیو سٹیشن کے بوتھ سے کوئی اناؤنسمنٹ کر کے نکل رہی تھی۔ تم بوتھ کی طرف اُردو کی اناؤنسمنٹ کرنے جا رہے تھے۔ انا پورنا کا نیلا قلم قالین پر گر پڑا۔ تم نے اسے اٹھا کر دیا تو وہ مسکرا دی اور تمہیں یوں لگا جیسے سیاہ بادلوں میں سے اچانک سورج کی شعاعوں کی کرنیں پھوٹ پڑی ہوں۔

میں جانتا ہوں تم بھی بہت خوبصورت اور خوش لباس تھے۔ انا پورنا کو یقیناً تم اچھے لگے ہو گے۔ پھر تم ایک دوسرے کے قریب آتے گئے۔ تم دونوں کو اکثر شام کے وقت ماؤنٹ لیونیا کلب کی ٹیریس اور ساحل سمندر پہ ناریل کے درختوں میں ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ٹہلتے دیکھا جانے لگا۔ ساحل سمندر پہ اور سنگین چٹانوں کی اوٹ میں تم دونوں دیر تک بیٹھے باتیں کرتے۔ سمندر کی بے قرار موجیں زور زور سے آ کر چٹانوں سے ٹکرا کر جھاگ اڑاتیں اور واپس چلی جاتیں۔ مرطوب ہواہیں تمہاری انگلیوں میں سگریٹ بجھ جاتا۔ انا پورنا کی سیاہ کالی آنکھوں پہ گھنی پلکیں جھکی ہوتیں اور اس کے سیاہ جوڑے سے لگا گل مہر کا سرخ پھول خاموش ہوتا۔ مولسری کی خوشبو، گل مہر کے سرخ پھول۔ گہری سیاہ جھیلوں ایسی آنکھیں اور اعلیٰ ترین سگریٹ کا فلیور۔ تم آہستہ سے انا پورنا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر چوم لیتے۔ انا پورنا کی انگلیوں سے حنا کی گرم خوشبو اٹھ رہی ہوتی تھی۔ اور تم لوبان اور زعفران اور مولسری کی خوشبوؤں بھرے دھندلکوں میں اتنی دور نکل جاتے کہ تمہیں یاد بھی نہ رہتا کہ انا پورنا ایک ہندو لڑکی ہے جس کی منگنی اس کے ایک قریبی رشتہ دار ڈاکٹر سے ہو چکی ہے۔ مگر تم تو شادی بیاہ کے ندی نالوں سے نکل کر محبت، بیکراں محبت کے عظیم سمندروں میں گم ہو چکے تھے۔ محبت کے اس عظیم اور بیکراں سمندر میں ماتھوں پہ لگی بندیا اور محراب سب نکل جاتے ہیں۔ اگر کچھ باقی رہتا ہے تو محبت، پریم اور صرف پریم، جو خود ہی دیوتا ہے اور خود ہی پجاری۔

مگر میں کہاں سے کہاں نکل گیا ہوں۔ میں تمہیں بتا رہا تھا کہ جب ہماری ویگن ماؤنٹ لیونیا کلب کے قریب جا کر رکی تو مجھے وہ گہرے سبز آسمان والی رات یاد آ گئی جب ہم دونوں کلب کی ٹیریس میں بیٹھے چائے پیتے ہوئے باتیں کر رہے تھے اور تم نے سیلون کی تلخ خوشبودار چائے کا گھونٹ پیتے ہوئے کہا تھا۔

"انا پورنا ابھی تک نہیں آئی۔"

اور میں نے تمہیں کہا تھا کہ رات زیادہ ہو گئی ہے انا پورنا شاید اب نہ آئے۔ تم نے کوئی جواب نہ دیا تھا۔ تم نے خاموشی سے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ پھر شہر کی روشنیوں کی جانب سے مولسری اور حنا کے عطر کی ہلکی سی خوشبو کا جھونکا ہمارے قریب سے گزرا تو تم نے آنکھیں کھول دیں۔ تمہاری آنکھیں مجھ سے کولمبو کے گہرے سبز آسمان سے اور سمندری ہواؤں سے انا پورنا کے بارے میں پوچھ رہی تھیں کہ وہ کیوں نہیں آئی، اور پھر واقعی انا پورنا آ گئی۔ میں اٹھ کر ہال کمرے میں چلا گیا۔ انا پورنا کے سیاہ بال سمندر کی ہوا میں لہرا رہے تھے۔ اس کے بالوں، اس کے لباس اور اس کے جسم سے ایک عجیب فسوں ساز سحر انگیز خوشبو آ رہی تھی۔ تم نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور کہا۔

"انا پورنا! کیا مولسری گل مہر اور کنول پھول کی خوشبوئیں راتوں کو تم سے ملنے آتی ہیں؟"

انا پورنا مسکرائی اور تمہارے پاس بانس کی کرسی پہ بیٹھ گئی۔ اس کی ساڑھی کا رنگ عنابی تھا اور کانوں میں کیسری رنگ کے بندے تھے۔ ہال سے آنے والی دھیمی روشنی میں کبھی کبھی ان بندوں میں سے ایک نازک کرن پھوٹ کر رات کی پہنائیوں میں غائب ہو جاتی۔ انا پورنا نے چائے بنائی۔ تم سر جوڑے باتیں کرنے لگے۔ پھر اٹھے اور ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ناریل کے درختوں کی طرف چل دیئے۔ تم باتیں کر رہے تھے۔ گرم مہکیلے سانسوں کی سرگوشیوں اور ریشمی ساڑی کی سرسراہٹوں میں لپٹی ہوئی محبت کی باتیں۔ پریم کی باتیں۔ ازل کی باتیں۔ ابد کی باتیں۔ ازل سے ابد تک جاری و ساری رہنے والی باتیں۔ خاموش رہ کر کی جانے والی بغیر الفاظ کی باتیں۔ نگاہوں کی باتیں۔ خیال و خواب کی باتیں۔ مندروں میں اگر و لوبان سلگتا رہا۔ ناریل کے درخت گرم استوائی رات کی ہواؤں میں جھومتے رہے اور سمندر کی لہریں چاندی کا جھاگ اڑاتیں ٹھنڈی ریت کو چوم چوم کر واپس جاتی رہیں۔ تم نے مجھے بتایا تھا کہ اس رات چاند اس وقت طلوع ہوا جب ساحل کی ریت پہ تمہارے قدموں کے نشان ناریلوں کے جھنڈوں میں جا کر ختم ہو گئے تھے۔

ہماری ویگن ماؤنٹ لیونیا سے واپس پوریلا جنکشن کی طرف آ گئی۔ مجھے دور سے مسز جونز کی پرانی کوٹھی اور اس کے لان میں اگے ہوئے ناریل کے بلند درخت ہوا میں لہراتے دکھائی دیئے۔ مجھے بے اختیار وہ دن یاد آ گئے جب میں تمہیں اس کوٹھی میں ملنے آیا کرتا تھا۔ مسز جونز نے تمہیں اپنی کوٹھی کا کونے والا کمرہ کرائے پر دے رکھا تھا۔ اس کمرے کی عقبی کھڑکیاں آم اور کیلے کے جھنڈوں والے باغیچے میں کھلتی تھیں۔ اس جانب ایک چھوٹا سا برآمدہ تھا۔ اس برآمدے کے بانس کے ستونوں اور ڈھلوان چھت پر سفید پھولوں والی کوئی استوائی بیل چڑھی ہوئی تھی۔ برسات کی راتوں میں جب بارش ہوتی، تم برآمدے میں بچھے ہوئے تخت پر یوگیوں کی طرح آسن جما کر بیٹھ جاتے اور کیلے کے درختوں میں چھپے ہوئے سرخ جھومروں پر گرتی بارش کا نظارہ کرتے۔ اور اس رات بھی کولمبو کا سبز آسمان سیاہ گھٹاؤں میں چھپا ہوا تھا اور برآمدے میں انا پورنا تمہارے پاس بیٹھی تھی۔ تم اس کی پیالی میں چائے انڈیل رہے تھے اور زعفرانی چائے کو دیکھ کر تمہیں یوں لگا تھا جیسے تم انا پورنا کی پیالی میں پگھلا ہوا سورج انڈیل رہے ہو۔

پھر بادل آہستہ سے گرجا اور بارش شروع ہو گئی۔ اور پھر ناریل اور تل مہر کی دھیمی مہک، اناپورنا کے بالوں، حنائی انگلیوں اور ریشمی ملبوس کی خوشبو کے گلے ملنے لگی۔ تم نے سگریٹ سلگالیا اور چائے کی فلیور، حنا کی مہک، مولسری کی خوشبو اور سگریٹ کا اروما، اناپورنا کے بالوں کی سوگندھ اور اس کے براؤن ہونٹوں کی خوشبو کیلے کے پتوں اور زمین کی خوشبو کے محور کے گرد گردش کرنے لگی اور پیتل کی تھالیوں میں روشن اور سلگتے لوبان کی لہروں کے ساتھ سیاہ چشم دیوداسیاں سفید کنول پھولوں سے اپنے سینے ڈھانپے رقص کرنے لگیں اور لنکا کی جفاکش کسان بیٹیاں موسلا دھار بارش میں دھند لے کھیتوں میں دھان بو رہی تھیں۔ بارش ان کے چہروں کے پسینے میں گھل مل رہی تھی۔ عقبی لان کے باغیچے میں کیلے کے چوڑے پتے بارش میں جھک گئے تھے۔ جس طرح لنکا کی بیٹیاں کھیتوں میں دھان بوتے ہوئے جھکی ہوئی تھیں۔ زمین کو سلام، بارش کو سلام! کھیتوں کے پانی میں گرتے لنکا، مدوراء کیرل اور تامل ناڈو کی جفاکش بیٹیوں کے مقدس پسینے کو سلام۔

بارش کی آواز میں صدیوں کی محبتوں، اور لاکھوں کروڑوں برس کے جنگلوں کی بارش کا شور تھا اور اناپورنا کی جھکی ہوئی پلکوں میں، اس کے سانولے کنول پھول ایسے سینے کے ابھار میں ان گنت جذبوں کے جوالا مکھی ابل رہے تھے۔ جن میں آنے والے گذرے ہوتے پیدا ہونے والے طوفانوں کی صدائے بازگشت تھی اور تم ان طوفانوں، ان بارشوں، ان آوازوں کے شور میں گم تھے اور پھر تم نے اناپورنا کو اپنے ساتھ لگالیا اور پھر تمہیں یوں محسوس ہوا جیسے لنکا دلش کے سارے پہاڑوں نے اپنے ہیرے جواہرات لعل و گوہر نکال کر تمہارے قدموں میں ڈھیر کر دیئے ہوں اور گہرے سبز سمندر کی لہریں اپنی چاندی کی کشتیوں میں سفید نایاب موتی سجائے تمہاری طرف بڑھ رہی ہوں۔ اور ہر شاخ نے اپنے پھول، ہر درخت نے اپنے پھل، ہر چراغ نے اپنی روشنی اور ہر پھول نے اپنی خوشبو تمہاری جھولی میں ڈال دی ہو اور کسی درخت پر کوئی پھل، کسی شاخ پر کوئی پھول، کسی پہاڑ میں کوئی ہیرا کوئی زمرد اور کسی سمندر میں کوئی موتی مرجان باقی نہ رہا ہو۔ مندروں کی ساری خوشبوئیں جنگلوں کی ساری پراسرار سرگوشیاں تم دونوں کے سانسوں میں سمٹ آئی تھیں اور دیوانہ وار رقص کرتی دیوداسیوں کا شفاف پسینہ حنا کے قطرے بن کر تمہارے پیوستہ ہونٹوں میں جذب ہو رہا تھا اور بارش کی آواز جسم کی آوازوں میں ڈوب گئی تھیں۔ اب ایک ہی آواز تھی ایک ہی سرگوشی تھی۔ ایک ہی خوشبو تھی۔

بارش! بارش! میری پیاری بارش! کیلے کے پتوں، مندروں کے کلس مسجدوں کے میناروں، سرِ فلک قلعوں کی دیواروں، ناریل کے جھنڈوں اور سمندر کی تہ میں اور کھلے سیپ کے ہونٹوں میں گرتی جا۔ گرتی جا! اے گرم خوشبو دار بارش! بادلوں کی میٹھی بارش ہمارے آنگن کے درخت کا منہ بھی دھلاتی جا!

میری ویگن بوریلا جنکشن چوک میں سے گذر گئی۔ میں نے دور سے مسز جونز کی پرانی کوٹھی کو سلام کیا۔ اب ہم ٹمپل روڈ کی ٹرام پٹری پر سے گذر رہے تھے۔ یہی وہ ٹمپل روڈ تھی جہاں بودھ مندر کے سامنے اناپورنا کا گھر تھا۔ میں نے ویگن بودھ مندر کے پاس رکوالی۔ میری یونٹ کے آدمی ہوٹل میں چائے وغیرہ پینے چلے گئے۔ میں ویگن سے نکل کر بودھ مندر لین پیگوڈا کی زنگ آلود دروازے کے پاس کھڑا ہو گیا۔ مجھے یاد آگیا۔ یہاں تم اناپورنا کی صرف ایک جھلک دیکھنے کے لیے کتنی کتنی دیر کھڑے رہا کرتے تھے۔ اور پھر جب وہ کتھئی ساڑی میں ملبوس کھلے سیاہ بالوں کو گردن کی ایک طرف لاکر سینے پر سمیٹے ہاتھوں میں کانسی کی تھالی لئے تھالی میں ناریل، پھول مٹھائی اور لوبان رکھے وہ مندر کی طرف آتی تو تمہیں یوں محسوس ہوتا جیسے آکاش کی اپسرا زمین پر اتر رہی ہے۔

میں نے بودھ پیگوڈا کے عقب میں جاکر آم کا سیاہ تنے والا وہ گھنا درخت بھی دیکھا جس کی ٹہنیوں پر بہار کے موسم میں بور آتا ہے اور اس بور سے رس ٹپکتا ہے اور اس پر بھونرے منڈلاتے ہیں۔ اور جس کی چھاؤں میں ایک رات اناپورنا نے اپنا سیاہ بالوں والا سر تمہارے سینے سے لگا دیا تھا اور تمہیں محسوس ہوا تھا جیسے یہ وہی رات ہے جب مہاتما بدھ کو گیان حاصل ہوا تھا۔ میں نے آم کے اس درخت کے تنے پر تمہارا کھدا ہوا دل کا نشان بھی دیکھا جس کا بیضوی دائرہ تنے کی افزائش کے ساتھ ساتھ چھوٹا ہوتا جا رہا تھا۔ مجھے ویگن کے ہارن کی آواز سنائی دی۔ یونٹ کے لوگ مجھے واپس بلا رہے تھے۔ میں نے آم کے تنے پر کھدے ہوئے تمہارے دل کے نشان کو چوم لیا۔ مجھے یوں لگا جیسے یہ درخت کا دل تھا اور دھڑک رہا تھا۔

محبت کی یادگاریں ہمیشہ زندہ رہتی ہیں۔ شاید یہ کائنات بھی کسی کی محبت کی یادگار ہے۔ خلائے بسیط میں کسی سوگوار محبت کا کھدا ہوا دل کا بیضوی نشان ہے۔ شاید اسی لئے ساری کائنات ایک وسیع و عریض دل کی طرح دھڑک رہی ہے۔ اس امید پہ کہ شاید کسی روز کسی وقت کسی صبح کسی شام کسی رات محبت کرنے والا آئے اور اس دل پر اپنے ہونٹ رکھ دے۔

محبت کی یادگاروں کو سلام کر کے میں مندر سے نکل کر سڑک پہ آگیا۔

اناپورنا کا مکان چند قدموں کے فاصلے پر تھا۔ مجھے دور سے اس کے مکان کے آنگن میں اگا ہوا نیم کا گنجان درخت نظر آرہا تھا۔ میں ویگن میں سوار ہو گیا۔ ویگن ٹمپل روڈ پر دھیمی رفتار سے چل رہی تھی کیونکہ سڑک پر کافی ٹریفک تھا۔ ویگن اناپورنا کے مکان کے سامنے سے گذری تو نہ جانے کیوں میرا دل زور سے دھڑکنے لگا۔ اناپورنا کے مکان کا دروازہ تھوڑا سا کھلا تھا۔ جانے کیوں میں نے ویگن رکوادی۔ میں نیچے اترا۔ اپنے آدمیوں کو انتظار کرنے کا اشارہ کیا اور مکان کے دروازے پر آکر گھنٹی بجائی۔ کیا اناپورنا ابھی تک اسی مکان میں ہوگی؟ بیس برس گذر گئے ہیں۔ انسانی زندگی کے بیس برس بہت ہوتے ہیں۔ بیس برس آدمی کے چہروں کو بدلتے جسموں کی ساخت کو تاراج کرتے، جذبوں کو منتشر کرتے یادوں کے مزار تعمیر کرتے گذر جاتے ہیں۔ کیا اناپورنا زندہ ہوگی؟ میں نے دوسری بار گھنٹی بجائی۔ مکان کے آنگن میں کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ پھر ایک مدراسی عورت نے دروازہ کھول کر پوچھا۔

"کیا بات ہے جی؟"

میں نے تامل میں اناپورنا کے باپ کا نام لے کر پوچھا کہ مجھے ان سے ملنا ہے کیا وہ گھر پہ ہیں؟ مدراسی عورت نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا کہ اس نام کا کوئی آدمی یہاں نہیں۔ یہاں تو ڈاکٹر سبرامنیم رہتے ہیں۔ مدراسی عورت نے دروازہ بند کر دیا اور میں بوجھل قدم اٹھاتا دیگن کی طرف چل دیا۔

پیارے دوست! تمہاری اناپورنا ایک خوشبو تھی جو لنکا کے جنگلوں اور کولمبو کے ساحلوں سے پرواز کر گئی ہے۔ اب اگر تم ایک ہزار برس ان جنگلوں اور سمندروں کے ساحلوں پہ بھٹکتے پھرو تو تمہیں تمہاری اناپورنا کہیں نہیں ملے گی۔ آج بھی وہ الوداعی منظر میری آنکھوں کے سامنے ہے جب تم کولمبو سے روانہ ہو رہے تھے۔ تم جیٹی پہ جہاز کی سیڑھی کے قریب کھڑے تھے۔ میں اور اناپورنا تمہارے پاس موجود تھے۔ اناپورنا کا چہرہ اداس تھا۔ وہ اپنی آنکھوں میں بار بار چھلکتے آنسوؤں کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ میرا بائی نے کتنی خوبصورت بات کہی تھی کہ میں نے محبت کی بیل کو آنسوؤں سے سینچا ہے۔ آنسوؤں کا آب حیات پی کر محبت امر ہو جاتی ہے۔ غیر فانی ہو جاتی ہے۔ میں نے سگمنڈ فرائیڈ بھی پڑھا ہے۔ اور ڈارون کی تھیوری کا بھی بہت حد تک قائل ہوں۔ لیکن میں اس حقیقت کو بھی تسلیم کرتا ہوں کہ جب تک محبت کی آنکھوں میں آنسوؤں کے موتی چمکتے ہیں یہ دنیا تباہ نہیں ہوگی اور جنت کا نمونہ پیش کرتی رہے گی۔ جہاز نے پہلا وسل دیا۔ جہاز کی سیڑھی ہٹانے والے آ گئے۔ تم نے اناپورنا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ تم نے اناپورنا کو اور اناپورنا نے تمہیں خدا حافظ کہا ہو۔ پھر تم سیڑھی چڑھ گئے اور ڈیک کے جنگلے کے ساتھ لگ کر دوسرے مسافروں میں کھڑے ہو گئے تھے۔ جہاز کی سیڑھی ہٹا دی گئی۔ لنگر اٹھا دیا گیا۔ پھر جہاز نے آہستہ آہستہ جیٹی کو چھوڑنا شروع کر دیا۔ تم عرشے کے جنگلے کے ساتھ کھڑے تھے۔ تم نے ابھی تک ہاتھ نہیں ہلایا تھا۔ شاید اس لیے کہ تم اناپورنا سے جدا نہیں ہونا چاہتے تھے۔ پھر جہاز جیٹی سے دور ہٹتا گیا۔ تمہاری شکل دوسرے مسافروں میں گم ہونے لگی۔ اور تم نے آہستہ سے بازو اٹھا کر ہاتھ ہلایا۔

اناپورنا نے اپنا چہرہ ہتھیلیوں میں چھپا لیا اور میں اسے سہارا دے کر جیٹی سے باہر لے آیا۔ تمہارا جہاز سمندر کی وسعتوں میں غائب ہو گیا اور اناپورنا خوشبو کی لہر بن کر لنکا کے جنگلوں سے پرواز کر گئی۔ بچھڑی ہوئی محبتوں کی یاد سے میرا دل بھی اداس ہو گیا ہے۔ تم مسلمان ہو۔ تم دوسرے جنم کے قائل نہیں ہو۔ اگر قائل ہوتے تو تم اناپورنا سے اپنے اگلے جنم میں ضرور ملتے۔ لیکن جنم تو پاؤں کے بندھن ہیں۔ زنجیریں ہیں جو ہمیں اپنی اصل سے جدا رکھتی ہیں۔ اگلا کوئی جنم ہو یا نہ ہو مگر محبتوں کی مہک سدا خلاؤں میں سفر کرتی رہے گی۔ اپنے منبع کی تلاش میں، اپنے اصل کی تلاش میں!

تم آج مجھ سے دور ہو اور ایک ایسے شہر میں ہو جس کے ساتھ میری زندگی کی بھی کچھ ایسی یادیں وابستہ ہیں جو میرے اگلے جنم میں میرے وجود کی تشکیل کر دے گی اس لیے کہ آواگون کا عقیدہ میری روح کے ساتھ سفر کر رہا ہے تم لاہور میں رہتے ہو۔ اس شہر میں ایک نہر ہے۔ ایک خوبصورت باغ کے ساتھ ساتھ بہتی ہوئی نہر۔ اسی باغ میں کبھی لوکاٹ کے درخت ہوا کرتے تھے۔ اور اس بڑی نہر میں سے نکل کر ایک چھوٹی نہر لوکاٹ کے باغ میں سے گذرتی تھی۔ نہر کا ٹھنڈا اکدلا ریتلا پانی لوکاٹ کے درختوں کو چوم کر گذرتا تھا۔ یادوں کے ان گنت منظر بکھر گئے ہیں۔ کچھ بکھرے ہوئے منظر سمٹ کر وقت کے فریم میں پابند ہو گئے ہیں، ان کے رنگ زیادہ گہرے، زیادہ شوخ ہو گئے ہیں۔ یوں میرا یہ سفر تنہائی کا سفر نہیں رہا۔ اکیلے پن کا سفر نہیں رہا۔ ان منظروں، ان تصویروں کا ایک ایک رنگ، ایک ایک نقش میرے ساتھ سفر کر رہا ہے۔ وہ آواز جو کبھی پرانے تالابوں کو جاتی کچی سڑکوں پہ سیر کرتے سنی تھیں اب میرے سامنے خوبصورت لڑکیوں کی شکل میں بیٹھی مجھ سے ہمہ وقت باتیں کرتی ہیں۔ میں چلتا ہوں تو وہ بھی میرے ساتھ چلتی ہیں۔ یہ دلگداز نغموں کی شکل میں ڈھل گئی ہیں۔ اور یوں فطرت کی ازلی آواز کروڑوں برس پہلے کے ابتدائی جنگلوں کی خاموشی اور زمین پر برسنے والی پہلی بارش کی سرگوشیوں سے ہم آہنگ ہو گئی ہیں۔

ذکر میں ایک شہر کی نہر کا کر رہا تھا یہ شہر کبھی میرا شہر ہی تھا۔ اس شہر کی یہ نہر لوکاٹ کے ایک باغ سے گزرا کرتی تھی۔ کیا اب بھی یہ نہر جس باغ سے گذرتی ہے وہاں لوکاٹ کے درخت لگے ہیں، تب یہ نہر چھوٹی تھی جسے ہم پنجابی میں 'سوا' کہا کرتے ہیں۔ میں منہ اندھیرے سیر کرنے اسی باغ میں جاتا تو نہر کے کنارے ایک جگہ بیٹھ جاتا تھا۔ پھر مشرقی افق پہ نور صبح کی اولین فیروزی جھلکیاں نمودار ہوتیں تو باغ میں درختوں کے نیچے منہ اندھیرے میں زمرد کے رنگ ایسی ننھی ننھی معصوم پریاں، طلوع سحر کی پھلجھڑیاں ہاتھوں میں تھامے رقص کرنے لگتیں۔ اور میری نظریں بڑھتے پھیلتے نور کے دھندلکوں میں لوکاٹ کے اس کیسری رنگ کے گچھے پر ٹھہر جاتیں جو اپنے بوجھ سے جھکا نہر کے بہتے پانی کی سطح کے اوپر آ کر رک گیا تھا۔ جب ہوا چلتی تو کیسری لوکاٹیں جھک کر بار بار پانی کا منہ چومنے لگتیں۔ پھر سورج کی پہلی گلابی کرنیں درختوں کے تنوں سے آڑی ترچھی ہو کر اس گچھے پر پڑتیں تو وہ سونے کے جھومر کی طرح چمکنے لگتا۔ نہر کا ٹھنڈا بہتا پانی سورج کے سونے کو لہروں کی شکل میں سمیٹ کر آگے بڑھ جاتا۔

یہ منظر میری یادوں کے البم کی ایک تصویر ہے۔ یہ تصویر یہ تصویریں یہ شہر یہ نہر۔ میرے ساتھ ساتھ سفر کر رہی ہے۔ کبھی اس نہر پہ سورج طلوع ہو کر غروب ہو جاتا تھا۔ لیکن میری یادوں کے البم میں اس کا سورج طلوع ہو کر کبھی غروب نہیں ہوا۔ اس تصویر کے آگے ایک اور سورج ہے۔ ایک اور درخت ہے۔ ریلوے کے پھاٹک والا ناشپاتی کا درخت۔ یہ درخت پھاٹک کی ڈھلان کے نیچے سرسوں کے ایک کھیت کے کنارے اگا ہوا تھا۔ چیت بیساکھ میں اس درخت کی شاخیں گلابی شگوفوں سے سج جاتیں۔ ناشپاتی کے پھولوں کی خوشبو ان کے زرگل کے پتوں میں محو خواب رہتی تھی۔ خوشبو جہاں بھی ہو پھول کی امانت ہوتی ہے۔ اگر تم ناشپاتی کے پھولوں سے لدے ہوئے درخت کے نیچے بیٹھ جاؤ تو تمہیں ان کے پھولوں کی خوشبو

محسوس نہیں ہوگی۔ لوگ کہتے ہیں ناشپاتی کے پھولوں کی خوشبو نہیں ہوتی۔ ہر پھول کی خوشبو ہوتی ہے۔ کچھ پھول اپنی خوشبو پھول میں بکھیر دیتے ہیں کچھ بہت کم خوشبو دیتے ہیں۔ کچھ اپنی خوشبو کو چھپا لیتے ہیں۔ ان پھولوں کی خوشبو سونگھنے کے لئے خود ناشپاتی کا پھول بننا پڑتا۔ ناشپاتی کا پھول اپنی خوشبو کسی غیر پھول پہ ظاہر نہیں کرتا۔ وہ اسے اپنے پردوں میں سمیٹے اپنے سینے سے لگائے رکھتا ہے۔ یہ خوشبو اس کے اپنے ہی مرکز پہ اس کے اپنے ہی گرد گردش کرتی رہتی ہے۔

لیکن جب میں سورج نکلنے سے پہلے منہ اندھیرے اس درخت کے پاس آتا تو یہ پھول اپنی خوشبو کے دریچے مجھ پہ کھول دیتا۔ خوشبو نور کی لہروں کی طرح مجھے درخت کے ارد گرد رقص کرتی نظر آتی تھیں۔ اسی درخت کے جنوب میں ایک شکستہ چار دیواری کے اندر ایک پرانی حویلی ہوا کرتی تھی۔ جس کے در و دیوار بارش اور دھوپ کی وجہ سے کالے پڑ گئے تھے۔ حویلی کی دوسری منزل کی ایک بالکونی پر آم کے درخت کی شاخیں جھکی ہوئی تھیں۔ یہ اجڑی ہوئی بے آباد حویلی تھی۔ بچپن میں ہم اس حویلی کی طرف جاتے ہوئے ڈرا کرتے تھے۔ لڑکوں میں یہ بات مشہور تھی کہ یہ حویلی آسیبی ہے اور رات کو کسی عورت کے رونے کی آواز آتی ہے۔ ہم نے یہ آواز کبھی نہیں سنی تھی۔ مگر بڑے بوڑھوں کا کہنا تھا کہ اس حویلی میں کسی مغل کنیز کی روح بھٹکتی پھرتی ہے جسے صوبیدار کے حکم پر آگ میں زندہ ڈال کر جلا دیا گیا تھا۔ میں اس حویلی کے اندر کبھی نہیں گیا تھا لیکن مجھے آم کی وہ ڈال بڑی پیاری لگتی تھی جو پرانی حویلی کی بالکونی پر جھکی ہوئی تھی۔ بچپن کے خوف کا اثر جوانی میں بھی مجھ پہ مسلط رہا اور صبح سویرے سیر کرنے جاتا تو اس حویلی کی طرف نہیں جاتا تھا۔

حویلی کا شکستہ دروازہ ایک طرف کو جھک گیا تھا اور اس کی دہلیز پہ گھاس اُگ آئی تھی۔ ویران صحن میں کھٹوں کے درخت تھے۔ مارچ اپریل میں ان پیڑوں پہ سفید کلیاں کھلتیں تو سارا رستہ ان کی خوشبو سے مہک جاتا۔ پچھلے پہر جب آسمان پر صبح کا نیلا نور پھیلنے لگتا اور مشرق میں صبح کا تارا ٹمٹماتا تو اس حویلی کی طرف سے ہوا کا جھونکا کھٹوں کے پھولوں کی خوشبو لے کر میرے قریب سے گذر جاتا۔ میری نگاہیں بے اختیار حویلی کی بالکونی کی طرف اٹھ جاتیں۔ مجھے یوں لگتا جیسے شکستہ بالکونی میں ایک سیاہ چشم مغل شہزادی، بالوں میں سُرخ گلاب سجائے صحن میں دیکھ رہی ہے۔ ہو سکتا ہے یہ میرا واہمہ ہو۔ لیکن واہمہ بھی تو ایک حقیقت ہے۔ ہر حقیقت کے پیچھے ایک واہمہ محو خواب ہے۔

میرے دوست! میں بھی یادوں کی بالکونی میں، گذرے وقت کی ٹہنی کو تھامے ویران صحن میں پرانے باغوں کے راستوں کو دیکھ رہا ہوں۔ نیچے ایک شہر ہے۔ گرمیوں کی لُو میں سلگتا، سردیوں کی دھند میں لپٹا پرانی گلیوں نئے مکانوں، نہروں، سرسوں کے کھیتوں اور صبح کے وقت اسکول جاتے بچوں والا شہر۔ اس شہر کی نیم روشن گلیوں میں میرا جنم ہوا۔ انہی گلیوں میں کھیتوں میں مکانوں کی تاریک ڈیوڑھیوں میں کھیل کود کر جوان ہوا۔ پھر انہی گلیوں کے ایک مکان کی تاریک ڈیوڑھی میں چوڑیوں کی کھنکھناہٹ میں ایک لڑکی نے میرا ہاتھ تھام کر مجھے کہا "میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہوں گی"۔

میں بھی اس کم سخن اداس چہرے والی لڑکی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ مگر مجھ سے جدا ہو کر وہ بھی زندہ رہی۔ اس سے جدا ہو کر میں بھی زندہ رہا۔ ہم دونوں زندہ ہیں۔ اس کی شادی کو ایک عرصہ گذر چکا ہے۔ میں بھی اپنے بچوں میں سرکھپاتا ہوں۔ وہ اپنے خاوند سے بہت پیار کرتی ہوگی۔ وہ اپنے جیون ساتھی سے بڑی مخلص ہوگی۔ عورتیں بڑی اخلاص پرست ہوتی ہیں۔ شاید یہ جذبہ عورتوں کو فطرت کی طرف سے ودیعت کیا گیا ہے۔

لیکن اس وقت بھی ہمارے جذبے بڑے سچے تھے جب ہم دونوں ایک دوسرے سے عمر بھر نباہ کرنے کی قسمیں کھا رہے تھے۔ اس وقت اگر ہم ایک دوسرے سے جدا کر دیتے جاتے تو ہم ضرور مر جاتے۔ لیکن وقت نے ہمارے سچے جذبوں پر مصلحتوں کی خاک ڈال دی اور اب ہم اپنے سچے جذبوں کی سچی محبت کو مصلحت کے قبرستان میں دفن کر کے اس کا مزار بنا دیا۔ یادوں کا مزار! سچے جذبوں کی سچی محبت کا مزار! کبھی کبھی مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں نے اپنی فطری بے لاگ اور سچی محبت کو بھی اسی مزار میں دفن کر دیا تھا اور اس کے بعد سے لے کر اب تک جھوٹ بول رہا ہوں۔ لاہور والی ہماری گلی میں صبح صبح ایک فقیر اک تارا بجایا کرتا تھا۔ وہ پنجابی کا ایک شعر بڑی پُرسوز آواز میں گایا کرتا تھا۔ مجھے وہ شعر آج بھی یاد ہے۔

سے تینوں سُفنا ہو جان گیاں
بابل دیاں گلیاں نی

(اے لڑکی! تیرے بابل کی گلیاں ایک روز خواب ہو جائیں گی)

وہ اک تارے والا فقیر بھی اب خواب ہو گیا ہے۔ اس گلی میں ہمارا گھر تھا اور دو مکان چھوڑ کر اس لڑکی کا گھر تھا جس نے تاریک ڈیوڑھی میں میرا ہاتھ تھام کر کہا تھا۔ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہوں گی ہم مکان کی سیڑھیوں میں چھپ چھپ کر ملا کرتے تھے۔ یہ سیڑھیاں ہی ہماری محبتوں کے باغ، پارک اور ہوٹلوں کے کیبن ہوا کرتے تھے۔

یہی وہ باغ وہ پارک اور ہوٹل کے کیبن تھے جہاں اندھیرے میں بیٹھ کر ہم محبت کی باتیں کیا کرتے۔ یہی وہ سیڑھیاں تھیں کہ جن کی ہر سیڑھی پر دم نکلتا تھا۔ ارمان نکلتے تھے۔ سچے معصوم جذبوں، سچی معصوم محبتوں کی یہ سیڑھیاں وقت نے ہمارے نیچے سے کھینچ لی ہیں۔

میں جب کالج جاتے ہوئے گلی میں اس کے مکان کے نیچے سے گذرتا تو وہ پہلے سے کھڑکی میں کھڑی ہوتی تھی۔ اس نے اپنی حنائی انگلیوں سے چق کو ذرا سا اندر کو کھینچ رکھا ہوتا اور دو سیاہ آنکھیں گلی میں جھانک رہی ہوتی تھیں، اس گلی کے باہر شہر کا پرانا دروازہ تھا۔ دروازے سے آگے باغ تھا۔ پھر کھیت آجاتے تھے اور پھر دریا بہتا تھا۔ مجھے کپل دستو کے بیراگی شہزادے کا خیال آرہا ہے جس نے ایک رات اپنے مرمریں محل میں بربط بجانے والی ایک کنیز سے پوچھا تھا۔

"شالینی! مجھے بتا اس محل کی چار دیواری کے پار کیا ہے"۔

اور بربط نواز کنیز نے کہا تھا۔

"اے شہزادے! پہلے آم کے باغ ہیں۔ پھر لہلہاتی کھیتیاں ہیں۔ اس کے آگے درختوں کے جھنڈ ہیں سبک رفتار ندیاں جنگل اور دریا ہیں۔"

پھر شہزادے نے دیگر آواز میں پوچھا تھا۔

"میری سکھی! مجھے بتا وہ کونسی آنکھ ہے جو مشرق سے نکلتے سورج کو سب سے پہلے دیکھتی ہے؟"

اے نیک دل کنیز! تجھے پرستان کا علم ہے۔ تو پرستان کی داستانیں سناتی ہے۔ مجھے بتا تمہاری داستانوں کے شہزادے اپنے منہ زور گھوڑوں کو کہاں باندھتے ہیں۔ مجھے اس طلسمی دیس کی کہانی سنا جہاں سورج دلیتا رات کو بسرام کرتا ہے اور تارے دن کو محو خواب ہوتے ہیں۔"

اس وقت کنیز نے بربط اٹھایا اور ایک درد انگیز نغمہ چھیڑ دیا۔

"ہم تو جہاں گرد ہواؤں کی آوازیں ہیں اور
نجات کی تلاش میں بھٹکتی پھرتی ہیں۔ ہم بربط کے تاروں پر آہیں بھرتی گذرتی ہیں۔
ہمیں نہ آغاز کا علم ہے نہ انجام کی خبر ہے۔
ہم وہی کہتی ہیں جو کتب مقدسہ میں لکھا ہے۔

"کہتے ہیں کہ شہزادہ گوتم اسی رات اپنے مرمریں محل کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ گیا۔ میرے دوست! میں محل نہیں چھوڑ سکتا۔ لیکن محل چھوڑنے والے کو پیار ضرور کر سکتا ہوں۔

اب میں اپنے شہر کی گلی کو بازار میں اور نہر کو دریا میں گرتے دیکھ رہا ہوں۔ اس دریا کے پار کچی چار دیواری کے احاطے میں کھجوروں کے پیڑوں کے جھنڈ ہیں۔ ان درختوں میں لال لال اور کیسری رنگ کی کھجوروں کے جھومر لٹک رہے ہیں۔ مجھے پنجابی کے ایک لوک گیت کا شعر یاد آرہا ہے۔

ع
اچیاں لمیاں لال کھجوراں
تے پتر جنہاں دے ساوے
ایتھوں دی کیتے لنگرے ڈھٹے
لال صراحیاں والے

میں اس پنجابی گیت کا ترجمہ نہیں کروں گا۔ ترجمے کا ہاتھ لگنے سے اس لاجونتی کی پنکھڑیاں مرجھا جائیں گی۔ تم نے یہ کھجوروں والا احاطہ ضرور دیکھا ہوگا۔ ان درختوں کے قریب ہی ایک چھوٹا سا نالہ بہتا تھا جس کے کنارے گھاس میں کاسنی پھول کھلا کرتے تھے دریا میں ایک کشتی جارہی ہے ملاح گیت گا رہا ہے۔ یہ گیت ملاح کے دل کی دھڑکنوں کو ساتھ لے کر فضا میں بلند ہو رہا ہے۔

ع
"تم نے یہ ناچ کہاں سے سیکھا ہے دریا کی لہرو
تیرے پانیوں میں ہمارے آنسو بھی گرتے ہیں
تم نے یہ ناچ کہاں سے سیکھا ہے
دریا کی لہرو، دریا کی لہرو!"

جہاں یہ دریا ٹاہلیوں کے ذخیرے کے قریب سے موڑ گھومتا ہے وہاں چائے کی ایک چھوٹی سی دکان ہے۔ اس دوکان کے آگے زرد کیلوں کے گچھے لٹک رہے ہیں۔ چند قدم آگے ایک عظیم الشان عبادت گاہ کی اوپر کو جاتی سنگین سیڑھیاں ہیں۔ ان سیڑھیوں میں پھول بیچنے والی لڑکیاں بیٹھتی ہیں۔ پانی کی بالٹیاں پھولوں سے بھری ہوتی ہیں۔ زرد کاسنی سفید لال نیلے پھول بالٹیوں سے سر باہر نکالے صبح کی سنہری کرنوں میں مسکرا رہے ہیں پیچھے سرسبز ڈھلانیں ہیں جہاں چائے کے باغ پھیلے ہیں۔ چائے کے باغوں سے چائے کی خوشبو کبھی نہیں آتی۔ یہ خوشبو کھولتے پانی میں گرنے کے بعد پیدا ہوتی ہے اور پیالیوں میں انڈیلتے ہوتے فضا میں بکھرتی ہے۔ تمہیں یاد ہے یہاں چائے کے ایک چھوٹے سے کیبن میں بیٹھ کر چائے پیا کرتے تھے۔ تم چائے بناتے۔ اور کیتلی میں سے سورج نکلنے سے پہلے کی شفق طلوع ہو کر پیالی میں گرتی۔ مجھے محسوس ہوتا جیسے اس شفق میں ہزاروں لاکھوں کروڑوں سورج گردش کر رہے ہیں ہزاروں صبحیں لاکھوں شامیں اور جنگلوں کے افسوں ساز سناٹے سنسنا رہے ہیں۔ اس میں ان پھولوں کی مہک بھی ہے جنہیں ابھی ہزاروں سال بعد کھلنا ہے۔ ان حسین لڑکیوں کے گرم سانس ہیں جنہیں ابھی ہزاروں برس بعد جنم لینا ہے۔ ان ابدی خاموشیوں کی سرگوشیاں ہیں جو ابھی کسی ذی روح کے کانوں تک نہیں پہنچیں اور ان بارشوں کی سحر انگیز آوازیں ہیں۔ جو ابھی وقت کی سیاہ گپھاؤں میں محو خواب ہیں۔

یہ آوازیں، یہ خواب، یہ دریا، یہ شہر ویسے کی ویسی ہی ہیں۔ جس شاخ پہ جو پھول کھلا تھا مرجھایا نہیں۔ جہاں بارش کی بوند گری تھی۔ وہیں موتی بن کر جم گئی ہے۔ جہاں سورج کی پہلی کرن چمکی تھی وہیں نور کی لکیر بن کر ساکت ہو گئی ہے۔ شکستہ حویلی کی بالکونی میں جھکی ہوئی آم کی ٹہنی سے ایک بھی آم نہیں گرا۔ مغل شہزادی اسی طرح بالکونی میں کھڑی صحن میں دیکھ رہی ہے شاید وقت کی کسی آندھی میں اس کے جوڑے کا سرخ پھول صحن میں گر پڑا ہوگا۔ صحن ویران ہو گیا لیکن شہزادی کے جوڑے سے گرا ہوا پھول نہیں مرجھایا۔ عبادت گاہ کی سیڑھیوں پر پھول بیچنے والی معصوم شکل لڑکیاں درخت بن گئی ہیں۔ پھول بیچنے والیاں، پھولوں میں رہنے والیاں۔ وقت گذر جانے پہ درخت بن جاتی ہیں۔ سنبل کے عظیم الشان درخت۔ جن کی شاخوں پہ سرخ پھولوں کے فانوس لٹکتے ہیں۔

●●

پھلواری

رضیہ فصیح احمد

تائی اماں! آپ نے سنا یہاں کی چڑیاں بھی تو انگریزی بولتی ہیں۔ غور سے سنیے ایک کہہ رہی ہے سوئٹی، سوئٹی دوسری کہہ رہی ہے، برڈی، برڈی ___ اور چھوٹی چھوٹی چڑیاں کہہ رہی ہیں گٹ پٹ، گٹ پٹ ___" یوسف نے باربی کیو کرتے گھرانے کے پس منظر میں صفائی سے تائی اماں کی تصویر کھینچی۔ ان کو پتہ بھی نہ چلا۔

"اے ہاں یہ تو وہی بات ہوئی" انھوں نے اطمینان سے ایک ٹانگ اٹھا کر بنچ پر رکھتے ہوئے کہا۔ "کسی نے کہا چاند کی شکل روپے جیسی ہے تو بھوکے نے۔ بھیا مجھے تو روٹی دکھائی دے ہے" ___ اپنے ہاں کہا کرے ہیں ٹیڑی ہوں، پیاسی ہوں۔ دوسری زبان والے خدا جانے کیا کہتے ہوں گے، تمہاری امریکن زبان کیا کہوے ہے؟"

"معلوم نہیں تائی اماں ___ مگر کبھی کبھی تو آپ بڑی عقلمندی کی باتیں کرتی ہیں!"

"اور کبھی کبھی پاگل پنے کی، کہہ دے نا، چپ کیوں ہو گیا!"

"میں یہ گستاخی کیسے کر سکتا ہوں" یوسف نے آگے بڑھ کر جھیل کے اندر کشتی میں گزرتے ایک جوڑے کی تصویر لی۔ پھر پانی میں گری لکڑی پر لینس کو فوکس کرتے ہوئے بولا ___ "اب آپ نے خود ہی کہہ دیا۔"

"ارے ہم نے زمانے بھر کا علم پڑھا نہ کبھی گھر سے باہر نکلے۔ تم لوگوں سے کچھ پوچھو تو تم ایسے ہنسو ہو جیسے پہلے بڑے بچوں کی باتوں پر ہنسا کریں تھے ___"

یوسف نے کیمرے کا بٹن دبایا اور آن کر تائی اماں کے پاس بنچ پر بیٹھ گیا۔ "تائی اماں بات تو آپ صحیح کہہ رہی ہیں مگر جب آپ ایسے سوال پوچھتی ہیں کہ سعودی عرب اور امریکہ کے درمیان ریل چلے ہے تو آپ ہی ہنسی آئے گی۔ حج آپ نے کر لیا، امریکہ تک آپ آ گئیں مگر کبھی دنیا کا نقشہ اٹھا کر نہ دیکھا کہ پاکستان کدھر ہے، سعودی عرب کہاں ہے اور امریکہ کس طرف کو ہے۔"

لاؤ کیمرہ مجھے دو" منیر نے کہا اور جھیل کے دوسری طرف سرخ، زرد، گلابی، بھورے اور عنابی ہوتے پتوں کی تصویریں اتارنے لگا۔

تائی اماں کچھ کھسیانی سی ہو گئیں گھٹنے کے نیچے سے پاندان گھسیٹ پان لگاتے ہوئے بولیں "ارے جس دن نقشہ دیکھنے لگوں گی اس دن بھی تم ہنسو گے کہ بوڑھی اماں کو جغرافیہ پڑھنے کا شوق چرایا ہے۔ اے ہے حبیب میں نئی نئی امریکہ آئی تو ایک دن منیر کہنے لگا، اماں یہاں مغرب کی طرف نہیں مشرق کی طرف منہ کر کے نماز پڑھا کریں۔ میں سمجھی مذاق کر رہا ہے۔ اس نے جھٹ وہیں مسجد کے ملاجی کو فون کر دیا۔ وہ پاکستانی تھے۔ کہنے لگے ہاں، یہاں سے کعبہ مشرق کی طرف سے نزدیک ہے۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی" تائی اماں نے پان منہ میں رکھ کر اشتیاق سے جھاڑیوں کے سرخ خوشوں پر نظر ڈالی جو لاکھوں کی تعداد میں انگور کے خوشوں کی طرح لدے تھے اور سورج کے عکس میں یوں چمک رہے تھے جیسے ان میں کوئی مشروب بھرا ہو۔

"تائی اماں گھر جا کر آپ کو نقشے میں دکھاؤں گا کہ کعبہ کس طرح مشرق کی طرف ہے۔ ابھی تو آپ یہ منظر دیکھیے، ایمان سے کہیے کبھی ایسی خوب صورت خزاں دیکھی تھی آپ نے؟"

"نہیں بھیا ___ واقعی بڑی خوب صورت خزاں ہے، بہار سے بھی بڑھ کر ___ بھلا بتاؤ کون رنگ ہے جو ان پتوں میں نہیں ہے"

منیر نے اس طرف آتے ہوئے یہ بات سن لی "اماں، اس مرتبہ اتنی خوب صورت خزاں بھی آپ کے اعزاز میں آئی ہے میں چھ سال سے یہاں ہوں مگر ایسی حسین خزاں نہیں دیکھی۔"

"یار یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو ___" یوسف بولا ___ "اس سال یونیورسٹی کے درخت بہت خوب صورت لگے۔ میں نے یونیورسٹی کے مالی سے پوچھا تو بولا کہ اس دفعہ بارشیں بہت ہوئی ہیں۔ درختوں نے نمی جذب کر لی ہے اسی وجہ سے خزاں دیر میں آئی ہے مگر خوب صورت آئی ہے۔"

"اماں، یہ تو چھوٹا سا اسٹیٹ پارک ہے یہاں کے نیشنل پارک دیکھیے جن کے وسیع جنگلوں کو ویسا ہی چھوڑ دیا گیا ہے۔ ان میں کبھی جانا

پرندے اور جنگلی پھولوں کی افراط ہے۔ یلو اسٹون پارک جہاں گرم پانی کے ہزاروں چشمے پھوٹ رہے ہیں، کولوریڈو نیشنل پارک جہاں چودہ ہزار فٹ اونچی پہاڑیاں ہیں۔ پاکستان میں ایسے پارک کہاں ہیں؟"

"پاکستان بھر کا تو مجھے پتہ نہیں مگر کراچی کے باغوں کا تو وہی حال ہے کہ جس کو پیا چاہے وہی سہاگن۔"

"تائی اماں، آپ تو بات کرتی ہیں پہیلیوں میں، اب اس پہیلی کو بوجھے کون؟"

"ارے پرانے زمانے میں ایک ایک مرد کی چار چار بیویاں ہوا کرے تھیں۔ جس پر وہ اپنا پیار نچھاور کرے تھا۔ وہ سہاگنوں کی طرح بنی سنوری رہتی تھی۔ باقی بے چاریاں اجڑی بجڑی جیسے بیوائیں۔ جب پاکستان بنا تو گاندھی گارڈن اچھا خاصا ہرا بھرا تھا۔ دوسرے پارک بنے تو وہ اجڑا۔ جب سے عزیز بھٹی پارک بنا ہے، ہل پارک میں دھول اڑنے لگی ہے۔"

"اب کی گرمیوں میں تائی اماں کو فلوریڈا لے جاؤ۔ وہاں کے ایورگلیڈز پارک میں ایک جگہ ہے فلیمنگو بھی کیا خوب صورت جگہ ہے۔ بیٹھنے کی جگہ اوپر بنائی ہے جہاں سے دور دور کا منظر نظر آتا ہے۔ سمندر کے بیچ میں چھوٹے چھوٹے جزیرے ہیں جن کے درختوں پر چڑیاں بیٹھی رہتی ہیں۔ مرغابیاں اور سارس سینکڑوں کی تعداد میں۔ کی ویسٹ، امریکہ کا آخری مغربی کنارہ ہے۔ اس طرف جانے والی سڑک بھی یہاں سے صاف نظر آتی ہے۔ تائی اماں وہ پورا باغ دیکھ کر بڑی خوش ہوں گی۔"

"نہ بھیا۔ اب میں زیادہ دن نہ ٹھہروں گی، مجھے ٹکٹ لا دینا۔"

"ارے اماں، یہ بیٹھے بٹھائے کیا سوجھی آپ کو؟"

"ہاں ۔" وہ کسمسائیں۔ جواب دینے کے لیے دماغ پر زور ڈالا، پھر ایسے بجھے ہیں کہ بلا سے کوئی برا مانے یا بھلا، بولیں ۔" میرے پودے جل جلا گئے ہوں گے۔ ہاں نہیں تو۔"

"پودے تو اب جل ہی گئے ہوں گے، ایک سال ہوگیا آپ کو آئے۔"

"یہی تو میں کہہ رہی ہوں ۔"

"میں بھی تو یہی کہہ رہا ہوں کہ اچانک آپ کو پودے کیسے یاد آ گئے وہ تو کب کے جل گئے ہوں گے ۔"

"ارے تمہیں کیا پتہ، کب سے انھیں دل ہی دل میں یاد کر رہی ہوں، سوچتی ہوں، ہو کو ذرا بھی شوق نہیں بیل بوٹوں کا۔ اس نے پانی وانی بھی نہ دیا ہوگا۔ خیر ایک دفعے اور نئے سرے سے لگاؤں گی۔ ایک ہی دفعے لگانے پڑیں گے۔ یہاں کے گملے کے پودے تو ایک سال میں دس دفعے جلے ۔"

"تو جلتے ہی ۔" منیر نے کہا۔ آپ نے بھی تو مارچ میں اٹھا کر باہر رکھ دیئے جب کہ اپریل تک یہاں فروسٹ ہوتا ہے۔ باقاعدہ اخبار میں آتا ہے کہ اس دن فروسٹ کا آخری دن ہوگا۔ اس کے بعد پودے باہر رکھے جاتے ہیں ۔"

"اے ہے، تو مجھے کیا پتا۔ ایسی اچھی دھوپ نکلی۔ ایسا اچھا گرم دن۔ میں نے اٹھا کر باہر رکھ دیے۔ رات کو پالا مار گیا۔ ایسے جلے کہ راکھ اندر رکھا، کھاد ڈالی، مگر او نہوں ۔" انھوں نے سر ہلایا۔" بالکل مردہ، جڑ تک کو پالا مار گیا۔"

"تو اور کیا۔" یوسف بولا۔" یہاں کا فروسٹ ایسا ویسا تھوڑا ہی ہوتا ہے۔" اس کے لہجے میں فخر تھا جیسے کہہ رہا ہو یہاں کی تو ہر چیز بڑے پیمانے پر ہوتی ہے چاہے برف باری ہو، فروسٹ ہو یا فراڈ!

"یہ بھی کوئی بات ہوئی، دو ہفتے کے لیے باہر جاؤ تو کوئی دیکھ ریکھ کرنے والا نہیں، پانی بنا پودے جل گئے۔ کچھ میں احتیاطاً زیادہ پانی ڈال گئی وہ گل کر رہ گئے باقی سارے خشک، بے دم، مہینوں ان کو زندہ کرنے میں لگے۔ نہ بھائی تمہاری کھیتی ہماری سمجھ میں نہیں آتی ــــ وہاں کا تو ہمیں پتہ ہے، بیلے میں کب پانی ڈالنا ہے، گلاب کی قلمیں کب لگانی ہیں اور اللہ تمہارا بھلا کرے چنبیلی کے جھاڑ کو کیا کرنا ہے۔ یہ تمہارے گھروں کے اندر کے پودے ہم سے نہ سنبھلتے ۔"

"تائی اماں! آپ کو کب سے شوق ہوا ان پھولوں وولوں کا؟" یوسف نے پوچھا۔

"اے ہے بچپن سے۔ تمہارے ابا کی پھولوں کی دکان تھی۔ حیدر آباد سے پھول آیا کرے تھے۔ بابا تین ہٹی سے پھول لاتے ہم سب گھر کی عورتیں لڑکیاں مل کر ہار گوندھتے۔ سارا گھر مہکا کرتا۔ تب سے ہی شوق تھا کہ اللہ نے دیا تو کبھی گھر کے آنگن میں پھول لگاؤں گی۔ اللہ رکھے میرے منیر کو۔ اس نے بھر بھر مٹھیاں روپے بھیجے۔ میں نے آنگن چھوڑ پورا باغیچہ لگالیا۔"

"آپ نے شادی بھی پھول بیچنے والے سے کی؟" منیر کی زبان سے نکل گیا۔ بعد میں وہ خود شرمسار ہوگیا۔

ماں گھگھوں سی ہوگئیں۔ دبی زبان سے بولیں "اور کیا ۔" پھر پاندان گھسیٹ کر پان بنانے لگیں۔ جب کوئی افتاد بڑے ذہنی یا جسمانی، پاندان ہی مدد کو آتا تھا۔ اب بہت دنوں سے جیسے خاندان میں بے کہا معاہدہ سا تھا کہ ان دنوں کی بات کوئی نہ کرتا تھا۔ جب ان کا باپ اور وہ خود سڑک پر کاروں میں بیٹھنے والیوں کے ہاتھ پھول اور کلیاں بیچتے تھے۔ کبھی پیسے ہاتھ لگتے تھے کبھی گالیاں۔

وہ دن منیر کو خوب یاد تھے، اب بھی اکثر وہ ان دنوں کی یاد میں کھو جاتا تھا اور کبھی کبھار خود کو ڈبے میں بیلے کی کلیوں کے ہار اور

کنگن لٹکائے کار کار پھرتا خواب میں دیکھتا تھا۔

اماں بھیگے بجن تاول میں چھپا کر پان لگا رہی تھیں کہ منیر نے تاڑ لیا۔ چھالیہ کھانے کے بہانے اٹھا اور اماں کے ہاتھ سے سلاد کا پتہ جھپٹ لیا۔ "اماں آپ باز نہیں آئیں گی اپنی حرکتوں سے ۔۔۔ پھر سلاد کا پتہ کھا رہی ہیں پان کی جگہ ۔۔۔"

"کہہ تو دیا، بہت دفعہ کھایا ہے۔ کراچی میں جب کبھی پان کا قحط پڑا یہی بے چارہ کام آیا، عادت پڑ جاتی ہے۔"

"یہاں تو قحط نہیں ہے۔ جتنا کہیے لا دوں ۔۔" منیر بولا۔

"تو تم ڈھولی بھر پان ایک مرتبہ لا کر کیوں نہیں دے دیتے۔"

یوسف بگڑ کر بولا "اماں نے خود منع کیا تھا ۔۔"

منیر نے معذرت کی ۔۔ "کہتی تھیں جب ختم ہو جائیں گے بتا دیا کروں گی ۔۔"

"ارے میں نہیں کھاتی تمہارے پان ۔۔" اماں نے ہاتھ نچایا۔ "اس سے تو بہتر ہے کہ انسان برے نوٹ پر چونا کتھا لگا کر چاٹ لیا کرے، ہاں نہیں تو۔ بھلا بتاؤ اتنے مہنگے پان! ۔۔"

"اماں مہنگے نہیں ہیں امریکہ کے حساب سے ۔۔ کتنی دفعہ آپ کو بتایا۔ یہ جو ٹھنڈی بوتل آپ پیتی ہیں، ڈبل روٹی آپ کھاتی ہیں یہ سب اسی حساب سے آتی ہیں، تو کیا آپ کھانا پینا چھوڑ دیں گی؟"

"میرا بس چلتا تو چھوڑ دیتی ۔"

"کتنی دفعہ تو آپ کو بتایا کہ ڈالر میں کماتے ہیں تو ڈالر میں خرچ کرتے ہیں۔"

"میں تو یہ سوچتی ہوں کہ دن بھر میں جو پان میں کھاؤں ہوں، اس میں شیرے کی بیوہ کا ایک جوڑا بن جاتا یا اس کے بچے کے جوتے آجاتے۔"

"وہاں جو پان آپ کھاتی ہیں اس کی بچت کریں تو وہاں بھی شیرے کی بیوہ کا جوڑا بن جائے۔"

"ارے نہیں، وہاں اب پان بہت سستے ہو گئے ہیں۔ کھیت کے کھیت لگ گئے ہیں ۔۔ میں نے خود پھلواری لگائی ہے۔ ضرورت ہی نہیں بازار سے منگوانے کی۔"

اچھا تو یوں کرتے ہیں کہ آپ کے پان، آپ کی چمپا چنبیلی سب یہاں منگوا کے لگا دیتے ہیں، پھر تو آپ نہیں جائیں گی؟" یوسف بولا ۔۔ یوسف منہ بولا بھتیجہ تھا اور بقول منیر "اماں سے خوب لبرٹی" لیتا تھا۔

"ارے وہ یہاں لگ ہی نہ سکیں ۔۔" اماں نے ناطق فیصلہ دے دیا۔ "تمہیں کیا پتا ۔۔ بہو نے جو پرس دیا تھا نا یہاں لانے کو ۔۔ اس میں پلاسٹک کی تھیلی میں چھپا کر ایک پان کا پودا رکھ لائی تھی۔ یہاں آتے ہی گملے میں لگایا مگر وہ نہ ہوا۔"

اچھا تو آپ اسی غم میں واپس جا رہی ہیں کہ آپ کا پان نہ پنپا۔" یوسف نے شرارت سے کہا۔

"تو کراچی میں کون سے ایک دن میں لگ گئے۔" منیر بولا۔ "وہاں بھی مشرقی پاکستان یا بنگلہ دیش سے لا کر لگائے گئے تھے، برسوں بعد آج سن رہا ہوں کہ سندھ میں کھیت کے کھیت لگ گئے ہیں۔ ہو سکتا ہے یہاں بھی کبھی نہ کبھی لگ جائیں۔"

"اے ہے تو میں اس انتظار میں یہاں سوکھتی رہوں ۔۔ نہ بھیا، یوں کرو اگلے ہفتے ٹکٹ دلوا دو ۔۔ اسی مہینے تمہارے خالہ زاد بھائی کی شادی ہو رہی ہے اس میں بھی شریک ہو جاؤں گی ۔۔"

"ارے ارے، تائی اماں کوئی بات بھی ہو ۔۔" یوسف جلدی سے بولا۔ "آپ امیگریشن پر آئی ہیں کوئی مذاق ہے۔ پکڑ لیں گے، یہاں کی پولیس بڑی سخت ہے ۔۔"

"کیوں پکڑ لیں گے، کیا ان کی چوری کر کے بھاگ رہی ہوں۔ اپنے ملک جا رہی ہوں ۔۔"

"ان کا گرین کارڈ کیوں لیا تھا پھر؟"

"وہ ان کی صورت پر مار جاؤں گی ۔۔" اماں نے تیزی پکڑی۔ "میں نے تو اس سفارت خانے والے امریکن سے بھی کہہ دیا تھا جو اردو میں بات کرے تھا کہ بھیئے یہ نہ سمجھنا کہ میں تیرے ملک میں رہ پڑوں گی۔ اللہ رکھے یہاں بھی میرے بیٹے پوتے ہیں، میں آتی جاتی رہوں گی ۔۔"

یوسف بے اختیار اتنے زور سے ہنسا کہ جھیل کے کنارے کھیلتی دو لمبی چوٹیوں والی چھوٹی چھوٹی بچیوں نے مڑ کر دیکھا اور خود بھی ہنس دیں۔ "غضب خدا کا ۔۔ یہ کہہ دیا آپ نے!" یوسف مزید لطف لیتے ہوئے ہنسے چلا گیا ۔۔ "پھر کیا بولا وہ امریکن؟"

"بس ہنس دیا اور بولا، اچھا اماں ایک ہفتے بعد آ کر ویزہ لے جانا ۔۔ اے اتنا اچھا لگتا تھا گورا گورا بھولا بھالا سا اردو بولتا ہوا ۔۔"

"تو بھائی ہم کالے کلوٹے اردو بولتے بھی برے لگتے ہیں تائی اماں کو ۔۔"

"یہ میں کب کہوں ہوں۔ میں تو یہ بتا رہی ہوں کہ عجیب سی بات لگتی تھی اس کا اردو بولنا ۔۔ اگر کوئی ہوئی تو اردو میں بولا کرتی فون اٹھا میں نے فون اٹھایا تو بالکل صاف بیچ میں بولا کہ السلام علیکم اماں ۔۔ اے ہے مجھے ایسا اس پر پیار آیا جیسے میرا عزیز بول رہا ہو۔ عزیز بھی بڑا

ہو کر ایسا ہی نکلے گا۔"

"آپ نے تو غلط بات کہہ دی پھر بھی اس نے ویزا دے دیا۔ مگر اب آپ کو واپس ہرگز نہیں جانے دیں گے۔ کیوں نہ جانے دیں گے، کتنے ہی واپس چلے گئے۔ اللہ رکھے ہمارے پاکستان نے کہہ رکھا ہے" جو ایک دفعہ پاکستانی ہوا، وہ سدا پاکستانی رہا۔

"اوہو۔ آپ کو تو بڑی معلومات ہیں۔" یوسف نے ظاہر کیا جیسے وہ سخت متاثر ہو رہا ہو۔

"مگر پھر یہاں نہیں آسکیں گی، آپ دوبارہ امیگریشن پر۔" منیر نے کہا۔

"کیوں نہیں، وزیٹنگ ویزا لے کر آجاؤں گی جب دل چاہے گا۔ رہنے کو نہ میں اب آئی، نہ آئندہ آؤں گی۔ تو بھلا سردیوں جاڑے کے پودوں کی طرح اندر بیٹھے رہو۔ ایک ذرا موسم اچھا ہوا تو مار بجلیاں چمک رہی ہیں، گرج چمک کے طوفان دم نہ لینے دیوے ہیں۔ یہاں سیلاب آگیا، وہاں زلزلہ آگیا۔ روز کے قتل، روز کے حادثے۔ کوئی دن نہ جائے ہے کہ دو ایک گھر جل کے راکھ نہ ہو جا ہیں۔ لکڑی کے موئے مکان جیسے گڑیا گھر۔"

"لیجیے بیٹھے بٹھائے سارے عیب نکل آئے بے چارے امریکہ میں۔" منیر نے دہائی دی۔

"اے ہے تو کیا میں نے نکالے ہیں؟ کوئی غلط بات کہی میں نے؟"

"تو کیوں ہزاروں لوگ آرہے ہیں امریکہ؟ اپنے ملک میں گزارا ہوتا تو یہاں کیوں آتے؟" منیر باقاعدہ برا ماننے لگا۔

"ارے یہاں بھی لشتم پشتم گزارا کرے ہیں۔ کوئی رات کی نوکری کرے ہے۔ کسی کی بیوی بچے سب جتے ہیں۔ بس شان یہ ہے کہ بڑے ملک میں رہ رہے ہیں جیسے پرانے زمانے میں قلعے کے دھوبیوں اور بھنگیوں کی شان تھی کہ بادشاہوں کے کپڑے دھوتے اور شہزادیوں کا میلا اٹھاتے تھے۔"

"یہ تو نہ کہیے اماں۔" منیر نے اور منہ تھوتھالیا۔ "بڑے بڑے کھاتے پیتے لوگوں کے، سرکاری افسروں کے بچے یہاں رہ رہے ہیں۔"

"ہاں تو اسی لیے رہتے ہوں گے کہ وہاں ان کی وہ شان نہ رہی ہوگی۔ یہاں تو خدا قرضوں کا بھلا کرے سب کی شان بنی ہوئی ہے۔ قرضے کے کپڑے پہن کر شادی ہوگئی، قرضوں سے دعوت ہوگئی۔ ہمارے ہاں جب نوابی ڈوبی تھی تو لوگ ایسے ہی قرضوں سے جشن منایا کریں تھے۔ مجھے تو ایسے قرضوں کے نام سے ہی ہول آئے ہے۔"

"تائی اماں آج کل تو ملک قرضوں پر چلتے ہیں۔ گھروں کی کیا بات ہے۔"

"خیر۔ میں تمہاری طرح پڑھی لکھی تو نہ ہوں پر اتنا تو مجھے بھی پتا ہے کہ مالدار ملک قرضہ دے گا اور غریب ملک قرضہ لے گا۔ کبھی یہ تو نہ سنا کہ مہاجن قرضہ لے اور کسان قرضہ دے۔"

"اب بولو۔" منیر نے یوسف کو چیلنج کیا۔

تائی اماں، نواب لوگ مہاجنوں سے قرضہ لیتے تھے۔ ان کو معلوم تھا ان کے پاس دینے کو کچھ نہیں۔ حویلیاں، باغات، زمینیں قرق کرالیں گے۔ یہاں کے قرضے ویسے تھوڑا ہی ہیں۔"

"کیوں نہیں! یہاں تو تم لوگوں کی زندگیاں گروی ہیں۔ نہ قرضہ اترے گا نہ تم یہاں سے نکلو گے۔"

"اماں، سچی بات تو یہ ہے کہ قرضے کا بہانہ ہے۔ قرضوں میں گرفتار ہو کر ہم خوش ہوتے ہیں کہ اپنے ماں باپ سے کہہ سکیں گے کہ ہم قرضوں کے جال میں بندھے ہوتے ہیں۔ آپ یہ باتیں نہ سمجھیں گی اماں، آپ تو گھر میں بیٹھی رہتی ہیں وہاں آدمی کی عزت نفس باقی نہیں رہتی۔ میں نے پولیس والوں کو اپنے آنکھ سے رکشا اور ٹھیلے والوں کو ٹھوکریں مارتے دیکھا ہے۔ ہر دفتر میں ہر شخص آنکھیں دکھاتا ہے، بے عزتی کرتا ہے، خوشامد کرواتا ہے۔ یہ باتیں ہم سے برداشت نہیں ہوتیں۔ یہاں آپ کتنے دفتروں میں گئیں۔ کسی نے کہا یہ ہمارا کام نہیں دوسرے کمرے میں جائیے؟ اوپر جائیے یا نیچے جائیے؟ دکانوں میں اور بینکوں میں لوگ آپ کا کام ایسے ہنس ہنس کر کرتے ہیں جیسے آپ کے بغیر ان کی دکان یا بینک دیوالیہ ہوا جا رہا ہو۔

فراڈ یہاں بھی ہوتے ہیں۔" اب کے یوسف بولا۔ "مگر عام لوگوں کو اس سے فرق نہیں پڑتا۔ لوگ چھوٹے چھوٹے کاموں کے لیے رشوت نہیں مانگتے۔ یقین مانیے تائی اماں ہر وہ لڑکا یا لڑکی جو اپنے ملک سے صرف پڑھنے آتے ہیں وہاں سے رخصت کے وقت ایسے خراب تجربوں سے گزرتے ہیں کہ کبھی واپسی کا خیال بھی دل میں آئے تو وہ باتیں یاد کر کے دل اور ضمیر کو تھپک دیتے ہیں۔"

"اور یہاں کے آرام دیکھتے۔" منیر نے گرہ لگائی۔ "کیسے کیسے گرج چمک کے طوفان آئے کسی دن بجلی گئی؟ فون خراب ہوا؟ پانی کی کمی ہوئی؟ آندھی آئی تو ریت کا ذرہ نظر آیا؟"

"ارے ایسے آرام کو لے کر کوئی چاٹے۔ سارا دن کوئی بات کرنے کو نہیں۔ فون ٹھیک ہو تو بات کس سے کریں۔ ٹی۔ وی کھولو تو کم بختیں ناف دکھائی، ننگی ناچتی کودتی پھرے ہیں۔"

"تو آپ وی سی آر پہ ہندوستانی فلمیں دیکھیے، پاکستانی ڈرامے دیکھیے۔"

"کب تک دیکھوں — میں اپنے گھر کے ڈرامے بھی تو جا کر دیکھوں — بہو نے گھر کا گھروا کر دیا ہوگا — جانے میرے پودے کس حال میں ہوں گے؟"

"اچھا دیکھ لیجیے گا، پہلے یہ باغ تو دیکھ لیں۔" منیر نے کہا۔

دونوں نے اماں کو کشتی میں بٹھایا۔ لائف بیلٹ باندھ، چپّو کھیتے پوری جھیل کی سیر کرائی۔ پھر درختوں سے ڈھکی ایک چھوٹی سی ٹرین کی سیر کو بھی گئیں مگر ان کا دل اکھڑا اکھڑا سا تھا۔ پگڈنڈی کی سیر سے لوٹتے ہی بولیں: "تو بھئی امریکہ کی بہار بھی دیکھ لی، خزاں بھی دیکھ لی، سب سے اونچی عمارت بھی دیکھ لی، سب سے اونچا مینار، سب سے بڑا ابل الابلا سب دیکھ ڈالا۔"

"مگر ابھی آپ نے آدھے امریکہ کی سیر بھی نہیں کی—" منیر بولا۔

"بہت کی، امریکہ تو پوری دنیا ہے، اس کی سیر کرتے کرتے ختم ہو گئی تو کیا ہوگا؟—"

"ہوگا کیا! — آپ کو یہاں کے کسی خوب صورت ہرے بھرے قبرستان میں جگہ مل جائے گی۔ ہر اتوار کو پھول آپ کے سرہانے دھرے ہوں گے۔ اس بات کا ذمہ میرا—" یوسف یہ بات کہتے کہتے دھیرے دھیرے تائی اماں سے دور سرکا۔

توبہ، توبہ — ایسے پھول، نہ خوشبو، نہ کچھ — اس سے تو اچھا ہو کہ پاکستان میں میری قبر پر ہرا دھنیہ لگا دو — مجھے تو ہرے دھنیے کی خوشبو تمہارے ان جاپانی پھولوں سے اچھی لگے ہے۔"

"جاپانی، یا امریکی؟"

"پہلے زمانے میں ہر گھٹیا مال کو جاپانی کہا کریں تھے۔"

"اب نہ کہیے گا — کسی جاپانی نے سن لیا تو سخت برا مانے گا۔"

"بات یہ ہے اماں کہ آپ کے ٹکٹ کے پیسے تو ہیں نہیں میرے پاس۔" منیر نے یوسف کو آنکھ ماری۔ "ساری کی ساری تنخواہ تو قرضے میں چلی جاتی ہے۔"

"پیسے نہیں ہیں تو یہ لو—" اماں نے جھٹ سونے کی چوڑیاں اتار منیر کی طرف بڑھائیں۔

منیر گھبرا گیا۔ یوسف اس کی مدد کو آیا— "تائی اماں — یہ یہاں نہیں چلتیں—" یوسف نے بینچ پر نیم دراز ہو کر لال جالی دار ٹوپی آنکھوں پر رکھ لی۔

"کیوں؟ —" اماں بگڑیں — "چوبیس کیرٹ کا سونا ہے، کھرا بالکل۔"

"امریکہ میں تو چودہ کیرٹ کا سونا چلتا ہے—"

"ہاں کھری چیزیں یہاں کیسے چلیں گی—" اماں نے طنز کا کوڑا گھمایا۔ "جب بال نقلی، ناخون نقلی، پلکیں نقلی — اور تو اور آنکھیں نقلی، وہ ٹی وی والی لونڈیا روز اپنی آنکھوں کے رنگ بدل بدل کر دکھائے ہے، ابھی بھوری، ابھی کرنجی، ابھی نیلی جیسے آسمان — ان کے دل بھی نقلی ہوں تو کیا تعجب!"

"اماں — بناوٹی ہوں یا اصلی، ہم لوگوں سے تو صاف ہی ہوں گے—"

"مشین سے صاف کر لیتے ہوں گے—" اماں نے پھرتی سے کہا۔ "جیسے وہ قالین صاف کرنے کی مشین ہے۔ ایسی ہی کوئی مشین ہو گی، برتن مشین سے دھلیں۔ شیو مشین سے ہوں۔ کاریں مشین سے دھلیں تو دل بھی صاف ہو جاتے ہوں گے کسی مشین سے — لو یہ رکھو۔" اماں نے پھر چوڑیاں بڑھائیں۔ دھوپ سینکتی لڑکیاں یہ منظر دلچسپی سے دیکھ رہی تھیں۔

"ارے اماں، کیوں شرمندہ کرتی ہیں۔ اگر آپ اتنی ہی سنجیدہ ہیں تو چلی جائیے، ٹکٹ آ جائے گا۔" پھر وہ روہانسی شکل بنا کر بین کرنے کے انداز میں بولا۔ "کیسی کیسی خوب صورت جگہیں اماں کو دکھائیں، ہم تو سمجھتے تھے اماں کہیں گی بس یہیں ایک گھر بنوا دے میں نہ جاؤں گی۔ اب ذرا اس منظر کو دیکھیے، کبھی دیکھا تھا، ایسا سماں —؟" منیر نے نہر میں ڈوبے رنگ برنگے درختوں کے عکس اور پہاڑوں پر پینٹنگ کی طرح خوب صورت درختوں کی طرف اشارہ کیا۔

"ہاں جگہیں تو بڑی اچھی ہیں، مگر اپنا گھر اپنا گھر ہے۔"

تائی اماں کو شاید امریکہ پسند نہیں آیا۔" یوسف بولا۔

"اے لو کیوں پسند نہ آتا، فرعون کے زمانے کے اللہ مارے درخت ابھی تک ہرے بھرے کھڑے ہیں اور ان درختوں کے بیچ میں سے کاریں نکلی جا رہی ہیں۔"

"ارے تائی اماں صرف ایک درخت ایسا ہے پورے امریکہ میں جس کے بیچ میں سے کار نکل جاتی ہے۔"

"چلو ایک ہی سہی، ہرے بھرے درخت کے تنے سے کار نکل جائے! ہے تو بھئی جادو نگری، مگر دیکھنے بھر کی۔"

"کیوں رہنے میں کیا حرج ہے؟"

"ارے، کوئی سرکس میں جا کر رہا کرے ہے، جا کر دیکھا، دل خوش کیا اور آ گئے—"

"ہائے، آج تائی اماں نے میرا دل توڑ دیا—" یوسف نے دھڑ سے گردن ایک طرف ڈھلکا دی۔ "اب تو میں تائی اماں کو اپنے خرچ پر واپس

بھیجوں گا اور اپنی شادی میں بھی نہیں بلواؤں گا۔“

”تیری شادی تو میں وہیں کروں گی تجھے بلوا کر اور تیرا پہلا بیٹا ہوگا تو آؤں گی، دیکھوں گی تو کیسے روک لے گا۔“

”اب اماں پر جانے کی دھن سوار ہوگئی ہے تو دیکھ لینا اب ٹھہریں گی نہیں۔ آئی تھیں تو وزن سو پونڈ سے کم تھا۔ بیٹوں کے ہاں رہیں یا بیٹیوں کے، سب کو کھلا کر بچا کھچا کھاتی ہیں مگر رہیں گی وہیں۔“

تو کیا ہوا۔ زمین میں جو کچھ بو دے ہے وہ اپنی پھلواری کو دے دیوے ہے۔ خود بنجر ہو جائے پر اس کی چھاتی پر پھول کھلے رہیں۔ میں یہاں دنیا بھر کی سیر کر دوں۔ آئس کریم اور چاکلیٹ کھاؤں پر دل تو میرا وہیں ہے۔“ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر وہ بینچ سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”اب چلو، میری نماز کا وقت ہو گیا۔ یہاں تو ایک سال میں کان اذان کو ترس گئے، وہاں تو بھیا دس اذانیں ایک ساتھ کانوں میں آیا کریں تھیں۔“

”دس اذانوں کا ثواب آپ کو ملتا ہوگا؟“

”ہاں اور کیا!۔“

”نماز اب یہیں پڑھ لیں اماں، پھر چلیں گے۔“ منیر نے کہا۔

اماں نے ساتھ لاتے پانی سے وضو کیا اور ایک طرف جھنڈ کے پیچھے جائے نماز بچھا کر نماز پڑھنے لگیں۔

”اماں نے تو فیصلہ کر لیا مگر ہمارا کیا ہوگا یار۔ ہم تو نہ ادھر کے رہے نہ اُدھر کے۔“ منیر نے غم سے بھرے لہجے میں کہا۔

”ہر دور کا کوئی نہ کوئی مسئلہ ہوتا ہے۔ ہمارے دادا پر دادا کی نسل کے لوگ ہندوستان میں نوکری کے لیے مارے مارے پھرتے تھے۔ ان کی بیویاں سسرال میں بیٹھی ساون میں ساجن کے آنے کی دعائیں مانگتی رہ جاتی تھیں۔ ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم رہیں پردیس میں اور دل رہے دیس میں۔“

اماں نماز پڑھ کے آئیں تو دیکھا کہ دونوں خاموش بیٹھے ہیں۔ منیر کسی خیال میں گم دریا کی اور تکے جا رہا ہے۔ ابھی اس کا اٹھنے کو جی نہیں چاہ رہا۔ انھوں نے سوچا اور دوبارہ بینچ پر ٹک گئیں۔ چڑیاں مسلسل انگریزی میں مختلف راگ الاپ رہی ہیں۔

”اماں!۔“ منیر نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”آپ اس پتے کو ایک دفعہ اور ڈھونڈ کر دیکھئے۔ ابا مرحوم کے گھر یا بینک کے کاغذات کو سنبھالیے۔ میں نے اُن سے بہت سنبھال کر رکھنے کو کہا تھا۔“

”بھیا، جانے کس کا پتا ہے جس کے پیچھے تو پڑا ہوا ہے۔ میں نے ہزار ڈھونڈا، مجھے کہیں نہ ملا۔ تو بھی چلتے وقت لے کر آیا تھا اس کا کیا ہوا؟“

اماں۔ وہ میں نے بچپن میں اس وقت اتارا تھا جب مجھے پڑھنا نہیں آتا تھا۔ اپنے خیال میں تو ٹھیک ہی اتارا تھا مگر یہاں آ کے پتا چلا کر غلط ہے۔ جتنے خط لکھے اسی ریمارک کے ساتھ واپس آ گئے کہ پتا صحیح نہیں ہے۔“

”تو کس البیلی نار کا پتا ہے جسے بچپن سے سنبھال سنبھال کے رکھ رہے ہو؟۔“ یوسف نے چھیڑا۔

”البیلی نار کا نہیں۔ ایک فرشتہ خاتون کا پتا ہے۔“

”ارے آج تک اس نے مجھے نہیں بتایا۔ بس ایک پتے کے پیچھے پڑا رہتا تھا۔ بچپن میں کاغذ کے پرزوں پر لکھ لکھ چھپاتا پھرتا تھا۔“

”اتنی جگہ لکھا پھر بھی ان کا پتہ نہ چلا۔“ منیر نے دکھ سے کہا۔ ”ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا ابا کو دے دیا تھا وہ بھی نہ ملا۔“

”کچھ تو بتاؤ قصّہ کیا ہے، اب ہم سے کیا پردہ!“ یوسف نے کہا۔

”بتا دوں اماں؟“ منیر نے اماں کی طرف دیکھا۔

اے لو۔ مجھے تو خود معلوم نہیں الٹا مجھ سے پوچھ رہا ہے۔“

”ابھی اماں نے بتایا تھا کہ ہمارے ہاں حیدرآباد سے پھول آتے تھے اور گھر میں گوندھے جاتے تھے۔ میں چھوٹا سا تھا تو کاروں میں بیٹھنے والیوں کے ہاتھوں گجرے اور کنگن بیچا کرتا تھا۔ ایک دن ایک دبلی پتلی بیگم صاحبہ نے بڑے پیار سے میرا نام پوچھا میں نے بتایا تو کہنے لگیں۔ عثمان نام تو بہت اچھا ہے، پھر بڑی ہمدردی سے بولیں، اسکول جاتے ہو؟ ۔ میں نے بڑے اعتماد سے کہا ”نہیں“ تو مسکرائیں اور بڑی اپنائیت سے کار کی کھڑکی پر جھک کر کہنے لگیں۔ ”تو کیا ساری عمر اسی طرح سڑکوں پر خوار ہوگے بیوی بچے ہوں گے تو انھیں کہاں سے کھلاؤ گے۔ ان پیسوں میں تو گزارہ نہیں ہوگا، اسکول میں پڑھو لائق بنو۔“ ”پیسے نہیں ہیں۔“ میں نے پڑھا پڑھایا، رٹا رٹایا فقرہ دہرا دیا۔ ”پیسے کسی کے پاس نہیں ہوتے۔“ وہ بولیں۔ ”پیسے تو پیدا کرنے پڑتے ہیں۔ بات سنو، تمہیں ذرا جم کر لڑنا ہوگا۔ ماں باپ سے آج ہی جا کر کہنا کہ میں تو ہر حالت میں پڑھوں گا۔ آئس کریم اور چاٹ نہ کھانا، پیسے جمع کرنا۔ پڑھائی تو مفت ہے، قلم، دوات اور صاف ستھرے کپڑوں کے لیے شام کو پھول بھی بیچنا مگر ایک بات یاد رکھنا بھیک نہ مانگنا۔ پھول لیے بغیر کوئی پیسے دے تو نہ لینا۔ اور پڑھائی نہ چھوڑنا۔ میٹرک تک پڑھ لو تو مجھے خط لکھنا میں تمہیں امریکہ بلواؤں گی۔ مگر میٹرک تک تمہیں خود پڑھنا ہوگا۔ یہ لو میرا پتا۔ انھوں نے ایک کاغذ پر پتا لکھ کر دیا۔ سنبھال کے رکھنا۔ لاؤ ابا کو بھی دے دینا اور دو چار جگہ نقل کر کے رکھ لینا۔“

”اچھا تو یوں لیک دم تجھے پڑھنے کی چاٹ لگی۔ پھر تو میٹرک پر تو نہ رکا بس پڑھتا ہی چلا گیا۔“

”ہاں اماں۔ شاید یہی وہ چاہتی تھیں۔ پیسے تو ہزاروں نے دیے تھے، حوصلہ صرف انھوں نے دیا تھا۔ میں سوچتا ہوں میں اس گمنام ہستی

کا قرض دار ہوں، وہ اب تک ملی نہیں ہیں مگر ہر کامیابی پر دل ہی دل میں ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ شاید کسی دن ان کا پتا مل جائے تو ان کے گھر جاؤں گا اور زبانی شکریہ ادا کروں گا۔"

"اچھا گھر جا کر ایک دفعہ اور ڈھونڈ دوں گی۔ انھوں نے تو ہم سب پر احسان کیا۔۔۔ نہ تو پڑھتا، نہ مٹھی بھر بھر روپیے بھیجتا، نہ چھوٹے بہن بھائی پڑھتے، نہ گھر بنتا۔۔۔ اللہ اس نیک بخت کو خوش رکھے۔۔۔ مگر اب ان کی بیوی بچوں والی بات پر بھی تو دھیان دے۔۔۔"

"ارے نہیں اماں، اب عمر نہیں، چھوٹے بہن بھائیوں کی شادیاں ہو گئیں، کتنے بھتیجے بھانجے ہو گئے۔ اماں آپ چلی جائیں گی تو یہاں کے پودوں کا کیا ہو گا؟ یہ جو آپ نے میرے سینکڑوں ڈالر کھپا دیئے۔" منیر نے موضوع بدلا۔

"تم دیکھنا بھالنا۔۔۔ ان پودوں کی اٹھا دھری بھی میرے بس کی نہ ہے۔۔۔"

"نہیں، مجھے کچھ معلوم نہیں، اور میرے پاس وقت کہاں ہے؟ سب جل جائیں گے۔۔۔"

"جل جانے دو۔۔۔ پلاسٹک کے لاکر لگا لینا۔۔۔ یہاں تو آتے اچھے ملے ہیں، پتہ بھی نہ چلے کہ اصلی ہیں یا نقلی ہیں۔ آؤ اب چلیں۔"

پندرہ دن بعد اماں کے ہاتھ پر ٹکٹ رکھا تو وہ اپنا سامان ایک ایک کر کے پہلے ہی باندھ چکی تھیں۔ بہو بیٹیوں کے لیے مصنوعی زیورات، بیٹوں کے لیے شوخ رنگ کی ٹائیاں، پوتے نواسوں کے بیٹری سے چلنے والے طرح بہ طرح کھلونے۔۔۔ اس دن وہ ایک ایک کا نام لے کر سوغاتیں گنواتی رہیں۔ "منا اب اسکول جانے لگا ہو گا۔ ننھی پاؤں پاؤں چلنے لگا ہو گا، شازی دانت نکال رہی ہو گی۔۔۔"

"تو۔۔۔ یوں کہیے نا، آپ ان کی خاطر جا رہی ہیں، اتنے دن سے اپنے پودوں کی باتیں کر رہی تھیں۔ آم پپیتے، گلاب چمپا، چنبیلی۔۔۔" "میز نہا اور ہزار دھنیہ۔۔۔" یوسف نے گرہ لگائی۔

"ارے بے وقوفو۔۔۔ وہ چمپا چنبیلی ہو یا پوتے نواسے ہوں، یہ بھی تو میری پھلواری ہی ہے۔۔۔" اماں نے زور دے کر کہا "مگر تم کہاں سمجھو گے ان باتوں کو۔۔۔"

"نہیں اماں میں سمجھتا ہوں، بلکہ میں خود پھلواری لگا رہا ہوں آپ کی طرح کی۔۔۔"

"ارے ہٹ، شادی کرتا نہیں تو کیا لگائے گا پھلواری۔۔۔"

"میں ایک بچہ گود لے رہا ہوں۔۔۔"

"ہیں! سچ مچ!۔۔۔" مارے حیرت کے اماں کی آنکھیں پھٹ گئیں "کہاں ہے وہ بچہ؟۔۔۔"

"دنیا میں کسی نہ کسی جگہ ہے، آپ ٹیلی ویژن میں اشتہار دیکھتی ہیں نا۔ بس ایسا ہی بچہ گود لوں گا۔۔۔ ہر ماہ کچھ پیسے دینے ہوں گے وہ بچہ لکھے گا، پڑھے گا۔۔۔ میرے پاس اس کی تصویریں آئیں گی۔ رپورٹ کارڈ آیا کرے گا، میں اسے اپنی تصویریں اور خط بھیجوں گا۔ اگر خدا نے توفیق دی تو کبھی اسے اپنے پاس بلوا لوں گا۔ کیا خیال ہے آپ کا؟"

"نیک خیال ہے بھیا اور کیا کہوں۔۔۔ اپنے ملک کا کوئی بچہ پال لو۔۔۔"

"انگریزی کی مثل ہے نا اماں کہ خیرات اپنے گھر سے شروع ہوتی ہے۔۔۔"

"اماں، بات یہ ہے اور شکر کی بات ہے کہ دنیا کے غریب ترین ملکوں میں اپنے ملک کا نام نہیں ہے۔ میں نے بنگلہ دیش کا ایک بچہ گود لیا ہے۔ میں نے اپنی درخواست میں ایک نوٹ لکھ دیا تھا کہ اس بچے کا تعلق پھولوں سے ہو تو بہتر ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ اس بچے کا باپ مالی تھا، سرکٹ ہاؤس کے پودوں کی دیکھ ریکھ میں مٹی ہو گیا، دیکھیے یہ اس کی تصویر ہے۔۔۔"

اماں نے ہاتھ میں تصویر لے کر غور سے دیکھی۔ "ہاں ذہین معلوم دے ہے۔"

"اماں، جس طرح دیا سے دیا جلتا ہے اسی طرح پھلواری سے پھلواری بڑھتی ہے۔ میں نے بہت پہلے یہ سوچ لیا تھا کہ میری محسن مجھے ملیں نہ ملیں کسی ایک بچے کو حوصلہ دینا یا کامیابی کا راستہ بتانا مجھ پر فرض ہے۔"

"ہاں، کیوں نہیں۔۔۔ خدا کرے تیری لگائی ہوئی پھلواری بھی خوب پھلے پھولے۔"۔۔۔ کہتے کہتے اماں کی آواز رُندھ گئی اور ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

●●

صُبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے

پروفیسر محمد حسن

ڈی، ماڈل ٹاؤن دہلی ۹

ہم فرسٹ کلاس کے ڈبے میں چار دوست تھے ریل گاڑی تیزی کے ساتھ پنجاب سے بلوچستان کی طرف بھاگی جا رہی تھی رات کا دامن دور دور تک پھیلا تھا نیند چاروں میں سے کسی کو نہیں آرہی تھی جھلملاتی روشنیاں دور سے ریل کی کھڑکیوں سے نظر آتیں اور گزر جاتیں۔ ہماری محفل میں ایک دوست ایسے بھی تھے جنھوں نے تین شادیاں کی تھیں۔ ان کی شادی کا تذکرہ ہم آپس میں زیر لب کرتے کہ تیسری بیوی ان کے ساتھ رہتی تھیں یا وہ ان کے ساتھ رہتے تھے مگر پہلی دو یا شاید تین بیویوں سے جدائی ہو چکی تھی کوئی مرد آدمی آج بیسویں صدی کے آخر میں اس طرح بیگموں کی ترپل لگالے تو ہے نا تعجب کی بات!

کچھ ایسے رنگین مزاج بھی نہ تھے شراب کیا سگریٹ اور پان تک کو ہاتھ نہ لگاتے تھے چائے تک سے دور بھاگتے تھے دل میں ہم میں سے کسی کے گدگدی ہوئی کہ انھیں چھیڑا جائے اور وقت پیری شباب کی باتیں ہو جائیں ذرا تفریح رہے گی اور اس خوش گپی میں رات کٹے گی۔ ویسے جن صاحب کا ذکر ہے وہ بالکل سیدھے سادے سے تھے برتاؤ ان کا دوسروں سے کچھ اس طرح کا ہوتا تھا جیسے کسی بات کا برا نہیں مانتے ہوں۔ زندگی بے پناہ قسم کی سادگی میں گزارتے تھے ہنستے کم تھے اور معلوم یہی ہوتا تھا جیسے کسی بات کا اثر نہیں لیتے۔

خیر کسی نے کہا اکرام صاحب یہ جو آپ روز نئی شادیاں کرتے ہیں اور چھوڑ دیتے ہیں اس کا راز کیا ہے۔

اکرام نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے کہا "کوئی راز نہیں ہے۔"

ہم میں سے کسی نے لقمہ دیا "راز نہیں تو آخر واقعہ کیا ہے۔"

اکرام نے ایک لمحے کے لیے خاموشی اختیار کی پھر ہمیں غور سے دیکھا اور سوالیہ انداز میں بولے "سنیں گے؟"

سب نے بہ یک آواز جواب دیا "ضرور"

اکرام نے بڑی متوازن آواز میں شروع کیا۔

"یہ تو آپ جانتے ہی ہیں اتر پردیش کا رہنے والا ہوں تعلیم سے فارغ ہوا تو خیال آیا قومی یک جہتی کی باتیں سب کرتے ہیں کوئی اس کام کو انجام نہیں دیتا۔ اتنا بھی تو کوئی نہیں کرتا کہ شمال کے علاقے سے نکل کر جنوبی ہندوستان میں جا بسے وہیں شادی بیاہ کرے وہیں کا ہو رہے اور وہیں کے لوگوں کو اپنا بنالے سوچا کسی سے شکوہ کیوں کریں خود یہ کام کیوں نہ کروں۔

"چنانچہ سامان سفر درست کیا اور سیدھا رخ کیا مدراس کا۔ اتفاق سے یہاں جلد ہی نوکری بھی مل گئی بستر کھول دیا اور یہیں رہ پڑے تھوڑی بہت تامل بول چال کے لیے سیکھی اور سوچا یہ کہ اپنائیت یہاں کے رہنے والوں سے پیدا کرنے کا سب سے بڑا وسیلہ ہے گھر بسانا۔ لہٰذا یہیں کے ایک تامل بولنے والے خاندان میں جا اردو بھی جانتا تھا شادی کا پیام دیا اچھے بیوپاری لوگ تھے صرف دو بہنیں اور دو بھائی تھے ماں کا انتقال ہو چکا تھا۔ باپ نے شادی کے لیے بہت کچھ جہیز دینے پر اصرار کیا مگر ہم نے صاف منع کر دیا کہ ہم جہیز کے نام پہ ایک پیسہ نہیں لیں گے۔ اسی طرح دن گزرتے رہے اس شادی سے ایک بچی پیدا ہوئی۔ مجھے نوکری مدراس سے تھوڑی دور پر ایک اچھے شہر میں مل گئی تھی۔

"ایک دن اچانک یہ اطلاع ملی کہ خسر صاحب کی طبیعت خراب ہے دل کا دورہ پڑا ہے میں بیوی کو ساتھ لے کر مدراس گیا وہ ہسپتال میں داخل تھے وہاں ہم دونوں نے چوبیس گھنٹے ڈیوٹی لگا کر باری باری سے ان کی تیمارداری کی مگر موت کے آگے ایک نہ چلی آخری وقت تھا ان کے دونوں بیٹے دور کھڑے تھے انھوں نے اشارے سے مجھے پاس بلایا اور محبت سے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ کچھ کہنا چاہتے تھے مگر زبان بند ہو چکی تھی کچھ کہہ نہ سکے صرف احسان مندی اور شکریے کے جذبے سے مجھے دیکھا اور دم توڑ دیا۔

رونا پیٹنا پڑ گیا گھر میں کہرام برپا تھا۔ آخر کار تجہیز و تکفین سے نپٹ کر تیجے کے دن خاندان کے لوگ جمع ہوتے اور جائیداد کے بٹوارے کا معاملہ پیش ہوا اس سے پہلے مجھ سے میری بیوی نے بڑے اصرار سے کہا تھا کہ میں جائیداد کے معاملے میں دلچسپی لوں اور ان کی طرف سے پیروی وکالت کروں آخر پوری جائیداد صرف بھائیوں کی تو نہیں ہے بہنوں کا بھی تو حق ہے بڑی بہن کے شوہر ہندوستان سے باہر گئے ہوتے تھے لہٰذا بہنوں کے حق کی وکالت کی ذمہ داری میرے ہی سر تھی۔

"میں ان خاندانی معاملوں میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔ ویسے بھی پیسے اور جائیداد کے معاملوں میں حجت کرنا میرے مزاج کے خلاف تھا اسی لیے مجھے اس میں بڑا تامل تھا مگر بیوی کا اصرار بڑھا تو میں امادہ ہوگیا اور خاندان والوں کے سامنے میں نے یہ بات رکھی۔ بھائی دونوں بڑے ہوشیار اور کاروباری تھے وہ دونوں بہنوں کا حصّہ بھی خود ہی ہڑپ کرنا چاہتے تھے لہٰذا تکرار بڑھی۔ عام حالات ہوتے تو میں خاموش ہوجاتا مگر بیوی نے مجھے کافی تفصیلات سے آگاہ کردیا تھا۔ میں دونوں بہنوں کی جائز وراثت کی تفصیل پیش کرتا رہا۔ بحث میں تلخی پیدا ہونے لگی تو یہ طے پایا کہ معاملہ خاندان کے کسی بزرگ ثالث کے سپرد کردیا جائے وہ جو فیصلہ دے دیں وہ سب کو منظور ہوگا۔

"میں نے خوشی خوشی گھر واپس آکر ساری تفصیل بیوی کو سنائی انھوں نے بھی خوشنودی کا اظہار کیا اور اطمینان ظاہر کیا کہ میں خاندان کے معاملات میں دلچسپی لینے لگا ہوں۔ یہ بات بتانے کی ہے کہ میں نے تامل ناڈو میں رہنے سہنے کے سلسلے میں اس قدر جوش خروش سے کام لیا تھا کہ دور دراز اتر پردیش میں بسے ہوئے اپنے خاندان والوں سے بھی رسم وراہ قریب قریب ترک کردی تھی اور اپنے سسرالی عزیزوں ہی کو اپنا سب کچھ سمجھ لیا تھا۔

"بیوی سے میں نے ثالثی کا ذکر کیا۔ اس پر بیوی نے رضا مندی کا اظہار کیا۔ آخر ہفتے بھر بعد وہ دن آیا جب ثالث کو فیصلہ سنانا تھا اس روز میں نے بیوی اور بچی کو بھی ہمراہ لیا گھر میں تالا ڈالا اور مدراس کے لیے روانہ ہو گئے۔ جب ہم اپنی سسرال پہنچے تو سب ہی لوگ خاموش خاموش تھے ثالث صاحب بھی منہ سے کچھ نہ بولے میں نے سلام دعا کے بعد اس خاموشی کو توڑا اور بھائیوں کی موجودگی میں ثالث سے پوچھا کہ آخر وہ کس فیصلے پر پہنچے ہیں اور جائیداد کی تقسیم کس طرح کی جائے گی۔

"ثالث کے بجائے جواب بھائیوں میں سے کسی ایک نے دیا اور کہا کہ فیصلے کا اعلان ہونے سے پہلے وہ ایک بار تنہائی میں اپنی بہنوں سے ملنا چاہیں گے بھلا مجھے اس میں کیا اعتراض ہوسکتا تھا میں تو جو کچھ کر رہا تھا ان کی بہن کے کہنے پر ہی کر رہا تھا مجھے تو نہ جائیداد کا لالچ تھا نہ روپے پیسے کا۔ میں نے یہ بھی کہا کہ نہ صرف آپ اپنی بہنوں سے الگ الگ تنہائی میں مل آئیں بلکہ انھیں اپنے ہمراہ لیتے بھی آئیں تاکہ جو فیصلہ ہو وہ ان ہی کے سامنے ہوں اور ان کے لیے بھی قابل قبول ہو۔

"تھوڑی دیر میں اور ثالث دونوں انتظار کرتے رہے ثالث سے اس عرصے میں میری کوئی بات نہیں ہوئی۔ اتنے میں بھائیوں کے ساتھ میری بیوی کمرے میں داخل ہوئیں۔ ثالث سے سلام دعا ہوئی ثالث صاحب سے پوچھا کہ جائیداد کی تقسیم کے بارے میں فیصلہ سنایا جائے یا نہیں۔ اس پر میری بیوی نے عجیب نظروں سے مجھے دیکھا اور کہا۔

"حصّہ بانٹنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے دراصل سارا جھگڑا باہر والوں کی وجہ سے پیدا ہوگیا تھا۔ مجھے جائیداد کے بٹوارے سے کوئی دلچسپی نہیں۔"

"یہ جملے میرے دل کو چھید گئے میں تھا وہ باہر والا آدمی۔ میں ہوں وہ بیرونی اجنبی۔ اور باہر والا اس لیے ہوں کہ میں اس خاندان میں پیدا نہیں ہوا اس علاقے میں پیدا نہیں ہوا۔ میں نے اس علاقے کو اپنانے کی کوشش کی اپنوں کو چھوڑ کر جنھیں اپنایا ان کے لیے میں باہر کا آدمی ہوں۔ باہر کا آدمی رہوں گا۔ میں خاموشی سے اٹھا اور بیوی کو ایک طرف بلا کر میں نے صرف اتنا کہا۔

"آج سے باہر کے آدمی سے تمہارا ہر رشتہ ختم ہوتا ہے۔"

"اور چلا آیا۔ اس طرح میری پہلی شادی کی داستان انجام تک پہنچی۔

"برابر سوچتا رہا اپنے طرز عمل کے ہر پہلو پر غور کرتا رہا آخر کیا قصور کیا تھا میں نے۔ جس کی مجھے اتنی بڑی سزا ملی میری بچی مجھ سے چھن گئی بیوی واپس میرے گھر نہیں آئی۔

"شاید غلطی میری ہی تھی میں نے تو انسانی رشتوں ہی کو سب کچھ سمجھا تھا نہ علاقے کو کوئی اہمیت دی تھی نہ زبان کو۔ نہ نسل کا سوال اٹھایا تھا نہ وراثت کا۔ مگر زندگی بھی عجیب سفاک چیز ہے غم کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو روزمرہ زندگی کی ضرورتیں اس کو ہلکا کردیتی ہیں۔ زندگی اکیلے کاٹے نہیں کٹتی تھی آخر حیدرآباد کے ایک گھرانے میں میری آمد ورفت ہوئی خیال تھا کہ یہاں کا رشتہ زیادہ مضبوط ہوگا شمالی ہند سے مدراس کے مقابلے میں حیدرآباد زیادہ قریب تھا۔

"ابھی شادی کی بات چیت چل ہی رہی تھی کہ ایک اور خاندان سے رسم وراہ شروع ہو گئی یہ ایک عرب خاندان تھا جو نظام حیدرآباد کے زمانے میں یہاں آکر آباد ہوگیا تھا۔ ان کی ایک لڑکی شادی کے قابل تھی گھر میں یہ لوگ اب بھی عربی بولتے تھے اردو سمجھتے تھے بولتے بھی تھے مگر بے تکلفی سے بول نہ پاتے تھے لڑکی مجھے پسند تھی خاندان نے بھی اس رشتے کو پسند کیا اور آخر کار شادی ہوگئی وہ بھی سادہ شادی کے بعد میں بیوی کے ساتھ حیدرآباد سے مدراس کے قریب والے شہر آگیا اور مہینوں ہم لوگ ساتھ رہے ایک لڑکا اس بیوی سے پیدا ہوا جو عربوں کی سب ہی خصوصیات رکھتا تھا گورا چٹا، تندرست، گلگوتھنا سا لڑکا تھا ہر وقت مجھے اپنی اردلی میں رکھتا تھا مجھے بھی اس سے بے پناہ لگاؤ تھا۔

"لڑکے کی پیدائش سے چند ماہ بعد ہی میری بیوی کا پورا خاندان حیدرآباد چھوڑ کر سعودی عرب چلا گیا ان کے جانے میں کوئی دقت نہ تھی کیوں کہ وہ سب عرب تھے اور سعودی عرب کی شہریت انھیں حاصل تھی مگر اس دن سے میری بیوی کھوئی کھوئی سی رہنے لگیں اس کا جی اب کسی کام میں نہیں لگتا تھا وہ گھنٹوں بچے کو گود میں لیے کھوئی کھوئی بیٹھی رہتیں اور خالی خالی نظروں سے خلا میں نہ جانے کیا کیا دیکھتی رہتی تھیں میں نے ایک بار نہیں کئی بار اس کے خیالات جاننے کی کوشش کی مگر کامیابی نہیں ہوئی۔

"آخر ایک دن اس نے مجھ سے کہا" میں سعودی عرب جارہی ہوں تم چاہو تو تم بھی میرے ساتھ چل سکتے ہو"۔ میں حیران رہ گیا اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ یہاں تک کہ چند ماہ کے لیے وہ چلی جائیں یا ہم دونوں چلیں مگر میرا وطن بہرحال ہندوستان ہے اور اسے اچانک چھوڑ کر جانا ممکن نہیں تھا۔

"ایک دن میں دفتر سے واپس آیا تو معلوم ہوا گھر کی چابی نوکر کو سونپ کر میری بیوی میرے بچے کو لے کر کہیں چلی گئی میں آس پڑوس میں دیکھا بھالا۔ دوستوں کے ہاں تلاش کیا۔ کہیں پتہ نشان نہ ملا تیسرے دن تار ملا کہ وہ دونوں ہوائی جہاز سے سعودی عرب کے لیے روانہ ہوچکے ہیں اور ان کی واپسی کی امید فضول ہے۔"

"اس طرح میری دوسری شادی کی داستان ختم ہوئی۔"

اکرم کی آواز میں ایک عجیب درد تھا اور ہم سب کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اوپر سے اتنا سیدھا سادہ دکھائی دینے والا اکرم اپنے دل میں کیسے کیسے زخم چھپاتے ہوئے تھے اس نے کس کس کو اپنا بنانا چاہا اور کبھی غربت کے پردے ہٹا نہیں سکا۔ زبان اور تہذیب کے تفرقے محبت کے قریبی رشتوں میں کس کس طرح سے حائل ہوتے ہیں کہ انسان اپنائیت کے گہرے احساس کے باوجود پوری دنیا میں تنہا رہ جاتا ہے۔

اکرم پر طنز کرنے والے تو بہت ملیں گے مگر اس کے درد کو سمجھنے والے، اس کی تنہائی کے کرب کو پہنچاننے والے، اس کے یک جہتی کے جذبے کی قدر کرنے والے کہاں ہیں؟

●●

مسلم تاریخ نگاری کی روایات میں ابن خلدون کی تاریخ نگاری ہی سے علم عمرانیات کا آغاز ہوتا ہے۔ پھر مسلمانوں کا تصورِ تاریخ جہاں اس تصورِ سراب تاریخ سے مختلف رہا ہے جس کے اعتبار سے کائناتی وقت کے پس منظر میں تاریخ کا سفر محض فریب یا مایا کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہاں اس تصورِ عذاب تاریخ سے بھی الگ حیثیت رکھتا ہے جس میں تاریخ انسان کو صرف دکھ جھیلنے اور اذیت سہنے کا کردار عطا کرتی ہے۔ مسلم تصورِ تاریخ انسانی اعمال کو پر معنی اور نتیجہ خیز قرار دیتا ہے۔ شبلی کی تاریخ نگاری جہاں تاریخ کے انسانی تشخص کو نمایاں کرتی ہے، وہاں اس میں ان کی اپنی بعض تحدیدات کے باوجود دورِ حاضر کے جمہوری رجحانات کا عکس بھی ملتا ہے۔ شبلی نے عصری علمی ترقی کے لحاظ سے مغرب سے استفادے میں مضائقہ نہیں سمجھا ہے اور ان کی تحریروں میں جدید علم عمرانیات سے حاصل کردہ نقوش جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔ مغرب کی سامراجی فکر کو رد کرتے ہوئے بھی شبلی مغرب کی علمی ترقی کے قائل ہیں۔ خود برصغیر کا مسلم معاشرہ اس دور میں مغرب کے رد و قبول کی منزلوں سے گزر رہا تھا اور یہ سلسلہ آج بھی باقی ہے۔ چنانچہ شبلی کی تحریریں اور بہ حیثیت مجموعی ان کی فکر برصغیر کے مسلمانوں کے ذہنی ترجیحات کو پیش کرتی ہے اور ماضی و حال کے انطباق سے مستقبل کی نئی جستجو کا سنگ میل بن جاتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ان کی جستجو ان حدودگی پابند رہتی ہے جنھیں سرسید کی فکر سے علیحدگی نے کچھ نئی جہتیں دیں تو کچھ تنگ بھی کر دیا تھا۔

(ڈاکٹر حنیف فوق)

ہرنام کور

کشمیری لال ذاکر

۳۶۷ - سیکٹر ۴۴ اے چنڈی گڑھ

اگر آج بھی ہرنام کور چھٹی کر لیتی جیسا کہ وہ ہر تہوار کو کرتی ہے تو مجھے اس تہوار کے بارے میں کوئی واقفیت نہ ملتی۔

دیوالی، دسہرہ۔ ہولی، کرسمس اور عیدان سب تہواروں کو منانے کی کوئی تک تھی لیکن یہ لوہڑی کیا تہوار ہے۔ اسکاؤٹ کیمپ کی طرح رات کو آگ جلا کر اس کے اردگرد بیٹھ جاؤ اور آگ میں بھُنی ہوئی مکئی اور ریوڑیاں اور جیوڑے پھینکے جاؤ۔ کئی برسوں سے میں سوچتا چلا آرہا تھا کہ اس تہوار کے بارے میں معلومات حاصل کرنی چاہئیں، لیکن سارا سال اور ہی مسئلوں سے فرصت نہ ملتی تھی کہ اس غیر اہم مسئلے کے بارے میں سوچ سکتا اور پھر لوہڑی آجاتی اور اس کے ایک روز پہلے محلے کے چھوٹے چھوٹے بچے دروازہ کھٹکھٹا کر گانے لگتے۔

سُندر مندریئے، ہو\
تیرا کون وچارہ، ہو\
دُلا بھٹی والا!

اور پھر میں سوچنے لگتا کہ یہ سُندر مندری کون تھی اور دُلا بھٹی والا کون تھا۔ شاید اس کا تعلق کسی بھڑ بھونجے سے ہو اور بھٹی میں سوکھی جھاڑیاں اور گھاس پھونس جلا کر دانے بھونتا ہو۔ یہ سندر مندری کیا چیز تھی اور اس کا اس تاریخی بھڑ بھونجے سے کیا سمبندھ تھا؟ یہ یقیناً ہیر کی طرح کوئی سانولی سلونی گاؤں کی الھڑ مٹیار ہوگی جسے رانجھے کی طرح اپنی بھابیوں کے طعنے سن سن کر دُلا بھٹی والا تلاش کرتے کرتے، جوگی تو نہ بنا تھا، مگر بھڑ بھونجا بنکر سُندر مندری کے سفاوں میں بھاڑ جھونکنے میں لگ گیا تھا۔ کیا اپنی محبوباؤں کو پانے کے لیے جوگی بننا اور تخت ہزارہ چھوڑنا اور بھڑ بھونجا بننا ہی عاشقوں کی قسمت میں لکھا تھا؟ میں اسی طرح کی بے سروپا باتیں سوچتے ہوتے دروازہ کھولتا اور سردی میں ٹھٹھرتے ہوئے بچوں کو کچھ رقم دیدیتا اور پھر وہ آپس میں حساب لگاتے ہوتے سامنے کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹانے لگتے اور پھر وہی بول گونجتے جو ہر برس آج کے دن اسی طرح گونجا کرتے ہیں۔

سُندر مندریئے، ہو\
دلا بھٹی والا، ہو!

اور پھر اگلے روز ہم بھی دوسروں کی طرح اپنے صحن میں آگ جلاتے اور اس میں مکئی کے بھنے ہوئے دانے اور ریوڑیاں پھینکتے اور پھر اٹھکر اندر چلے جاتے لیکن جنوری کی سرد طویل رات کے اندھیرے میں وہ لکڑیاں جلتی رہتیں اور انگارے دہکتے رہتے۔ لوہڑی کی آگ کو بجھایا نہیں جاتا۔ ایسا ہی شاستروں میں لکھا ہے۔ مگر شاستروں میں کیوں ایسا لکھا ہے؟ اس بات کا مجھے علم نہیں اور نہ ہی میری بیوی کو ہے حالانکہ وہ بڑی گیانی دھیانی قسم کی عورت ہے اور سنکرانت، اکادشی، اماوس، پورنیماشی کا بڑا دھیان رکھتی ہے۔ اب کوئی پچھلے ایک برس سے اس نے سنتوشی ماتا کا بھی برت رکھنا شروع کر دیا ہے اور شکروار کا دن ہمارے گھر میں ایک دم آرڈیننس کا دن بن گیا ہے جس میں کوئی بھی شریفانہ کام نہیں کیا جا سکتا۔

اس بار لوہڑی کے دن جب ہرنام کور معمول کی طرح صبح سویرے چوکا برتن کرنے آگئی، تو میں بڑا حیران ہوا۔ "تم تو کہہ رہی تھیں کہ آج ہرنام کور نہیں آئے گی، لوہڑی کا تہوار ہے۔" میں نے اپنی بیوی سے پوچھا جو بیڈ ٹی کے دو بڑے گلاس پی کر دوبارہ آنکھیں بند کئے بستر پر پڑی تھیں۔

"آپ ہی پوچھ لونا؟" بیوی نے بنا آنکھیں کھولے ہی جواب دیدیا۔

ہرنام کور حالانکہ پچھلے پانچ برس سے ہمارے گھر کام کر رہی ہے لیکن میں نے کبھی اس سے زیادہ بات چیت نہیں کی۔ ست سری اکال کا جواب دیدیا اور کبھی کبھی اس کے بچوں کا حال پوچھ لیا۔ دو سال ہوتے اس کا گھر والا اچانک مر گیا تھا جب سے اس کی حالت بہت کمزور ہوگئی ہے۔ اس کی تین لڑکیاں ہیں اور ایک لڑکا۔ لڑکیاں سبھی جوان ہیں۔ لڑکا کوئی پانچ برس کا ہے۔ پہلے وہ اپنی کسی لڑکی کو کسی کے گھر کام کرنے کو نہیں بھیجتی تھی لیکن جب سے اس کا گھر والا مرا ہے اس کی دونوں لڑکیاں بھی آس پاس کے گھروں میں کام پہ جاتی ہیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ کام سے نپٹ کر ہمارے گھر آجاتی ہیں اور ہرنام کے ساتھ ناشتہ بھی کرتی ہیں اور میری بیوی سے گپ شپ لڑاتی رہتی ہیں۔ میری بیوی کو دراصل افسانہ نگار ہونا چاہیے تھا کیونکہ وہ گفتگو کا فن بہت اچھی طرح جانتی ہے اور اپنے آس پاس کے لوگوں میں بہت دلچسپی لیتی ہے۔ میرے بارے میں تو اس کی رائے ہے کہ میں تو صرف قسمت کی کمائی کھا رہا ہوں

مجھے کام دام کرنا کچھ نہیں آتا۔ کیونکہ یہ رائے میری بیوی کی ہے، جس نے پندرہ برس میرے ساتھ رہ کر یہ رائے قائم کی ہے اس لیے میں اسے جھٹلا نہیں سکتا۔ ہر شریف آدمی چاہے وہ مانے یا نہ مانے ایسا ہی کرتا ہے۔

میرے من پر جو بوجھ پڑا تھا اسے ہلکا کرنا میرے لئے ضروری ہو گیا تھا ورنہ میں تمام دن اسی مسئلے سے الجھا رہتا کہ ہرنام کور نے تہوار کے دن کام سے کیوں چھٹی نہیں کی تھی۔ میں نے برآمدے میں کھڑی ہرنام کور سے پوچھا۔ "آج تم نے لوہڑی کی چھٹی نہیں کی؟"

"نہیں بابو جی"

"کیوں؟"

میرے سوال کا جواب دیئے بغیر وہ کچن میں چلی گئی اور کام میں مصروف ہو گئی۔ میں واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔

"آپ نے پوچھ لیا ہرنام کور سے؟" میری بیوی نے پوچھا جو اب واقعی جاگ گئی تھی۔

"ہاں" لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تم ہی پوچھ لینا"

"میں تو پوچھ ہی لوں گی لیکن آپ سے بھی کوئی کام پورا ہو سکتا ہے کبھی؟"

"ہاں ہو سکتا ہے"

"کون سا کام؟"

"تم سے چپ چاپ ہار مان لینا"

وہ بڑے فاتحانہ انداز میں مسکرائی اور اپنے کالے اونی شال کو اپنے بدن کے اردگرد اچھی طرح لپیٹ کر باہر نکل گئی۔ اس عمر میں بھی اس کے گورے چہرے پر کالا شال اوڑھنے سے ایک نکھار آ جاتا ہے۔

کچھ دیر کے بعد جب میں برآمدے میں آیا تو میری بیوی ہرنام کور کے ساتھ سر جوڑے بیٹھی تھی اور ہرنام کور اس سے بڑے ہی غمزدہ لہجے میں کچھ کہہ رہی تھی۔ مجھے برآمدے میں آتے ہوئے دیکھ کر اس نے ہرنام کور سے کہا۔

"پہلے تم چائے پیو پھر بات کرتے ہیں"

پھر وہ میری طرف مخاطب ہوئی۔

لیجئے آپ کا مسئلہ ہرنام کور نے آج حل کر دیا"

"کون سا مسئلہ!"

"سندر مندرئیے والا!"

"سچ!" میں ایک ناتجربہ کار بچے کی طرح اشتیاق سے بولا۔

جب تک میری بیوی کچن میں چائے بناتی رہی ہرنام کور مجھے دُلا بھٹی والے کی کہانی سناتی رہی۔

دُلا بھٹی والا دراصل ایک خوفناک ڈاکو تھا جو چناب کے اس پار پنڈی بھٹیاں کے گاؤں میں رہتا تھا۔ اس نے آس پاس کے گاؤں میں تہلکہ مچا رکھا تھا۔ لیکن اپنے گاؤں والوں سے وہ بڑی محبت سے پیش آتا تھا۔ اس کے گاؤں والے اسے اپنا محافظ سمجھتے تھے، اسی گاؤں میں ایک بیوہ ہرنامو رہتی تھی جس کی ایک بڑی خوبصورت لڑکی سندری تھی۔ ہرنامو غریب تھی اسی لیے اس کی لڑکی سے کوئی بھی اپنے لڑکے کی شادی کرنے کو تیار نہ تھا۔ بڑی مشکل سے قریب کے گاؤں میں اس نے سندری کی شادی طے کی تھی لیکن شادی کی تاریخ سے کچھ ہی روز پہلے لڑکے کے باپ نے جہیز کا تقاضہ کیا، جسے پورا کرنا ہرنامو کے لیے ناممکن تھا۔ اس نے پنڈی بھٹیاں کے نمبردار سے بات کی نمبردار نے کچھ اور لوگوں سے بھی اس کا چرچا کیا، سبھی کو یہ بات ناپسند تھی کہ شادی طے ہو جانے کے بعد اس طرح کے مطالبے رکھے جائیں اور اگر اس مسئلے کو حل نہ کیا گیا تو پنڈی بھٹیاں کے گاؤں کی کسی بھی غریب لڑکی کی شادی نہ ہو سکے گی۔ ایک دن یہ بات دُلا بھٹی کے کانوں تک بھی پہنچ گئی۔ دُلا بھٹی اس رات اپنے گروہ کے ساتھ کہیں ڈاکہ ڈالنے نہیں گیا، بلکہ بیوہ ہرنامو کے گھر گیا۔ اور اسے یہ یقین دلایا کہ لڑکے کے باپ نے جس جہیز کا مطالبہ کیا ہے اسے پورا کرنا اس کی ذمہ داری ہو گی اور سندری کی شادی طے شدہ تاریخ کو ہی ہو گی۔ دوسرے دن یہ خبر سارے گاؤں میں پھیل گئی اور پنڈی بھٹیاں کے لڑکے لڑکیاں ٹولیاں بنا کر ہر گھر میں سندری کی شادی کے لئے چیزیں اکٹھی کرنے لگے۔ لکڑیاں، آٹا، دال، گھی، شکر اور تین چار روز میں ہی برات کی خاطر کا سارا انتظام ہو گیا۔ ادھر دُلا بھٹی والا اس رقم سے جو اس نے ڈاکہ ڈال کر نہیں بلکہ اپنے کھیتوں کے اناج کو بیچ کر اکھٹی کی تھی سندری کیلئے جہیز خریدتا رہا۔

اور جس روز سندری کی برات آئی تو ہرنامو رو رہی تھی اور سندری کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے اور گاؤں کی لڑکیاں سٹھنیوں کی جگہ اپنے اپنے کوٹھوں پر بیٹھی اونچی آواز میں گا رہی تھیں۔

سندر مندرئیے، ہو۔ تیرا کون وچارہ ہو۔

دُلا بھٹی والا ہو

دُلے دھی بیاہی ہو

سیر شکر پائی ہو
کڑھی دا سالو پاتا ہو
سالو کون لیا سی؟

اور اس سوال پر ایک بھرپور قہقہے کے ساتھ آواز گونجی ــــــ بھڑ بھونجے لیا سن۔

گویا سبھی براتی بھڑ بھونجے تھے جو دلہن کے لئے ایک سرخ کھدر کا سوٹ لانے کے بھی قابل نہ تھے۔

اور اگلے روز جب برات واپس گئی تو دُلا بھٹی والا سندری کو گلے لگاتے ہوئے اس بُری طرح رویا کہ لوگ حیران رہ گئے۔ کیا ڈاکو اس بے دردی سے رو سکتا تھا! بس اس دن سے لوہڑی کے تہوار کی بنیاد پڑی۔ جب کسی لڑکی کی شادی ہوتی ہے تو اس کی پہلی لوہڑی کو بڑا شبھ مانا جاتا ہے۔

جب میری بیوی، ہرنام کور کے لیے چائے کا گلاس لائی تو مجھے اپنے آپ میں بے حد ندامت ہو رہی تھی۔ میں نے اپنے ذہن میں کتنے غلط اندازے پال رکھے تھے۔

"آپ کا مسئلہ حل ہو گیا؟"

"ہاں ہو گیا ہے۔" میں نے اپنی بیوی کے سوال کا جواب دیا۔

"ایسا ہی مسئلہ ہرنام کور کا ہے۔ اس کی لڑکی کے منگیتر نے شادی سے انکار کر دیا ہے۔"

"کیوں"

"جہیز کا تقاضہ کر رہا ہے۔"

"تو اس سے کہو یہ شادی سے انکار کر دے۔"

"تو پھر آپ تلاش کریں گے اس کی لڑکی کے لیے رشتہ؟"

"ہاں میں کر دوں گا۔"

"بابو جی یہ بڑا مشکل کام ہے۔ میری تین لڑکیاں ہیں میں ان کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی۔" ہرنام کور نے بڑی درد بھری آواز میں کہا۔ "بڑی مشکل سے بیچاری کو لڑکا ملا ہے۔"

"تو کیا کرنا چاہیے؟"

"ہرنام کور تم لڑکے سے ہاں کر دو۔ میں انتظام کر دوں گی۔"

میں اپنی بیوی کی اس بات پر حیران ہو رہا تھا۔ وہ اپنی توفیق سے بڑھ کر بات کر رہی تھی، لیکن جن نظروں سے ہرنام کور میری بیوی کو دیکھ رہی تھی ان میں وشواس اور بھروسے کی ایک ایسی روشنی تھی جسے جھٹلانا میرے اختیار میں نہیں تھا۔

ہرنام کور چلی گئی۔

اس کے من سے بوجھ کی ایک پرت اُتر گئی تھی۔

لیکن میرے من پر بوجھ کی ایک اور گہری پرت جم گئی تھی۔

دوپہر کے بعد جب میں کھانا کھا کر پڑھتے پڑھتے سو گیا تھا تو میرے کانوں میں گلی میں اونچی آوازوں کا ایک مترنم شور گونج رہا تھا۔

سندر مندر یئے ہو
تیرا کون وچارہ ہو
دلا بھٹی والا ہو!

میں چونک کر بستر سے اُٹھا اور کھڑکی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

گلی میں عورتوں کی ایک ٹولی سامنے والے گھر کے آگے زور زور سے گا رہی تھی اور قہقہے لگا رہی تھی۔ جس قہقہے کے مترنم اور آواز کی گونج کو میں پہچانتا تھا وہ میری بیوی کی تھی۔

وہی تو ٹولی کے سب سے آگے کھڑی زور زور سے بول رہی تھی اور اس کا کالا شال اس کے گورے چہرے پر عجیب بہار دے رہا تھا۔ مجھے ہنسی آگئی۔ لگتا تھا میرے بوجھ کی پرت گلی میں گونجتے قہقہوں کی بوچھار میں ایک دم ڈھل گئی تھی۔ ●●

آخری شعبدہ

ڈاکٹر سلیم اختر

الجودت، جہاں زیب بلاک سی ۵۶۵ III، علامہ اقبال ٹاؤن لاہور پاکستان

جب اس نے چاقو نکالا تو وہ بالکل پرسکون تھا، صرف اس کی پرعزم آنکھوں میں مقصد کی چمک دیکھی جاسکتی تھی۔ ادھر خوبصورت لڑکی بھی خوف زدہ ہوئے یا گھبرائے بغیر ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی، بلکہ ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور آنکھیں چاقو کی دھار پر مرکوز تھیں، وہ پلکیں جھپکائے بغیر اپنی جانب بڑھتے چاقو کو دیکھ رہی تھی۔ شاید اس کی سانس رُکی تھی، وہ خوف سے پتھر ہوچکی تھی یا پھر وہ قطعی طور پر لاپرواتھی۔ کچھ کہا نہیں جاسکتا۔

اور پھر وہ چاقو اس کے پیٹ میں گھونپ دیتا ہے۔ خون کا فوارہ اُبلتا ہے اور وہ کراہے بغیر گر جاتی ہے، وہ ایک لمحہ کو اسے اس مصوّر کی مانند دیکھتا ہے جو تکمیل کے بعد اپنے شاہکار پر آخری تنقیدی نگاہ ڈالتا ہے۔ اس کے بعد وہ ہاتھ بڑھا کر اسے اٹھنے میں مدد دیتا ہے۔

تالیوں کی گونج میں دونوں ناظرین کے سامنے جھکتے ہیں تو ان کے چہروں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ بلاشبہ وہ بڑا شعبدہ باز تھا۔ اتنا عظیم کہ دوسرے شعبدہ باز اس کے فن کی قسم کھاتے تھے۔ شعبدہ بازوں کی دنیا میں ہُڈنی سے بڑا اور کوئی نام نہ تھا مگر اب اس کے بارے میں یہ طے تھا کہ یہ ہُڈنی سے بھی بڑا فنکار ہے۔

اس نے زندگی شعبدہ بازی کے لیے وقف کر رکھی تھی۔ جہاں دوسرے شعبدہ بازوں کا فن ختم ہوتا، وہاں سے اس کے کارناموں کا آغاز ہوتا تھا۔ اسے ہمیشہ خوب سے خوب تر کی جستجو رہتی تھی۔ اس کے شعبدے اتنے مکمل، سچے اور فنکارانہ انداز سے پیش کیے جاتے کہ ناظرین دنگ رہ جاتے، آنکھیں دیکھ رہی ہوتیں مگر عقل توضیح نہ کرپاتی۔ بلاشبہ وہ شعبدہ کو معجزہ بنا دیتا تھا۔

وہ ڈولی کا ریشمی پردہ اٹھاتا ہے تو اندر سے سرخ جوڑے میں ملبوس دلہن برآمد ہوتی ہے، جھومر ٹیکا اور نتھ پہنے، مہندی لگے ہاتھوں سے آداب بجا لاتی ہے۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے دو قدم ہی چلاتا ہے کہ سب کی نگاہوں کے سامنے وہ گلدستہ میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ سرخ گلاب کے تازہ کھلے پھولوں کا گلدستہ۔ وہ اسٹیج سے اتر کر ہال میں آجاتا ہے اور ناظرین میں پھول تقسیم کرتا جاتا ہے۔ خواتین کے جوڑے میں پھول لگاتا ہے تو مردوں کے کوٹ میں اور جب وہ آخری پھول ایک بچی کو دے کر اسٹیج پر چڑھنے کے لیے مڑتا ہے تو کیا دیکھتے ہیں کہ مرکزی دروازے سے دلہن اندر داخل ہورہی ہے۔ اس کے ہاتھ میں وہی گلاب کے پھولوں کا گلدستہ ہے۔ عورتیں گھبرا کر جوڑوں پہ ہاتھ مارتی ہیں مگر وہاں پھول موجود ہیں۔

الغرض ایسے ایسے شعبدے تھے کہ ناظرین تالیاں بجاتے بجاتے تھک جاتے مگر تشفی نہ ہوتی.... اس نے زندگی تکمیل فن کے لیے وقف کر رکھی تھی اور وہ ہر وقت نیا سے نیا اور حیران کن شعبدہ تخلیق کرنے میں لگا رہتا۔ کہانی کار، شاعر یا مصوّر کی مانند وہ بھی یقیناً تخلیقی فنکار تھا جس طرح کہانی کار اور شاعر الفاظ اور استعاروں کے شعبدے دکھاتے ہیں اور مصوّر رنگوں کے، بالکل اسی طرح وہ بھی آنکھ کے لیے حیرت کے مناظر کی تخلیق کرتا تھا۔ وہ خود کو ایک فنکار سمجھتا تھا اور اسی لیے اس نے دیگر شعبدہ بازوں کی طرح نہ تو خود کو جادوگر، میجک ماسٹر یا پروفیسر کہلوانا پسند کیا اور نہ ہی سیاہ واسکٹ پر خریدے ہوئے چاندی کے میڈل سجاتا۔ یہاں بھی اس کی انفرادیت تھی کہ وہ ہر شو کے مخصوص مزاج کے مطابق لباس پہنتا۔ اسٹیج پر اس کی آمد کا انداز بھی جداگانہ ہوتا۔ وہ روایتی طور پر اسٹیج کے بغلی دروازہ سے نہ داخل ہوتا بلکہ اس مزاج و انداز سے کہ بعض اوقات تو اس کی آمد بھی ایک شعبدہ لگتی۔ وہ شو کے دوران ناظرین سے دلچسپ اور شوخ گفتگو بھی کرتا جاتا۔ ایسی گفتگو کہ ناظرین ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوجاتے۔

الغرض! تنوع اس کے فن کی بنیاد تھا، خوب سے خوب تر کی جستجو مطمح نظر اور شعبدہ کو معجزہ بنا دینا مقصدِ حیات!

اور پھر ایک دن بڑے بڑے اخبارات میں اشتہار چھپے، دیواروں پر بڑے بڑے پوسٹر لگے اور لاؤڈ اسپیکروں سے

گلی گلی میں یہ اعلان کرایا گیا کہ اس مرتبہ وہ ایسا سچا شعبدہ پیش کرے گا کہ حقیقت سے بڑھ کر حقیقی ثابت ہوگا۔ یہ آخری شعبدہ ہوگا کہ اس مکمل ترین شعبدہ کے بعد وہ شعبدہ بازی ترک کر دے گا اور یہ کہ دنیا بھر کے شعبدہ بازوں کو اس کا چیلنج ہے کہ کوئی شعبدہ باز بھی نہ تو ایسا شعبدہ دکھا سکتا ہے اور نہ ہی مستقبل میں دکھانے کا سوچ سکے گا۔

الغرض! آخری شعبدہ کی اتنی تشہیر ہوئی کہ تمام شہر میں اس کا چرچا تھا۔ اس مرتبہ یہ شو مفت تھا۔ اس لیے آخری شعبدہ دیکھنے سارا شہر امڈ آیا تھا۔ یوں کہ بیحد وسیع پنڈال بھی گویا سکڑ گیا تھا۔ سامعین نے دیکھا کہ آج سٹیج کا انداز بھی بدلا بدلا سا ہے پہلے تو سیاہ یا گہرے نیلے رنگ کے پردے ہوتے تھے اور بالعموم اسٹیج نیم تاریک ہوتا تھا صرف سنگل اسپاٹ لائیٹ سے شعبدہ اجاگر کیا جاتا تھا مگر اب اسٹیج روشنیوں میں نہا رہا تھا۔ ایک غیر روایتی جدت یہ بھی کہ وہ شعبدہ بازوں کے روایتی لباس کے برعکس عام لباس میں ملبوس تھا۔ اسٹیج بھی بالکل خالی تھا۔ نہ میز، نہ اس پر دھری تاش کی گڈی، نہ وہ سیاہ لمبی ٹوپی جس سے وہ کبوتر نکالتا تھا اور نہ وہ بوتل جسے الٹا کر دینے کے باوجود بھی اس میں سے پانی نہ گرتا تھا۔ اس کا وہ کبوتر بھی غایب تھا جس کے کان میں سے وہ یکے بعد دیگرے انڈے نکالتا جاتا تھا اور وہ خوبصورت لڑکی بھی نہ تھی جسے ایک الماری میں بند کرکے وہ اس میں نصف درجن تلواریں ڈال دیتا تھا۔

تنہا اسٹیج پر روشنیوں میں وہ تنہا کھڑا تھا۔ اس نے نگاہیں اٹھائیں تو سر ہی سر دکھائی دیے۔ تب وہ یوں گویا ہوا۔

"معزز خواتین وحضرات! میں نے تمام عمر آپ حضرات کا دل بہلانے میں بسر کی ہے اور ہمیشہ نیا سے نیا شعبدہ پیش کرنے کی کوشش کی اور آپ معزز خواتین وحضرات کی سرپرستی سے اس میں ہمیشہ کامیاب رہا ہوں۔" تالیوں کے شور میں وہ ایک لمحہ رکا سب کی نظریں اس پر تھیں۔ اس کے بعد اس نے چند ایسے شعبدوں کا تذکرہ کیا جو ناقابلِ یقین ہونے کی حد تک حیرت زدہ کر دینے والے تھے۔ اس پر سامعین نے تالیاں بجا بجا کر گویا اس کی تائید کی، اس نے ایک مرتبہ پھر سامعین کو دیکھا اور ہر ایک نے یوں محسوس کیا کہ یہ نظر صرف اسی کے لیے تھی۔ وہ طویل سانس لے کر بولا۔ "اگرچہ مجھے آپ کی توجہ اور سرپرستی حاصل تھی اور آپ کی مسلسل عنایت ہی میری زندگی کا سرمایہ رہی ہے (پُرشور تالیاں) اور اگر میری کوئی عزت ہے تو وہ اسی شعبدہ بازی کی بنا پر ہے (مزید تالیاں) تاہم آہستہ آہستہ اس شعبدہ بازی کی بے معنویت کا احساس بڑھتا گیا، جیسے جیسے میرا فن مکمل ہوتا گیا مجھ میں اکتاہٹ بڑھتی گئی کہ ہر معجزہ نما شعبدہ کے بعد اس کے بیکار ہونے کا تلخ احساس بڑھ جاتا۔" وہ پھر رکا۔ سامعین سانس روکے یہ گفتگو سن رہے تھے۔ شعبدہ باز جس راز سے پردہ اٹھا رہا تھا وہ بذاتِ خود ایک شعبدہ معلوم ہوتا تھا۔ اس نے بات جاری رکھی۔ "جیسے جیسے فن میں پختگی آتی گئی ویسے ویسے ہی شعبدہ کو معجزہ بنا دینے کا جذبہ شدید سے شدید تر ہوتا گیا اور ساتھ ہی ان سب کے بے معنی ہونے کا احساس بھی بڑھتا گیا۔ معزز سرپرستو! میرا فن ہی میری زندگی ہے اور یہ زندگی تکمیلِ فن کے لیے وقف کر رکھی ہے۔ لہٰذا فن کی بے معنویت کا مطلب ہے زندگی کی بے معنویت۔ اور یوں جب زندگی بے معنی ہو جائے تو پھر فن بھی اس میں معنی نہیں بھر سکتا۔ خصوصاً اس وقت جب اپنے فن کی بے معنویت ہونے کا آسیب بھی ذہن پر مسلط ہو۔" اس نے ایک مرتبہ پھر سامعین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور یہ اعلان کیا "اس لیے میں نے اب خودکشی کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

اس پر سامعین خوب ہنسے اور سب نے تالیاں اور سیٹیاں بجا کر اظہارِ پسندیدگی کیا۔ یقیناً وہ کوئی انوکھا شعبدہ پیش کرنے والا تھا۔ سب اس کی اس عادت سے آگاہ تھے کہ وہ شعبدہ کو حقیقت سے قریب تر کرنے کے لیے اسے زیادہ سے زیادہ ڈرامائی رنگ دینے کی کوشش کرتا تھا۔ یہ سوچ کر سب نے مزید تالیاں بجائیں۔

تالیوں کی گونج میں شعبدہ باز نے پستول نکالی اور یوں گویا ہوا۔ "معزز ناظرین! یہ اصلی پستول ہے اور یہ دیکھیے میں اس میں اصلی گولیاں بھر رہا ہوں۔" اور پھر سامعین سے مخاطب ہوا جو صاحب چاہیں آ کر اپنا اطمینان کر سکتے ہیں۔"

دو تین مردوں نے اسٹیج پر جا کر اپنا اطمینان کر لیا کہ واقعی پستول اور گولیاں اصلی ہیں اور کم از کم ان میں کوئی شعبدہ بازی نہ تھی۔ وہ کنپٹی پر پستول رکھ کر ان سے یوں مخاطب ہوا۔

"اچھا تو معزز سرپرستو! خدا حافظ، معزز خواتین وحضرات! آخری سلام ـــ یہ ہے میرا بہترین، مکمل ترین اور آخری شعبدہ!"

شعبدہ باز پُرشور تالیوں میں پستول کی لبلبی دبا دیتا ہے۔

●●

لٹیرا

جیلانی بانو

۱۷۸۔ اے، معظم پورہ۔ حیرت بدایونی روڈ۔ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱

روشن نے دنیا کی ہر اہم چیز ہمیں سونپ دی تھی۔

آپ یہی سوچیے! یہ تصور بھی کتنا خوبصورت ہے کہ دنیا کے کسی انسان کی نظر میں ہم اس کائنات کے مالک ہیں۔ ہمیں یوں لگتا جیسے کسی نے ٹانگوں میں اونچے بانس باندھ دیے ہوں۔ ممی تو اس دولت کے نشے میں چور متحرک متحرک کر چلنے لگی تھیں۔

روشن دُنیا کی ہر اہم اور خوبصورت چیز اٹھا اٹھا کر مجھے دے رہی تھی۔ اور میں اس سے نفرت بڑھاتے جاتی۔

میں نے کئی بار کوشش کی کہ ممی روشن اور اس کی ماں کو نکال دیں۔

مگر وہ دونوں ماں بیٹی اس گھر کے مکینوں کی رگوں میں خون بن کر دوڑنے لگی تھیں۔ اور جب بہتا ہوا خون کہیں رُک جاتے تو ہیمرج، کینسر اور ہارٹ اٹیک ہو سکتا ہے۔ کسی دن روشن کی ماں مانس بی کام کرنے نہیں آتی تو ممی کا بلڈ پریشر بڑھ جاتا ہے۔ ذرا سی محنت کرتے ہی وہ تھک جاتی ہیں۔

دس بارہ سال پرانے نوکر گھر والوں کے ہاتھ پاؤں بن جاتے ہیں۔ یہ بات صرف مانس بی جانتی تھی کہ ڈیڈی کے کھانے میں کتنا نمک اور چکنائی ہونی چاہیے۔ پھر ممی کے مہمان بچوں کو سنبھالنا، دھوبی کا حساب، سبزی والے سے لڑائی جھگڑے، جھولو کے نخرے میری فرمائشیں۔ سب سے نپٹنا مانس بی کا ہی کام تھا۔

ممی تو اب چائے بنانا بھی بھول گئی تھیں۔ حالانکہ ڈیڈی کے دوستوں میں یہ بات مشہور تھی کہ ممی بہت اچھے کھانے بنانا جانتی ہیں۔ ممی اب گھر بار مانس بی کے حوالے کر کے اطمینان سے سہیلیوں کے ساتھ سیر سپاٹے کرتیں۔ شام کو کلب جانا۔ گھر پہ پارٹیوں کی دھوم دھام۔

لیکن مجھے ان ماں بیٹی سے بڑی چڑ تھی۔ میں چاہتی تھی گھر میں کوئی اسمارٹ سا کک ہو۔ یہ بدصورت۔ یہ بدصورت، کالی سانولی سے سر ڈھانپے ماما، ہمارے اتنے ماڈرن کچن میں بہت بُری لگتی تھی۔ میرے دوست مذاق اڑاتے تھے۔

"شمی، جی چاہتا ہے تمھاری اس کلاسیک کردار ماما کو کسی شو کیس میں سجا دیں۔"

پھر ساتھ میں روشن کا دُم چھلا بھی لگا ہوا تھا۔

میں نے جب سے ہوش سنبھالا، روشن ٹوٹی رکابی تھامے، صحن میں بیٹھی مجھے گھورتی رہتی تھی۔ وہ میری ہم عمر تھی۔ مگر بھدی کالی، موٹی بھدّی، اسے کچن میں یا او پر ورانڈے میں آنے کی اجازت نہیں تھی۔ سب کے کھانے کے بعد جھوٹی پلیٹیں پونچھ کر مانس بی اس کی رکابی میں ڈال دیتی تھی، جھوٹی ہڈیاں، بریڈ کے ٹکڑے، کیلے کے چھلکے، وہ ہر چیز خوب مزے لے لے کر کھاتی تھی۔ اب اسے گھورنے کی میری باری آجاتی۔ میں اسکول کا یونیفارم پہنے، کاندھے پر بیگ لٹکائے ورانڈے میں کار کا انتظار کرتی تھی۔ لیکن میری نظریں روشن پر ٹک جاتی تھیں۔ جب ہم نے کھایا تھا تو یہ کھانا اتنا مزے دار نہیں تھا۔ وہ کیسے مزے لے کر کھا رہی تھی، میں اسے ہر وقت ڈانٹتی رہتی تھی۔ اس کی چوریاں اور غلطیاں ڈھونڈتے جاتی۔ مگر وہ ہر وقت میری خوشامد کرتی تھی۔ اس کی ماں کہتی تھی روشن تھوڑی سی پاگل ہے۔ اس کا باپ بھی ایسا ہی ہے۔

اسکول جاتے وقت میرا بیگ کار میں رکھنا اور واپسی پر مجھے آتے دیکھ کر تالیاں بجانا اس کا فرض تھا۔ کبھی وہ میرا سفید سینڈل چھو لیتی تھی تو میں اسے ڈانٹ دیتی۔

ورانڈے تک آکر وہ رُک جاتی تھی۔ کیونکہ اسے آنے کی اجازت نہیں تھی۔ ممی کہتی تھیں یہ جھونپڑیوں میں رہنے والے سب چور ہوتے ہیں۔ اسی لیے ممی ہر وقت مانس بی پر یہ احسان جتاتی رہتی تھیں کہ ان کے آوارہ شوہر کی وجہ سے انھوں نے ترس کھا کر ان ماں بیٹیوں کو پناہ دی ہے۔ اور پھر روشن مفت میں پل رہی ہے۔ اسی لیے ممی نے روشن کو چھوٹے موٹے کاموں پر لگا دیا تھا۔ بچوں کے کپڑوں پر استری کرنا، ہر گھنٹی کی آواز پر دروازے کی طرف دوڑنا۔ ڈرائنگ روم میں مہمانوں کے لیے چائے بنانا۔ اور پھر چھوٹی موٹی چیزیں لانے دن بھر بازار

کے چکر... روشن یہ سب کام بڑی خوشی کے ساتھ کرتی تھی۔ جیسے ممی نے اسے اپنے کام سونپ کر کوئی اعزاز بخش دیا ہو۔

جب مالنس ہاتھ میں جھاڑو تھام کر لان صاف کرنے جاتی تو میں لان کے جھولے پر بیٹھ کر اس کی نگرانی کرتی تھی کہ وہ کوئی پھل نہ توڑ لے یا کسی پھل کو ہاتھ نہ لگالے۔

ایک دن روشن نے گلاب کی ایک کلی توڑ کر بالوں میں سجالی تو میں نے خوب غصہ کیا۔

"تونے ہمارا پھول کیوں توڑا۔ چوٹی کہیں کی۔"

میری بات سن کر مالنس بی دوڑی دوڑی آئی اور جھاڑو اٹھا کر روشن کی خوب پٹائی کی۔

ایک دن میں اسکول سے آئی تو دیکھا۔ لان کے بیچ والی روش کی مٹی اکٹھی کرکے روشن نے بہت خوبصورت ننھا سا گھر بنایا تھا۔ چھوٹی چھوٹی کروٹن کی ڈالیاں توڑ کر ننھا سا باغ لگایا تھا۔ اب وہ شیرانی کی لڑکی امولی کے ساتھ بیٹھی بڑے جتن سے ننھے ننھے مٹی کے برتن بنا رہی تھی۔

"ہائیں — تونے ہمارے لان کی مٹی کیوں لی ؟"

میں نے لات مار کے اس کا بنایا ہوا گھر توڑ دیا۔ اتنا پیارا سا گھر روشن کا ہو، میں یہ بات برداشت نہیں کرسکی۔ روشن ڈر گئی۔ مٹی میں سنے ہوئے .... ہاتھ جھٹک کر وہ مجرموں کی طرح سر جھکائے کھڑی رہی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ اتنا پیارا سا گھر توڑ دینے پر اب مجھے بھی دکھ ہونے لگا۔

"خبردار جو تونے پھر کبھی ہمارے باغ کی کسی چیز کو ہاتھ لگایا۔"

میں نے سینڈل سے اس کا وہ باغ بھی روند ڈالا جو اس نے ننھی ننھی ڈالیوں سے سجایا تھا۔

"چل روشن، اپنی ریڈی صاحب کے لان میں جاکر کھیلیں گے۔" اس کی سہیلی امولی نے گیٹ کے باہر جاکر پکارا۔

"نہیں۔" میں زور سے چلائی۔ "ریڈی انکل کا لان بھی ہمارا ہے۔ تم دونوں وہاں گئیں تو میں خوب ماروں گی۔" یہ سن کر شیرانی کی لڑکی میرا منہ چڑا کر بھاگ گئی لیکن روشن بڑے تعجب سے منہ کھولے مجھے دیکھ رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے آنسو پونچھ کر مجھ سے پوچھا۔

"ریڈی صاحب کا گھر بھی آپ کا ہے — ؟ یہ سب بنگلے آپ کے ہیں۔ یہ سب پھول، مٹی، ہر چیز آپ کی ہے ؟"

"ہاں — اور کیا۔" میں نے بڑے غرور کے ساتھ ایک شہزادی کی طرح جواب دیا۔ دوسرے روز میں اپنے کمرے میں ہوم ورک کررہی تھی تو روشن نے کھڑکی سے جھانک کر کہا۔

"شمی بی بی، جلدی آیئے۔ ایک لڑکا آپ کی سڑک پر پیشاب کررہا ہے۔"

مجھے بہت ہنسی آئی۔ یہ احمق سمجھتی ہے کہ اس کالونی کی سڑکیں بھی ہماری ہیں۔ شام کے کھانے پر میں نے یہ بات ممی کو سنائی تو سب بہت ہنسے۔ خاص طور سے ممی تو بہت خوش ہوگئیں۔ ممی دس برس سے مکان کے ایک حصے کے لیے اپنے دیور سے مقدمہ بازی کررہی ہیں۔ اب اچانک اتنی دولت مل جانے کے تصور نے انھیں مالا مال کردیا۔ اصل میں ہماری ممی کو لوگوں پر رعب ڈالنے کا بڑا شوق ہے۔ وہ سب کو سناتی رہتی ہیں کہ عابڈس پر فرنیچر کی دوکان ہمارے رشتے داروں کی ہے۔ اس کالونی کے سب خوبصورت مکان ہماری فیملی کے ہیں۔ وہ جو سڑک پر سرخ ماروتی کار جارہی ہے وہ ہماری تھی۔"

زمین پر بیٹھی جھوٹی رکابیاں چاٹتے ہوئے روشن ممی کی باتیں بڑے غور سے سنتی تھی۔ نیچے گرے ہوئے چاولوں کے ساتھ ساتھ ممی کی تمام باتیں بھی اس نے چن چن کر اپنے دل میں رکھ لی تھیں۔ کیونکہ روشن کو ممی کا رنگوں میں ڈوبا ہوا چہرہ، پنسل کی نوک جیسی ایڑی والے سینڈل اور چمچر مچر کرتی ہوئی ساریاں بہت اچھی لگتی تھیں۔ وہ ممی کو بڑے شوق سے دیکھا کرتی تھی۔ اور جب ممی کار اسٹارٹ کرکے چلی جاتیں تو وہ گیٹ بند کرکے زور سے سانس لیتی۔

"آہا — ابھی تک بیگم صاب کی خوشبو آرہی ہے۔"

شام کو جب ٹی۔وی۔ کا پروگرام شروع ہوتا تو روشن دور آنگن میں بیٹھی بڑے شوق سے سارے پروگرام دیکھتی تھی۔ کئی بار ڈیڈی نے ممی سے کہا کہ باہر بہت سردی ہے۔ روشن کو کمرے میں بیٹھنے دو۔ مگر ممی نے انکار کردیا۔ ممی کا خیال تھا کہ غریب لوگوں کو سردی نہیں لگتی ہے۔ جبھی تو روشن اتنی سردی میں باہر بیٹھی رہتی ہے۔ ٹی۔وی۔ پروگرام دیکھ دیکھ کر روشن کو بہت سے فلم اسٹاروں کا نام معلوم ہوگیا تھا۔ امولی روشن کی پکی سہیلی تھی۔ دوپہر کو وہ دونوں میرے کمرے کی کھڑکی کے نیچے بیٹھی چیتھڑوں کی گڑیوں یا مٹی کے کھلونوں سے کھیلا کرتی تھیں روشن خوب شیخی بگھارتی۔

"امولی تجھے معلوم ہے شمی بابی کی شادی راجیش کھنہ سے ہوگی۔"

"چل جھوٹی۔" امولی ہماری شان و شوکت کو بالکل نہیں مانتی تھی۔

"ارے سچی۔ تو کیا جانے۔ بیگم صاب کی دوستی تو گبتر سنگھ سے بھی ہے۔ اب شمی بی بی کی شادی میں تو ہیما مالنی ناچنے کو آئے گی۔"

"ہیما مالنی ——— ؟" امولی نے تعجب سے کہا اور پھر روشن کی خوشامد کرنے لگی۔
"روشن! ہیما مالنی کا ناچ مجھے بھی دکھانا۔"
ایک دن وہ دوڑی ہوئی اندر آئی۔
"بی بی، وہ جو راجیش کھنہ کی صورت کا لڑکا سامنے والے بنگلے میں رہتا ہے، وہ آپ کا دوست ہے نا۔"
اتنی گرمی میں یہ چھوکری سڑکوں پر خوبصورت لڑکوں کو گھورتی ہے۔" چل اندر آ۔ میرے کپڑوں پر استری کر دے۔"
"آپ کے کمرے میں آجاؤں۔"
یہ اس کے لیے بہت بڑا اعزاز تھا کہ میں نے اسے اپنے کمرے میں بلایا۔
"آپ کے کمرے میں اتنی ٹھنڈی ہوا ہے اور پنکھا بھی بند ہے۔" وہ چاروں طرف پاگلوں کی طرح دیکھنے لگی۔
"میں نے پنکھا بند کرکے مشین کھول دی ہے نا۔ اب ٹھنڈی ہوا باہر نہیں جاسکتی۔" میں نے اسے ایر کنڈیشنر دکھایا۔
"اچھا۔ !" اس نے تعجب سے کہا۔ "ٹھنڈی ہوائیں بھی آپ کی بات مان لیتی ہیں ——!"
مجھے ہنسی آگئی۔ اسی لیے تو روشن کی ماں کہتی ہے کہ وہ تھوڑی سی پاگل ہے۔ وہ میرے کمرے کی چیزوں کو یوں چھو رہی تھی جیسے انھیں کوئی دکھ دینا نہیں چاہتی ہو۔

کھلنے والے پھولوں اور چلتی ہواؤں کو بھی ممی روک سکتی ہیں، مجھے اس بات کا اندازہ اس دن ہوا جب ممی نے بڑے سکون کے ساتھ مجھ سے کہا کہ اب میں خالد سے نہ ملا کروں۔

خالد ایک بہت مشہور آرٹسٹ ہے۔ اس کی شہرت ملک سے باہر بھی پھیلی ہے۔ بےحد سادگی پسند، اپنے آپ میں گم رہنے والا آرٹسٹ ہے۔ کلب میں اس کا ریسپشن ہوا تو ممی سب سے آگے تھیں۔ اس رات کھانے کی میز پر ممی نے ڈیڈی سے بہت بحث کی کہ آرٹ کا ہماری زندگی سے کتنا گہرا تعلق ہے اور آرٹسٹ لوگ کتنے بڑے آدمی ہوتے ہیں۔

ڈیڈی بیچارے بزنس مین دو اور دو چار سے آگے کبھی نہ گنتے۔ وہ اپنی بزنس کے حلقے میں ستارے کی طرح جگمگا رہے تھے۔ مگر جب ممی طلوع ہوتیں تو اپنا سارا اجالا سمیٹ کر غروب ہو جاتے تھے۔

روشن ٹھیک کہتی ہے۔ اس کائنات میں ہر اچھی چیز ممی کی ہے۔

پھر ایک دن ممی مجھے خالد سے ملانے لے گئیں۔ اور جب وہ پہلی بار ہمارے گھر آیا تو ممی خوشی کے مارے کھل اٹھیں۔ بلاضرورت انھوں نے کئی دوستوں کو فون کرکے بتایا کہ اس وقت ان کے گھر میں ملک کا مشہور آرٹسٹ بیٹھا ہے۔

ممی کو غیر معمولی چیزیں بہت اچھی لگتی ہیں۔ خالد کو ایک کپ چائے پلانے کے بعد انھوں نے فوراً اپنے ڈرائنگ روم کے لیے ایک پینٹنگ کی فرمائش کر ڈالی۔ اس کے لیے ممی نے بڑی سے بڑی قیمت مقرر کرلی۔ ممی اس فن میں ماہر ہیں۔ کس سے کس وقت کس طرح کچھ حاصل کرنا چاہیے۔ یہ بات ممی اچھی طرح جانتی ہیں۔

اس دن ممی بار بار مجھ سے کہہ رہی تھیں۔
"شمی! خالد صاحب کو اپنا گھر دکھا دو۔ اپنی نظمیں سناؤ۔ اپنے لان میں لے جاؤ۔"
میں نے خالد کو اپنا گھر دکھایا۔ اپنا لان دکھایا۔ اپنی نظمیں سنائیں۔ مگر وہ تو صرف مجھے دیکھتا رہا۔ یہ آرٹسٹ لوگ جانے کہاں جیتے ہیں ——!

ان سے ملو تو انسان کہیں نیچے چلا جاتا ہے۔ کوئی راہ سجھائی نہیں دیتی۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ میں گھبرا کر خالد کو تھامنا چاہتی تو وہ ہیولا سا بن جاتا۔ مجھے ایسا لگتا جیسے میرے اندر کی جو کڑواہٹ تھی وہ میٹھے میٹھے رنگوں میں گھل کر ایک ندی سی بن گئی ہے۔ رنگوں، امنگوں اور سہانے ناؤں کی ندی جس میں ڈوب کر میں ابھرنا نہیں چاہتی تھی۔

ڈرائنگ روم میں خالد کی پینٹنگ لگ گئی۔ اس پینٹنگ کو دکھانے کے لیے ممی نے ایک شاندار پارٹی کی۔ اس پارٹی میں آنے والوں نے مان لیا کہ ملک کا اتنا مشہور آرٹسٹ بھی ہمارا ہے۔

اس کے بعد ممی کو بار بار خالد کا گھر آنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ کئی بار میں گھر میں ہوتی مگر خالد آتا تو ممی کہہ دیتیں کہ میں گھر پر نہیں ہوں۔
"لوگ تمھارے اور خالد کے بارے میں کچھ کہیں یہ مجھے اچھا نہیں لگتا۔"
"مگر مجھے اچھا لگتا ہے ممی۔" میں ممی سے یہ بات کہنا چاہتی تھی کہ خالد نے مجھے اپنے رنگوں میں گھول دیا ہے، اب میرا اپنا کوئی رنگ ہے نہ وجود۔

لیکن روشن ٹھیک کہتی ہے کہ وقت بھی ممی کا کہنا مانتا ہے۔ ہوائیں ان کے اشارے پر ناچتی ہیں۔ جبھی تو میں بھی ایک نظر نہ آنے والی ڈوری میں بندھی ممی کے اشارے پر ناچتی ہوں۔

پھر ایک دن خالد اور ی مجھے ساتھ لے جانے کے لیے آئے تو میں نے انھیں بتایا کہ ممی کو میرا ان کے ساتھ گھومنا پھرنا پسند نہیں لگتا۔ خالد نے یہ سن کر ٹکٹیں پھاڑ ڈالیں۔ سگریٹ منہ میں دبا کر ماچس جلائی۔ پھر بجھا دی۔ میں چپ بیٹھی انتظار کرتی رہی کہ ممی کی بات ماننے سے وہ انکار کر دیں گے۔ ممی سے احتجاج کریں گے۔ مگر وہ خاموشی سے اٹھ کر چلے گئے۔

میں بجھ کر رہ گئی — اپنے بے جان بدن کو گھسیٹتی ہوئی گھر آئی تو ممی مالنس بی کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھیں۔

روشن کی شادی کا مسئلہ تھا۔ ایک درزی کا پیغام تھا۔ رنڈوا ہے۔ چار بچوں کا باپ۔ ایک حجام ہے۔ بیوی بچے گھر میں موجود ہیں — دوسری شادی کرنا چاہتا ہے — ایک حمال ہے۔ روشن کا پڑوسی۔ کوئی آگے نہ پیچھے۔ ذات برادری کا پتہ نہ گھر ٹھکانہ۔ لوگ کہتے ہیں لٹیرا ہے۔ وہ کہتا ہے اگر روشن سے نکاح نہ کیا تو زبردستی اٹھا کر لے جاؤں گا۔

"دس برس کے لیے جیل میں سڑا دوں گی اس لٹیرے کو۔ اپنے ڈی۔ایس۔پی صاحب روز کلب آتے ہیں۔" ممی نے بڑے جوش سے کہا۔ شاید لوگ یہ بات نہیں جانتے کہ ممی حق کے لیے ان لڑنے والوں میں سے ہیں جو کسی اور کو سولی پر چڑھا سکتے ہیں۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ روشن جھاڑو دیتے میں رک کر بڑے غور سے ممی کی باتیں سن رہی تھی۔

"ارے میں بھی اس کو بہت ڈراتی ہوں بیگم صاب۔ کتنی بار کہا کہ ہماری بیگم صاب کسی منسٹر سے کہہ کر تجھے جیل میں ڈلوا دیں گی۔ مگر وہ بڑا ضدی ہے۔ شام ہوتے ہی بھوکے کتے کی طرح دروازے پر کھڑا ہوتا ہے۔"

"اس لٹیرے سے کہہ دے کہ شہر کے تمام غنڈے ہماری مٹھی میں ہیں۔ اسے ٹھکانے لگا دیں گے۔"

"ہاں روشن! ممی سچ کہہ رہی ہیں۔" میں نے کونے میں ڈری سہمی کھڑی ہوئی روشن سے کچھ کہنا چاہا۔ "تو جانتی ہے نا کہ اس کائنات کو چلانے اور روکنے کی چابیاں ممی کے پاس ہیں۔"

جو بات ممی کو پسند نہ ہو وہ کوئی کر سکتا ہے! اگر روشن کی شادی ہو گئی تو مفت میں کام کرنے والا دوسرا نوکر کہاں ملے گا! ممی کی لاکر میں چھپائی ہوئی مصلحتیں اور بغیر سود ادا کیے پوری کی جانے والی خواہشوں سے صرف میں واقف تھی۔

اس لٹیرے کی خود سری پر غصہ کرنے کی وجہ سے ممی کا اس دن بلڈ پریشر بڑھ گیا اور وہ انجائنا کے درد سے ہانپنے لگیں۔

کئی دن بعد —

میں اپنے کمرے میں سو رہی تھی مگر روشن کی سسکیوں نے جگا دیا۔ وہ میرے کمرے کے سامنے جھاڑو گود میں رکھے رو رہی تھی۔

"روشن! کیوں رو رہی ہے —! کیا ہوا —؟"

روشن بڑی دیر میں سسکیوں پر قابو پا سکی۔ پھر رکتے رکتے بولی۔

"مجھے ڈر لگتا ہے بی بی۔"

"ڈر لگتا ہے —! کس سے —؟" میں آج پہلی بار روشن سے اس طرح بات کر رہی تھی۔

"وہ کہتا ہے — آپ کو معلوم ہے! وہ کیا کہتا ہے —؟" روشن خوف زدہ سی تھی۔

"ہاں ہاں۔ مجھے بتا نا وہ تجھ سے کیا کیا کہتا ہے —؟" روشن اور خود سر حمال کے عشق کا مزیدار قصہ میں سننے کو بیقرار تھی۔

"بی بی، وہ کہتا ہے میں تمھاری بیگم صاب سے نہیں ڈرتا۔" روشن اپنی بات کہہ کر یوں ہانپنے لگی جیسے اس نے خدا کے وجود سے انکار کیا ہو۔ جیسے اب وہ میری زوردار لات کھانے کی منتظر ہو —

مگر اس حمال کی لات تو میرا منہ بگاڑ چکی تھی۔

میرے سارے پھول، ٹھنڈی ہوائیں، نرم مٹی اور خوبصورت رنگ، سب اسی لٹیرے نے میرے ہاتھوں سے چھین لیے تھے۔

فرار

انور عنایت اللہ

پی۔ ای۔ سی۔ ایچ سوسائٹی۔ کراچی پاکستان

بے خیالی میں میز پر رکھے ہوئے کیلنڈر کا ورق الٹا تو تاریخ پر نظر پڑی۔ دسمبر کی آٹھ۔ خدا جانے ان چند لمحوں میں کیا ہوا کہ عرصے کے بعد ماضی بے اختیار لوٹ آیا۔ وہ تمام باتیں یاد آگئیں جو اس تاریخ سے وابستہ تھیں، جن پر ظالم وقت نے اب تک غم دوراں اور غم جاناں کا دبیز لبادہ اوڑھا رکھا تھا۔ گویا دل کا سیلاب آیا تو اس راکھ کو کریدنے کو جی چاہا جو برسہا برس سے سرد پڑی تھی۔

سردیاں شروع ہو چکی تھیں۔ میرے دفتر پہنچتے پہنچتے بارش شروع ہوگئی۔ میں نے اپنے کمرے میں داخل ہو کر چھتری ایک طرف رکھی، برساتی کھونٹی پر لٹکائی اور اپنی میز کی طرف مڑا تو مجھے دو لڑکیاں نظر آئیں۔ گھنیرے بادلوں کی وجہ سے کمرے میں دھندلکا سا تھا۔ شاید چھت کا بلب حسب دستور فیوز ہو گیا تھا۔ اسی لیے چپراسی نے ٹیبل لیمپ روشن کر رکھا تھا۔ میں بیٹھنے لگا تو ایک لڑکی نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

"معاف کیجیے ۔۔۔ آپ ۔۔۔ قمر صاحب ہیں؟"

بے حد لوچدار دلکش آواز تھی۔ لہجہ بے حد شائستہ تھا۔

"جی ہاں ۔۔۔ فرمائیے؟" میں نے بیٹھتے ہوئے جواب دیا، اب میں نے غور سے اسے دیکھا۔ بے انتہا گورا رنگ، گول چہرہ۔ بالکل سیدھی ناک، بھرے بھرے سرخی مائل گال، چھوٹا سا دہانہ اور چھوٹی سی ٹھوڑی۔ سر پر گھنے رو کھے بال تھے جو شانوں تک کٹے ہوئے تھے۔ اس کا سر یقیناً گول تھا۔ اس نیم تاریک کمرے میں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس نے کالے بالوں کی روسی ٹوپی اوڑھ رکھی ہو۔ ہلکے گلابی رنگ کی چست قمیض تھی جس پر ابھری ہوئی چھوٹی چھوٹی سی بے شمار حسین تتلیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ سفید دوپٹہ گلے میں پڑا تھا۔ وضع قطع سے وہ کسی کالج یا یونیورسٹی کی طالبہ لگ رہی تھی، لمحہ بھر کے لیے ہماری نظریں ملیں تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے یہ بڑی بڑی بھوری آنکھیں کسی کو بھی پل بھر میں مسحور کر سکتی ہیں۔ عجیب سحر کار، نیم خوابیدہ سی آنکھیں تھیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ابھی ابھی بچی نیند سے جاگی ہو اور اب تک کوئی بڑا ہی سہانا حسین خواب دیکھتی رہی ہو، جس کا پرتو ان مست آنکھوں میں باقاعدہ رہ گیا ہو۔

"معاف کیجیے قمر صاحب ۔۔۔ میرا نام نرگس ہے!" اس نے کہا تو میں چونک گیا: "نرگس جمال ۔۔۔ لکھنے لکھانے کا شوق ہے۔ آپ کے یہاں سے ڈراموں کا مقابلہ ہو رہا ہے نا؟ اس کے لیے ایک ڈرامہ لائی ہوں ۔۔۔ کل میں نے فون کیا تھا تو کسی نے بتایا، آپ ہی اس کے نگراں ہیں ۔۔۔ یہ لیجیے مسودہ!"

اس نے پرس میں سے مسودہ نکال کر میرے حوالے کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی کمرے میں بھینی بھینی سی خوشبو پھیل گئی۔

"آپ نے اس سے پہلے بھی ڈرامے لکھے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

میرے سوال پر اس نے مسکرا کر مجھے یوں دیکھا، جیسے میں نے کوئی فضول سی بات کی ہو۔

"بہت سے ڈرامے لکھے ہیں۔ کالج میگزین کے لیے بھی اور اسٹیج کے لیے بھی۔ میرا ایک ڈرامہ چند مہینے پہلے اسٹیج پر ہوا تھا۔ جامعہ کے طلبا نے کیا تھا۔ آپ شاید نئے آئے ہیں۔" اس نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"جی آیا تو نیا ہی ہوں ۔۔۔ لیکن یہ پیشہ میرے لیے نیا نہیں ہے۔ دو سال میں لندن میں رہا۔ اسی ہفتے واپس آیا ہوں ۔۔۔ ڈرامے کے لیے بہت بہت شکریہ۔" میں نے کہا تو وہ یکایک کھڑی ہوگئی اور معاً مجھے یوں محسوس ہوا جیسے حسن کی دیوی، انسان کے قالب میں یکایک میرے کمرے میں آگئی ہو ۔۔۔ سنگ مرمر کے بت میں یکایک جان پڑ گئی تھی ۔۔۔ وہ سرو قد تھی۔ بھرا بھرا جسم، متناسب اعضا، چست آستینوں میں گوری گوری گداز باہیں پھنسی ہوئی تھیں۔ ان میں دو دو باریک سنہری چوڑیاں تھیں۔ اس کے ساتھ اس کی ساتھی دوسری لڑکی بھی کھڑی ہوگئی۔

"معاف کیجیے ۔۔۔ تیز بارش ہو رہی ہے ۔۔۔ چھتری بھی ایک ہے اور برساتی بھی ایک۔"

میں نے انہیں روکا۔ دل نے بے اختیار کہا۔ خدا کرے بارش آج دن بھر ہوتی رہے اور یہ دن بھر میرے سامنے موجود رہے جب آسمان پر گھومتے ہوئے گھنیرے بادل منڈلا رہے ہوں اور موسلا دھار بارش ہو اور فرحت بخش ٹھنڈی ہوائیں چل رہی ہوں اور کمرہ نیم

تاریک ہو اور صرف ایک ٹیبل لیمپ روشن ہو اور آنکھوں کے سامنے ایک بے حد جاذب نظر لڑکی بیٹھی ہو اور آپ زندگی کے کسی ایسے المیے کا شکار ہو چکے ہوں جس کے بارے میں آپ کسی سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتے اور ماحول کی وجہ سے آپ بے حد اداس ہوں تو پھر یہ بھی اس حسین خواب کا فسوں چھا جاتا ہے۔ میں تو ایک انسان ہوں، بے حد حساس اور بے انتہا جذباتی۔

میری بات سن کر وہ رک گئی، اپنی ساتھی لڑکی کو دیکھا اور پھر دونوں بیٹھ گئے۔

اس دن اتفاق سے بارش مسلسل تین گھنٹوں تک ہوتی رہی، جب بارہ بج گئے اور وہ دونوں مجھے خاصی پریشان لگیں تو میں نے ایک ایسے افسر سے برساتی لی جن کے پاس کار تھی، اسے اور اپنی برساتی اور چھتری سمیت ان دونوں لڑکیوں کے حوالے کی اور ان کی واپسی کا انتظام کر دیا۔ جاتے ہوئے نرگس نے وعدہ کیا کہ وہ شام کو یا کل صبح دونوں برساتیاں اور چھتری واپس بھیج دے گی۔

اس کے جانے کے بعد میں نے اس کا ڈرامہ پڑھا۔ اچھا خاصا تھا۔ انداز ویسا ہی جذباتی تھا جو اس کی عمر کی لڑکیوں کا خاصہ ہوتا ہے۔ پلاٹ دلچسپ تھا لیکن لکھنے کا انداز پختہ نہیں تھا۔ پھر بھی اب تک جو ڈرامے میرے پاس آئے تھے ان سب میں بہت اچھا تھا۔ جو کمزوریاں مجھے نظر آئیں وہ میں نے ایک علیحدہ کاغذ پر لکھ لیں تاکہ اگر اس سے دوبارہ ملاقات ہو تو سمجھا سکوں۔

دوسرے دن مجھے دفتر پہنچتے پہنچتے کچھ دیر ہو گئی۔ کمرے میں داخل ہوا تو وہ مجھے نظر آ گئی۔ خدا جانے کب سے وہ میرا انتظار کر رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی کہا۔

"آداب — اسی طرف آنا تھا۔ سوچا۔ دونوں برساتی اور چھتری واپس کر دوں اور ساتھ ہی شکریہ بھی ادا کرتی چلوں۔ کل ان کی وجہ سے ہم بخیریت گھر پہنچ گئے۔"

ایک طرف دیوار سے لگی میری چھتری تھی اور کرسی پر برساتی پڑی تھی۔ شکریہ ادا کر کے وہ جانے کے لیے اٹھی لیکن میں نے اسے یہ کہہ کر بٹھا لیا کہ اس کے ڈرامے کے سلسلے میں کچھ باتیں کرنی تھیں۔ وہ بیٹھ گئی۔ میں نے دراز میں سے مسودہ نکالا اور گستاخی کی معافی مانگنے کے بعد اسے بتایا کہ میں نے اس پر نظر ثانی کی ہے۔

"آپ اسے ایک نظر دیکھ لیں۔ میں نے کچھ زیادہ تبدیلیاں نہیں کی ہیں۔ اگر آپ کو یہ تبدیلیاں منظور ہوں تو اسے فیر کر کے مجھے بھجوا دیجیے گا۔ ورنہ میں اسے یوں ہی انعامی کمیٹی کے سامنے پیش کر دوں گا۔ میں نے تبدیلیاں پنسل سے کی ہیں۔ انھیں آسانی سے مٹایا جا سکتا ہے۔"

یہ سن کر اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے مسودہ لیا اور غور سے پڑھنے لگی۔ چند لمحوں کے بعد جب اس نے نگاہیں اٹھائیں تو ہونٹوں کے ساتھ ساتھ آنکھیں بھی مسکرا رہی تھیں۔

"بہت بہت شکریہ — اب واقعی بہت بہتر ہو گیا ہے۔ آپ کو بڑی محنت کرنی پڑی۔ مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟ میں اسے فیر کر کے کل لے آؤں گی — آپ نے اس کھیل پر اتنا وقت ضائع کیا۔ اس کے لیے بہت بہت شکریہ۔"

یہ کہتے ہوئے وہ یکایک کھڑی ہو گئی۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، اس نے مسودے کو پرس میں رکھا اور خدا حافظ کہہ کر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے ایک طویل ٹھنڈا سانس لیا اور سوچا — کس قدر اہم ہے یہ کھیل — کاش یہ کبھی ختم نہ ہو۔

اس کے جانے کے بعد بھی کمرے میں بھینی بھینی سی خوشبو بسی رہی۔ خدا جانے مجھے یہ کیا ہوتا جا رہا تھا؟ ایک ایسی انجان لڑکی کے بارے میں ایسے خیالات جس کے صرف نام ہی سے میں واقف تھا۔ اس کی عمر بیس سے کم نہیں تھی۔ وہ یقیناً یونیورسٹی میں پڑھتی تھی۔ اس عمر کی اور اتنی حسین لڑکیاں بھلا اب تک کا ہے کو دنیا والوں کی نظروں سے محفوظ رہ سکی ہوں گی۔ نہ جانے کالج اور یونیورسٹی ہی میں کتنے پروانے ہوں گے اس خیال ہی سے مجھ پر ایک عجیب پژمردگی چھا گئی۔

اسی رات کو وہ مجھے ایک بار پھر نظر آئی۔ میں ریکس سے پہلا شو دیکھ کر نکلا تو گھڑی دیکھی۔ ابھی صرف ساڑھے نو بجے تھے۔ بھوک لگ رہی تھی۔ سوچا۔ صدر ہی میں کھانا کیوں نہ کھا لوں۔ برازیلا تو قریب ہی تھا۔ اس چھوٹے سے ریستوراں کا پراسرار ماحول مجھے بہت پسند ہے۔ اس کی نیچی چھت اور منقش رنگین در و دیوار بالکل کسی یورپین ریستوراں کا سماں پیش کرتے ہیں۔ لندن میں سوہو کے علاقے میں ایک ایسا ہی اطالوی ریستوراں ہے جہاں میں نے اپنی زیست کی بہت سی شامیں گذاری تھیں۔ اس خیال سے میں اس طرف چل کھڑا ہوا۔

آج بھی حسب معمول تمام میزیں بھری ہوئی تھیں۔ ایک کونے میں میز خالی ہو رہی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر اس پر قبضہ جما لیا اور کھانے کا آرڈر دے دیا۔ میری میز ایسی جگہ تھی کہ میں وہاں سے ہر آنے جانے والے کا بہت اچھی طرح جائزہ لے سکتا تھا۔ مجھے بیٹھے ہوئے چند ہی منٹ ہوئے تھے کہ یکایک صدر دروازے کے قریب ریستوراں کی دھیمی سی روشنی میں مجھے وہ نظر آ گئی۔ وہ ابھی ابھی داخل ہوئی تھی اور دروازے پر رک کر اپنا داہنا ہاتھ اٹھائے پیشانی پر بالوں کی اس ننھی سی لٹ کو درست کر رہی تھی جو ہلال کی شکل میں سیاہ بھنوؤں تک آ گئی تھی۔ خالی میز کی تلاش میں وہ بے چینی سے ریستوراں کا سرسری جائزہ لے رہی تھی۔ اس کے عقب میں ایک طویل قد خوش شکل قبول صورت سانولا نوجوان نفیس سوٹ میں ملبوس کھڑا سگریٹ سلگا رہا تھا۔

آج پہلی بار نرگس اِس زاویے سے مجھے نظر آئی تھی۔ نہ جانے اس نے ہلکا سا میک اپ کر رکھا تھا یا ریستوراں کی دھیمی روشنی میں وہ مجھے کچھ بدلی بدلی سی لگ رہی تھی۔ اس کے لب کسی تر و تازہ کشمیری سیب کی طرح سرخ نظر آ رہے تھے۔۔ قدرے گیلے گیلے۔۔ چمکیلے۔

نوجوان نے سگریٹ سلگا لیا تو دونوں میزوں کی قطاروں میں سے ہوتے ہوئے، آنے جانے والے بیروں سے بچتے بچاتے، ریستوراں کے دوسرے کونے میں پہنچ گئے اور کچھ اس طرح بیٹھ گئے کہ نرگس کی پشت میری طرف تھی۔ اس کا نوجوان ساتھی میری طرف رخ کیے بیٹھا تھا۔ دونوں بے حد خوش نظر آ رہے تھے۔ وہ ایک دوسرے پر جھکے، گرد و پیش کے ماحول سے بے خبر آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ کھانے کے بعد بھی وہاں خاصی دیر تک بیٹھا کافی پیتا رہا۔ جب وہ کھانا کھا کر باہر نکلے تو میں بھی باہر آ گیا۔ ریستوراں کے سامنے ایک بڑے پیڑ کے قریب ان کی نئی فورڈ کھڑی تھی۔ میں جس وقت ریستوراں سے باہر آیا اس وقت نرگس کار میں داخل ہو رہی تھی۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے کار اسٹارٹ ہوئی اور زناٹے سے گارڈن روڈ کی طرف چلی گئی اور سڑک پر میں تنہا رہ گیا۔

اس رات میں نے فیصلہ کر لیا کہ اب اس کے بارے میں بالکل نہیں سوچوں گا۔ لیکن اس رات میں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ وقت بڑا ظالم ہوتا ہے۔ انسان کو کبھی کبھی ایسی آندھیوں سے پالا پڑتا ہے جو یوں تو پل بھر کے لیے چلتی ہیں لیکن جو اس مختصر سے لمحے میں آشیانے کے تنکوں کے علاوہ اس پیڑ تک کو جھنجھوڑتی ہوئی گزر جاتی ہیں جس پر بڑے چاؤ سے، بڑی آرزوؤں اور ارمانوں سے ٹہنیوں تنکے چن چن کر آشیانہ بنایا گیا تھا۔

اپنے ڈرامے کے سلسلے میں وہ کئی بار میرے پاس آئی اور اس سے دور رہنے کی کوشش کے باوجود آہستہ آہستہ ہم ایک دوسرے سے بے تکلف ہو گئے۔ جب بھی وہ آتی مجھ پر جادو سا کر جاتی۔ میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر اس کی دلچسپ باتیں سنتا۔ جب وہ چلی جاتی تو مجھے ہوش آتا اور میں سوچتا کہ بپھرے ہوئے دریا کے دامن کے ایک بے جان چھوٹے سے پتھر کی طرح بے بسی، میں کب تک سیلابوں کے ساتھ ادھر اُدھر لڑھکتا رہوں گا؟

ایک رات ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ میں اپنے ایک دوست کے یہاں مدعو تھا۔ کھانے کے بعد رات گئے میں عبداللہ ہارون روڈ کی طرف چلا تو ایک پان کی دوکان کے باہر وہی نوجوان نظر آیا جو اس رات کو نرگس کے ساتھ ریستوراں میں آیا تھا۔ وہ ایک دوست کے گلے سے لگا، سنسان فٹ پاتھ پر اسے چومنے کی کوشش کر رہا تھا اور وہ اسے یقین دلا رہا تھا کہ وہ ندیم ہے جسے پردے پر دیکھ کر سیکڑوں لڑکیاں دل دے بیٹھتی ہیں۔ شراب کے نشے میں وحشت اسے ہوش نہیں تھا کہ وہ کہاں تھا اور کیسی حرکتیں کر رہا تھا۔

مجھ سے یہ منظر دیکھا نہیں گیا اور میں وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ سب سے زیادہ جس حقیقت نے مجھے دکھ دیا تھا وہ یہ تھی کہ نرگس کا دوست نوعمر تھا۔ اس چھوٹی سی عمر میں خدا جانے یہ لت کیسے پڑ گئی تھی۔

اسی رات کو میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ چاہے کچھ ہو نرگس سے اس نوجوان کے بارے میں پوچھ کر رہوں گا۔ میں نے صبح کو اٹھنے کے بعد اسے فون کیا۔ وہ گھر پر نہیں تھی۔ شام کو فون کیا تو بھی وہ نہیں ملی۔ میں نے اس کا کئی دنوں تک بے چینی سے انتظار کیا لیکن وہ نہیں آئی۔ پھر ایک شام کو وہ مجھے نظر آ گئی۔ وہ اس نوجوان کے ساتھ کار میں بیٹھی تھی۔ دونوں ایک دوسرے میں کھوئے ہوئے باتوں میں اس قدر مصروف تھے کہ اس نے مجھے بالکل نہیں دیکھا۔ کار میرے قریب سے تیزی سے گزر گئی۔

رات گئے گھر پہنچا تو ملازم نے بتایا کہ کسی 'خاتون' کا فون آیا تھا۔ وہ کہہ رہی تھیں بڑا ضروری کام ہے۔ نمبر بھی بتایا۔ میں نے نمبر دیکھا۔ نرگس ہی کا تھا۔ گھڑی دیکھی۔ سوا گیارہ بج رہے تھے۔ میں نے فوراً نمبر ملایا۔

"ہیلو۔۔ ۵۱۷۹۹" اس کی دھیمی سی آواز سنائی دی۔

"میں قمر بول رہا ہوں" میں نے بھی آہستہ سے کہا۔

"جی قمر صاحب — میں نرگس — آداب — آپ سے ایک بڑا ضروری کام ہے۔ اسی لیے فون کا انتظار کرتی رہی۔"

"بتاؤ — خیریت تو ہے نا؟" میں نے پوچھا۔ "اگر کہو تو ابھی آ جاؤں؟"

"جی ہاں — یعنی جی نہیں۔" اس نے جلدی سے کہا "مذاق چھوڑیئے۔ پلیز — میرا ایک کام کر دیجیے۔ میں ایک ٹیلی فون نمبر بتاتی ہوں۔ اس پر فون کر کے کہیے وہ الماس کو فوراً فون کر لے۔ اس کے بعد فوراً ریسیور رکھ دیجیے گا۔ یہ آپ کا احسان ہوگا قمر صاحب — اس وقت آپ کے سوا ایسا کوئی نہیں جو میری مدد کرے۔ آپ سن رہے ہیں نا قمر صاحب؟ — اس قدر خاموش کیوں ہیں؟ خدا کے لیے کچھ بولئے — کیا میری باتیں بری لگیں؟" اس نے پریشان لہجے میں پوچھا۔

"نہیں نہیں — میں تمہاری باتیں سن رہا تھا۔" میں نے آہستہ سے کہا "تم فون نمبر بتاؤ — میں ابھی فون کرتا ہوں۔"

اس نے نمبر بتایا اور فوراً ریسیور رکھ دیا۔ یوں جیسے اسے دوسرے فون کا شدت سے انتظار ہو۔ میں نے اس کا کام کر دیا اور صوفے پر نیم دراز ہو کر ڈائرکٹری میں پروڈیوسر کا نمبر تلاش کیا۔ نمبر وہی تھا جو نرگس نے ابھی ابھی بتایا تھا۔

دوسرے دن خلافِ معمول وہ آ گئی۔ آج وہ کچھ خاموش سی تھی۔

"میں شکریہ ادا کرنے آئی ہوں" اس نے دھیمے لہجے میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

"شکریہ؟ ۔ کس بات کا؟" میں نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

"کل رات کی مدد کا" اس نے جواب دیا اور مجھے غور سے دیکھنے لگی۔

"اچھا ۔ ٹیلی فون کرنے کا؟ ۔ اس میں شکریے کی کون سی بات ہے؟ تم نے ایک فرمائش کی، میں نے پوری کر دی" میں نے جواب دیا۔ اس پر وہ خاموش رہی۔ لیکن اس کی نگاہیں مجھ ہی پر رہیں، جیسے میرے جذبات کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کر رہی ہو۔ نہ جانے اسے میری بے چین آنکھوں میں کیا نظر آیا کہ اس نے فوراً نگاہیں جھکالیں اور اس کے ساتھ اس کا چہرہ تمتما اٹھا۔ چند لمحے خاموش رہی پھر اس نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

"آپ نے یہ نہیں پوچھا کہ وہ ٹیلی فون نمبر کس کا تھا؟"

"نہیں ۔ اپنے دوستوں کے نجی معاملوں میں دخل دینا مجھے پسند نہیں" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"قمر صاحب!" وہ اس سے زیادہ کچھ کہہ نہ سکی۔

"ہاں نرگس ۔ کیا تمہیں یقین نہیں کہ میں تمہارا دوست ہوں؟"

"اگر یقین نہ ہوتا تو کل رات اتنی بے تکلفی سے فون نہ کرواتی۔"

"کیا مطلب؟ ۔ کیا میری غیر حاضری میں تم نے فون نہیں کیا تھا؟" میں نے فوراً پوچھا۔

"میں فون نہیں کر سکتی تھی۔ جب ہم لوگ باہر جاتے ہیں ٹیلی فون میں تالا ڈال جاتے ہیں۔ کل ممی چابی کہیں بھول آئیں۔ میں نے کسی سے وعدہ کر رکھا تھا کہ میں رات کو ٹھیک ساڑھے دس بجے فون کروں گی۔ ہمارے یہاں سب عموماً دس بجے تک سو جاتے ہیں۔ آپ کو کل میری بے بسی کا اندازہ نہیں ہوا۔ اتفاق سے دس بجے میری ایک سہیلی نے مجھے فون کیا۔ آپ سے تو وہ واقف ہے لیکن پرویز سے نہیں۔ میں نے اس سے کہا۔ وہ آپ کو فون کرے اور کہے کہ آپ مجھے فون کریں ۔ اس طرح میری مشکل آسان ہو گئی۔" اس نے جواب دیا۔

"پرویز؟" میں نے آہستہ سے یہ نام یوں دہرایا جیسے یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ کس کا ہے۔

"جی ہاں ۔ میرا منگیتر ۔ یعنی مجھے یقین ہے منگنی اس سے ہوگی۔ آپ نے اس کا نام ضرور سنا ہوگا۔ افضال پرویز ۔ مشہور ٹینس کا کھلاڑی۔ اس رات برازیلانو میں وہی تھا میرے ساتھ!" وہ بولی۔

"اچھا تو تم نے مجھے دیکھ لیا تھا؟"

"ہاں ۔ اس رات میرے دل میں آپ کے لیے عزت اور وقعت بہت بڑھ گئی کیوں کہ آپ نے کبھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ میں کس کے ساتھ تھی۔ میں اس رات آپ کو سلام کرنا چاہتی تھی۔ بات کرنا چاہتی تھی۔ لیکن وہ بے حد تنگ مزاج ہے۔ اسے بالکل پسند نہیں کہ میں دوسرے نوجوانوں سے ملوں یا بات بھی کروں۔ اس لیے میں انجان بن گئی تھی۔ اس کے بعد جب بھی میں آپ سے ملی ہمیشہ یہ ڈر لگا رہتا آپ اس کے بارے میں نہ پوچھ لیں۔ میں سوچتی نہ جانے آپ مجھے کیسی لڑکی سمجھتے ہیں۔ اس رات یونیورسٹی میں جلسہ تھا۔ ہمیں وہاں خاصی دیر ہو گئی۔ مجھے بھوک لگ رہی تھی ۔ آپ مجھے اس قدر عجیب نظروں سے کیوں دیکھ رہے ہیں؟ میں خود سر ضرور ہوں ۔ لیکن بری نہیں قمر صاحب!"

یہ کہتے کہتے اس کی آواز روہانسی ہو گئی اور اس نے بے اختیار اپنا دایاں ہاتھ میری طرف بڑھایا اور پھر پل بھر میں نہ جانے کس طرح میرا سلگتا ہوا ہاتھ اس کے ہاتھ تک پہنچ گیا اور نادانستہ طور پر میری گرفت سخت ہو گئی۔ میں نے اسے غور سے دیکھا۔ اس کے نیم وا سرخ ہونٹ کانپ رہے تھے اور وہ بھی غور سے میری بے چین آنکھوں اور اضطراب کا جائزہ لے رہی تھی اور اس کے سینے کا اتار چڑھاؤ صاف ظاہر کر رہا تھا کہ وہ بھی میری طرح مضطرب ہے۔ معاً مجھے یوں لگا جیسے آنسو اس کی آنکھوں سے ٹپک پڑنے کے لیے بے چین ہوں۔

"آپ میری مشکلوں کو نہیں سمجھ سکتے۔ مجھ پر بہت سی پابندیاں ہیں میرا تعلق ایک متوسط گھرانے سے ہے۔ ہمارے بڑے مسائل ہیں ۔ میں تمام بندھن توڑ کر آزاد ہونا چاہتی ہوں۔ پر میرے قدم زمین سے نہیں اٹھتے ۔ کبھی کبھی مجھے احساس ہوتا ہے جیسے میں ایک دوراہے پر کھڑی ہوں اور مجھے راستہ سجھائی نہیں دے رہا ہے۔" وہ رک گئی اور آہستہ سے اس نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

"پرویز کو سوائے ٹینس کے کسی اور چیز سے دلچسپی نہیں، ادھر ممی کو ایک دولت مند داماد کی ضرورت ہے جو اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی ہو، اعلیٰ خاندان بھی اور جو کسی بڑے سرکاری عہدے پر فائز ہو۔ مجھے یقین ہے جس دن انھیں پرویز کے بارے میں پتہ چلا، مجھ پر مصیبت آجائے گی۔ لیکن مجھے اس کی فکر نہیں۔ مجھے کسی کی پروا نہیں۔ اپنے دل کے سکون کی خاطر میں وہی کروں گی جسے میں مناسب سمجھوں گی۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے بڑی سنجیدگی سے، بڑی بے باکی سے مجھے یوں دیکھا جیسے کہنا چاہتی ہو ۔ محبت میں سمجھوتے کی گنجائش نہیں ہوتی قمر۔

نہ جانے کب تک ہم یوں ہی خاموش بیٹھے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اور یوں محسوس ہوا جیسے صدیاں گزر گئی ہوں۔ نہ جانے

کیا سوچ کر کیسے اسے ہوش آگیا تو اس نے فوراً نگاہیں جھکالیں اور میز پر سے ایک پن لے کر دانتوں میں دبالیا۔ یکایک وہ اٹھی اور پل بھر کے لیے مجھے غور سے دیکھ کر خدا حافظ کہا اور چلی گئی۔ اس کا چہرہ ایک بار پھر سرخ ہوگیا تھا اور آنکھیں گویا کہہ رہی تھیں ۔ یہ تم نے کیا کیا؟۔ یکایک تم میری زندگی کا چین چھین لینے پر کیوں تل گئے ہو؟ ۔ بولو ۔ آج زندگی میں پہلی بار تم نے مجھے کیوں چھوا؟ ۔ کیا نہیں جانتے کہ کبھی کبھی انسان کی زندگی میں ایسے کمزور لمحے بھی آتے ہیں جب پل بھر کی غفلت اس سے سب کچھ چھین لیتی ہے اور وہ بے بس سا ہو کر اپنا سب کچھ لٹانے پر آمادہ ہوجاتا ہے؟'

اس کے جانے کے بعد زندگی اجیرن لگی۔ خاصی دیر سوچنے کے بعد میں نے مہینے بھر کی چھٹی لی اور اسی شام کو کراچی سے دور نکل گیا۔ سفر میں برابر سوچتا رہا ۔ خود کو فریب میں مبتلا رکھنے کی یہ کوشش کیوں؟ حقائق سے فرار کیوں؟ زندگی سے گریز کیوں؟

مہینے بھر شمالی علاقوں میں آوارہ گردی کے بعد کراچی لوٹا تو خلاف توقع ڈاک میں اس کا خط بھی ملا۔ پہلی بار اس نے بڑی بے تکلفی سے لکھا تھا۔

"۔ مجھے تمہارا شدت سے انتظار رہا۔ میرا خیال تھا تم مجھے فون ضرور کرو گے۔ مجھے یقین تھا میرے جانے کے بعد جب ندامت اور پشیمانی کی آگ تمہیں جلائے گی تو تمہیں احساس ہوگا کہ کبھی کبھی سرد راکھ کو کریدنا بھی خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔ ہر قسم کی راکھ تلے ایک آدھ چنگاری ضرور ہوتی ہے جس میں، موافق ہوا پاکر بھڑک اٹھنے اور بڑے بڑے ایوانوں کو جلا کر خاک کر دینے کی طاقت ہوتی ہے ۔ تم مجھے اس قدر بے حس اور نادان کیوں سمجھتے ہو؟ ۔ ایک بات پوچھوں قمر؟ ۔ دنیا میں عموماً ایسا کیوں ہوتا ہے کہ جب ہم زندگی کی طویل پیچیدہ راہوں پر تیزی سے آگے بڑھ جاتے ہیں تو اس وقت کیوں یہ احساس ہوتا ہے کہ ہم راستے میں کیسی کیسی دلکش، بے مثل چیزیں چھوڑ آئے'۔ سوچتی ہوں۔ اگر راستے ہی میں ان کا پتہ چل جائے تو شاید ارتقار کا سلسلہ آگے نہ بڑھ سکے ۔ میں زندگی کی راہ میں، اس کے پیچیدہ راستوں پر اس قدر دور نکل آئی ہوں کہ بہت سے نازک احساسات کے باوجود لوٹنے کی اب ہمت نہیں پاتی ۔ نہ آگے بڑھ سکتی ہوں اور نہ لوٹ سکتی ہوں ۔ نہ جانے میں کیا کچھ لکھ گئی قمر ۔ بے معنی جذباتی بکواس ۔ کہنا صرف یہ چاہتی تھی کہ تم نے اس دن میرے ساتھ زیادتی کی ۔ اصولاً تمہیں اس کے لیے معافی مانگنی چاہیے تھی۔ لیکن تم نے معذرت کی بجائے دور بھاگنے کی کوشش کی جو اور بھی بری بات ہے ۔ ایک ہفتے کے بعد میری سالگرہ ہے ۔ سنا ہے تم دو چار دنوں میں لوٹ آؤ گے ۔ اگر پرویز حاسد نہ ہوتا تو میں دونوں کو ایک ساتھ مدعو کرتی ۔ اب مجبوری ہے ۔ لیکن سالگرہ کے دن تمہارے فون کا ضرور انتظار کروں گی ۔ اچھا خدا حافظ!"

خط پر تاریخ پہلی دسمبر تھی ۔ آج ۲۹ دسمبر تھی۔ میں نے بے چینی سے خط میز پر رکھا اور ٹیلی فون کی طرف بڑھا اور اس کا نمبر ملایا۔

"ہیلو ۔ ۹۵۱۶۹۷" اس کی مانوس آواز آئی تو دل کی دھڑکن میں اضافہ ہوگیا۔

"نرگس! ۔ میں ہوں قمر" میں نے آہستہ سے کہا۔ "کیسی ہو؟"

"اچھا ۔ آپ واپس آگئے؟" اس نے پوچھا۔ اس کی آواز مجھے کچھ عجیب لگی۔ بجھی بجھی اور سرد۔

"ہاں ۔ ابھی ابھی آیا ہوں۔ آتے ہی پہلے تمہارا خط پڑھا ۔ میں بے حد شرمندہ ہوں نرگس ۔ میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ اسی وقت ۔ کیا گھنٹہ بھر بعد مل سکتی ہو؟ ۔ تم جہاں کہو پہنچ جاؤں گا" میں نے پوچھا۔

اس پر وہ خاموش ہوگئی جیسے کچھ سوچ رہی ہو۔ پھر اس نے آہستہ سے جواب دیا۔

"نہیں قمر صاحب ۔ میرے شوہر مطب میں ہیں۔ انھیں فرصت کم ملتی ہے ۔ آج نہیں۔ پھر کسی دن۔"

شوہر؟ ۔ مطب میں؟ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کہہ کیا رہی ہے۔

"کیا کہہ رہی ہو نرگس؟ ۔ تمہارے شوہر؟"

"جی ہاں قمر صاحب ۔ ڈاکٹر اصغر سے تو آپ واقف ہوں گے۔ مشہور ہرٹ اسپیشلسٹ ۔ ہم اگلے مہینے نیویارک جارہے ہیں۔ ۔ خدا حافظ۔"

اس نے کھٹ سے ریسیور رکھ دیا اور معاً ہماری گفتگو ختم ہوگئی اور وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میری زندگی سے چلی گئی اور میرے خوابوں کا حسین محل پل بھر میں مسمار ہوگیا۔

آج پھر دسمبر کی آٹھ تاریخ ہے۔ برسوں کے بعد یادوں کے سیلاب میں ڈوب گیا ہوں۔ بے اختیار اس راکھ کو کریدنے کو جی چاہ رہا ہے جو برسہا برس سے سرد پڑی تھی۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے وہ میرے سامنے بیٹھی ہے اور مجھ سے پوچھ رہی ہے ۔ بولو ۔ آج میری سالگرہ پر مجھے کیا تحفہ دو گے؟ ۔ اب میں اسے کیسے سمجھاؤں کہ کبھی کبھی سرد راکھ کو کریدنا خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔

●●

بونگا

فرخندہ لودھی

۶/ اے۔ گورنمنٹ کالج کچہری روڈ۔ لاہور

گورنمنٹ کالج میں آئے ہوئے اسے ابھی چند ہفتے گزرے تھے کہ اس کی مڈبھیڑ رملہ سے ہوگئی۔ دیہات سے آنے والے لڑکے ابتدائی دنوں میں کچھ چونکے سے کچھ گھبرائے اور بولائے سے ہوتے ہیں۔ رشید کا گاؤں سے شہر آجانا کوئی چھوٹی بات نہ تھی۔ سیدھا گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ مل گیا۔ ہوسٹل میں اقامت ہوگئی۔ دل، دماغ ابھی ایک دائرے میں گھوم رہے تھے کہ رملہ مل گئی۔ انگریزی ڈیپارٹمنٹ کی گیروی برجیوں پر ستون سے ٹیک لگائے۔ اوپر بوگن بلیا کی بیل جھکی ہوئی۔ گہرے گلابی رنگ کے پھولوں کے گچھے جن سے سورج کی کرنیں ٹکرا کر رملہ کے گورے چہرے کو آتشیں کر رہی تھیں۔

رملہ شاید کسی کی منتظر تھی۔

ستمبر کی دوپہر میں حسن اور دلکشی نام کو نہ تھی رملہ کی موجودگی نے ماحول کو مہکا سا دیا تھا۔ بوگن بلیا کے بے بو پھولوں نے ایک بیک گراؤنڈ کا بندوبست بھی کر رکھا تھا۔ رشید کو دنیا حسین ترین نظر آرہی تھی۔ گورنمنٹ کالج میں داخلے کے بعد وہ ہر چیز کو اپنی دسترس میں محسوس کر رہا تھا۔ سب کچھ اپنا تھا کیوں کہ اس عظیم مادرِ علم نے اسے اپنی گود میں لے لیا تھا۔ اب وہ اس کا بچہ تھا۔ ماں کے وجود سے تقویت حاصل کرنے سے اسے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ پہلی بار رشید نے جب گورنمنٹ کالج میں قدم رکھا تو اس کے بدن نے ایک جھرجھری لی تھی بالکل اسی طرح جیسے کوئی اصیل بچھرا ماں کے ساتھ اپنی پہلی دوڑ میں دوڑتے ہوئے محسوس کرتا ہے۔ ایک کورا کرارا کنوارپن۔

رملہ سے مڈبھیڑ اسی احساس کا ایک جزو تھی۔

رشید نے انگریزی ڈیپارٹمنٹ کے سامنے برآمدے میں دو تین چکر لگائے۔ رملہ جوں کی توں بیٹھی تھی۔ اب کے رشید کی نظریں رملہ کے شانوں سے پھسلتی ذرا نیچے آگئیں۔ "ہوں" اس کے اندر سے آواز آئی۔ پسینے کے باعث ہلکے فیروزی رنگ کے باریک کرتے نے کندھوں سے چپک کر منظر کو خوب تر بنا دیا تھا۔ زرد ربن میں مٹھی سے بندھے بال کندھوں کے عین درمیان ہلکی ہلکی جنبش میں مبتلا۔ وہ دیکھتا رہ گیا۔ شہری حسنِ لاپروا کا نظارا قابلِ دید تھا۔

انسان جہاں بھی ہو... زندگی سے جڑے رہنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کے امکانات تلاش کر لیتا ہے۔ اور یہاں تو امکانات ہی امکانات تھے۔ دلکشی اور کشش کے پیچ راستے اس کے سامنے باہیں کھولے کھڑے تھے۔

جب وہ وہاں سے چوتھی بار گزرا تو رملہ نے اسے روک لیا۔ اور انگریزی میں پوچھا۔

What is it kid,

رشید وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا بالکل بچھڑے کی طرح پگ ٹٹ

naughty Boy,

رملہ کے پیچھے میں سرایت تھی۔

ینگ سٹوڈنٹ یونین کے کمرے میں شیطان ٹولہ کسی آئندہ تقریب کے پروگرام پر جھگڑ رہا تھا۔ کوئی سیڑھیوں کی بھاری گرل پر لٹک کر بولا۔

"بونگا ای اوئے۔"

رشید نے نگاہیں اٹھا کر دیکھا۔ چار پانچ بے فکرے ترنگ میں ہنہنا رہے تھے۔ ان میں کوئی چہرہ شناسا نہیں تھا۔ اس کے لیے سب نئے تھے۔ پرانے ساتھی پیچھے رہ گئے تھے۔ اس کی ماں فضلاں اگر اسے اپنا ماحصلِ حیات تصور نہ کرتی تو وہ بھی گاؤں کے دوسرے لڑکوں کی طرح کہیں ہل جوار پڑھ رہا ہوتا۔ قدرت نے حافظہ اچھا دیا تھا۔ نصابی کتب کے صفحات لفظ لفظ ذہن میں محفوظ ہو جاتے۔ حافظے کے بھروسے پر ہمیشہ کوئی نہ کوئی پوزیشن حاصل کر لیتا۔ تعلیم انسان کو کہاں سے کیا کر دیتی ہے اس کا اسے شعور نہ تھا کہ کتنا بڑا اور کارگر ہتھیار ہے اس کی

بھی اسے بس آتی سمجھتی کہ اچھی نوکری مل جاتی ہے اور آدمی گاؤں والوں میں نمایاں ہو جاتا ہے۔

جب اس نے میٹرک پاس کیا تو دادا کا خیال تھا کہ وہ پٹواری بن جائے اور اپنی بیوہ ماں کی ذمہ داری سنبھالے۔ نانا اس کی لیاقت دیکھتے ہوئے اسے اسکول ماسٹر بنانا چاہتا تھا۔ نانا کا خیال تھا علم بانٹنے اور برتنے سے بڑھتا ہے۔ خدمت کی خدمت، آمدنی کی آمدنی، پر ماں بیٹے کو صاحب بنا دیکھنا چاہتی تھی۔ اس نے اپنے سارے خواب سارے ارمان رشید کے گرد لپیٹ دیے تھے۔ آخر ماں کی تمنا جیت گئی۔ ماں نے اپنی بات منوانے کا جو طریقہ اختیار کیا۔ وہ عام طور پر موثر ہوا کرتا ہے۔ بزرگ لوگ ایسے جذباتی مظاہروں میں اپنی انا کو مطمئن ہوتا دیکھتے ہیں اور ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔

رشید کی ماں اپنا شباب اپنی امنگیں ان بزرگوں کی انا پر نچھاور کر چکی تھی۔ کیسے چپ رہتی۔ بچے کے مستقبل کا سوال اٹھا تو اسے خود کا خیال آیا۔ کیسے کیسے جذباتی ادوار سے گزر کر وہ اس مقام تک پہنچی تھی۔ رشید نہ ہوتا تو وہ کب کی مر گئی ہوتی۔ باپ دادا کی عزت بچانے میں گویا رشید کا بڑا ہاتھ تھا۔ اب رشید کی زندگی سنوارنے کا مسئلہ تھا۔ فضلاں ڈٹ گئی اور صحن میں کھڑے ہو کر علی الاعلان کہا۔

"رشید میرا بیٹا ہے... اس کی آئندہ زندگی کا فیصلہ کرنے کا حق صرف مجھے ہے۔"

"کیا___؟"

دونوں بوڑھوں کی لال داڑھیاں لرز کر رہ گئیں۔

رشید اس وقت چارہ کاٹنے والی مشین چلا رہا تھا۔ ماں کی جرأت نے اسے کام سے روک دیا۔ نانی اور دادی جو آپس میں دیورانی اور جٹھانی تھیں فضلاں کو پھٹکارتے ہوئے بولیں۔

"نی... فضلاں... مت ماری گئی ہے تیری...؟ کیا کہہ رہی ہو___؟ اور کس سے کہہ رہی ہو___؟"

"میں کہہ رہی ہوں... میرا رشید کالج میں پڑھے گا سن لیا؟"

"لے... مڈی کو بیٹے کا چاؤ چڑھ گیا۔" ساس نے حیرت کے اظہار کے لیے چاروں انگلیاں ہونٹوں پر رکھ لیں۔ فضلاں کے سسر نے حقہ گڑگڑاتے ہوئے ایک چبھتی نظر بہو پر ڈالی... فضلاں جب فضلاں تھی تو اس کی بھتیجی تھی اب بہو بنے اسے کئی برس بیت چکے اور بہو بھی بیوہ... بیوہ بہو کے منہ میں اتنی لمبی جیب اس نے آج دیکھی پاس ہی بیکار بیٹھا فضلاں کا باپ چارپائی کے بان پر انگلیاں پھیر رہا تھا۔ اس وقت بڑے بھائی اور بھاوج کی بات کا جواب دینے کی ہمت نہ تھی اس میں۔ اس کو چپ دیکھ کر فضلاں کی ماں سے رہا نہ گیا وہ افسردہ لہجے میں بولی___

"فضلاں دھیمے___ تیرا کون سا خصم زندہ ہے جو تو ناز کرائے گی بیٹے کو۔ تیرا باپ اور تایا جو کہیں وہی تیرے فائدے میں ہے۔ آخر کب تک پرائے ٹکڑوں پر پڑی رہو گی..."

"اچھا... اچھا... تو تم سب پرائے ہو... یہ آج پتہ چلا... تو مجھے پہلے بتا دیتی ماں___! میں مر کیوں... یہ جو سانس نہ لیا... سچ کہا کسی نے"

فضلاں سینہ سر اور گال پیٹتی دیوانہ وار رشید کی طرف لپکی۔

"چل پتر... چل... ابھی چل... یہ ہمارے کچھ نہیں ہوتے___ ارے میں ان کی لاج لیے بیٹھی رہی جو میرے نہ تھے... ہائے... ہائے" رشید ماں کی یہ کیفیت دیکھ کر دھاڑیں مار کر رونے لگا۔ پندرہ سولہ برس کا لڑکا جس کی چند ماہ پہلے آواز ٹوٹی تھی بھائیں بھائیں رو رہا تھا۔ پاس پڑوس میں آوازیں پہنچیں، عورتیں، مرد بچے اپنے کام چھوڑ کر دوڑے آئے... کچھ نے فضلاں کو گھیر لیا۔ کچھ بڑے بوڑھوں کے گرد ہو گئے۔

"پاگل ہو گئی ہے۔ ساری عمر کی رکھی رکھائی غارت کر رہی ہے... ہائے ہائے تو تو گلے تھی۔ تجھے کیا ہوا فضلاں___؟"

"میں گلے تھی... اب میں ایک جوان بیٹے کی ماں ہوں" فضلاں نے اپنے اوپر جھکی ہوئی عورتوں کو ایک پچھاڑ دی۔

"جاؤ... اپنے اپنے گھروں کو... تماشہ دیکھنے آئی ہو___؟

ساری عمر تماشا دیکھتی رہی ہو... تماش بینو___! تمہارا بیڑا غرق ہو" فضلاں نے رشید کو کندھے سے پکڑا اور احاطے کے دروازے کی سمت چل دی۔ رشید نے اس کے پیچھے پچھورے کی طرح چلتے چلتے مڑ کر اپنے پالنے پوسنے والوں کی طرف دیکھا۔ نانی جو اسے مکھن چٹایا کرتی تھی، دادی جو چوری میں بادام کوٹ کر دیا کرتی تھی، دادا، نانا چاچے چاچیاں ممانیاں اور ماسیاں جو اسے یتیم سمجھ کر ہمیشہ رحم اور مروت برتا کرتے تھے۔

"پچ پچ... موئے چاہنے دی نشانی... جیوندا ہوتے وچارا یتیم" آج یہ سب آن کی آن میں غیر لگ رہے تھے___ ماں کی بغاوت نے گویا ایک بنے بنائے احاطے میں شگاف اور دراڑیں ڈال دی تھیں۔ عورتوں کے ٹیکھے جملے ان کا پیچھا کر رہے تھے۔

"بیٹا دس جماعت کیا پڑھ گیا۔ فضلاں بی اے پاس ہو گئی۔ دیکھو کیسا غرور آ گیا ہے اوقات ہی بھول گئی"

فضلاں کو کسی کی پروا نہ تھی وہ برابر صدر دروازے کی طرف بڑھتی گئی۔ کہ اچانک اس کی ساس شکرے کی طرح جھپٹی اور رشید کو کھینچ لیا۔

"یہ نہیں جائے گا... اور تو کہاں جاتی ہے؟ کون تاک رکھا ہے؟ کچھ نہیں بھی تو نہ ہوئے___ کان کھول کر سن لے میرا پوتا کسی غیر کے پاس نہیں رہے گا___ جائے آپ کیا بٹ بٹ دیکھتے ہو... روکو" پھر فضلاں کے باپ کو مخاطب کر کے چلائی۔

"غفورے۔ غیرت جاتی تجھے نظر نہیں آتی ---؟

فضلاں کے باپ غفور کو جیسے کسی نے تھپڑ مار دیا ہو... وہ بجلی کی سی تیزی سے اٹھا اور رشید کو اپنی طرف گھسیٹتے ہوئے پھنکارا۔

"بھابی منہ سنبھال کے بات کر۔ بہو کے منہ پر کالک نہ مل۔ اس نے اپنی جوانی اِس گھر کی عزت پر قربان کر دی اور اب تو اس کو نیا گھر دکھانے چلی ہے۔"

"رشید میرے جاے کا خون ہے۔ اس پر میرا حق ہے"۔ وہ غرائی۔

"حق ہے! تو لے پکڑ لے" غفور نے رشید کو دادی کی طرف دھکیل دیا۔ اور وہ چارہ کاٹنے والی مشین پر گرتے گرتے بچا۔ گھر والے پیار سے اسے "میرا کھلونا میرا بٹولا" کہا کرتے تھے۔ وہ سچ مچ کھلونا ہے۔ اس کا اپنا آپ کچھ نہیں۔ یہ حقیقت آج رشید پر واضح ہو گئی۔

آج پہلا موقعہ تھا کہ دو شفیق بوڑھیاں دیورانیاں جٹھانیاں نظر آ رہی تھیں۔ ورنہ فضلاں کی ماں اپنی جٹھانی کے سامنے سدا دبی ہوئی کم آمیز اور صلح کل سی بنی رہتی۔ اس کی اپنی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ بیٹی بیاہی۔ بیٹا بیاہا۔ اسے خبر ہی نہیں ہوئی کہ یہ مشکل فرائض کیوں کر انجام پذیر ہوئے۔

بیٹی بیوہ ہوئی تو جیٹھ جٹھانی نے بہو بیٹے کو اپنے پروں میں سمیٹ لیا گویا وہ صرف ان کی ذمہ داری تھی۔ شادی، مرگ جیسے بڑے بڑے واقعات بھی گھرانے کی بنیج میں کوئی تبدیلی نہ لائے۔ جیسے سب ایک اکائی تھے ناقابلِ تقسیم۔ مگر آج یہ اکائی پارہ پارہ ہو گئی تھی۔ ہر فرد اپنی نفی آپ تھا۔

فضلاں اس وقت گھر کی دہلیز پہ کھڑی گھر والوں کو ایک چیلنج کے ساتھ تک رہی تھی کہ رشید کے دادا نے فضلاں کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"فضلاں --- بچے... ! غصہ تھوک دے۔ تو جو کہے گی وہی ہوگا... لڑکا کالج میں پڑھے گا۔ کیوں نہیں پڑھے گا۔ یہ اس گھر کا نام ہے"

فضلاں کی ساس خاوند کی بات بزور رد کرتے ہوئے دہاڑی۔

"لڑکا کالج میں نہیں پڑھے گا۔ دس جماعتوں نے فضلاں کا دماغ خراب کر دیا۔ بی۔ آ پڑھ گیا تو کیا ہوگا... عقل سے کام لو۔ تم گھر کے بڑے ہو۔"

فضلاں کی ماں بیٹی کو پکڑ چارپائی تک لاتے ہوئے ممیائی۔

"بھابی... دھن جگر امیرا۔ میں نے تیرے سامنے سی نہیں کی... پر اب نہیں چلے گا۔ لڑکے کی زندگی کا سوال ہے۔"

رات گئی تک آنگن میں طعن و تشنیع ہوتی رہی۔ عورتیں تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد رونے لگتی تھیں اور جھولیاں پھیلا پھیلا کر ایک دوسرے کو بد دعائیں دیتی تھیں۔ رشید کی وجہ سے گھر کا ہر فرد کھل کر سامنے آ چکا تھا۔ آخر میں فیصلہ یہی ہوا کہ رشید لاہور جا کر پڑھے گا۔ وہ نالائق نہیں کہ وہاں چل نہ سکے۔ دادی کو اپنے موقف سے دست بردار ہونا پڑا۔ رشید کے سامنے کوئی پروگرام یا پلان نہیں تھا۔

اگلے ہفتے رشید کالجیئٹ بن گیا۔

یہاں آ کے چند ہفتوں میں اس کا حلقۂ یاراں وسیع ہو گیا ہوسٹل کی خوراک سے اکتائے ہوئے نوجوانوں کے لیے اس کے پاس کافی سامان ہوتا تھا۔ قسم قسم کی پنجیریاں۔ پنڈیاں۔ مکھن انگوری گیہوں کے مرنڈے۔ گاجر کا حلوہ۔ انڈے اور نہ جانے کیا کیا۔ ماں، دادی، نانی... تینوں عورتیں اپنی اپنی پسند کی چیزیں بنا بنا کر بھیجتی رہتی تھیں ایک دوسری پر سبقت لے جانے اور انا کی تسکین کے لیے۔

بزرگوں اور عزیزوں کی مہربانیوں کے حصار میں پلا رشید شہر میں آ کر خود کو خاصا بالغ محسوس کرنے لگا تھا۔ وہ اب تک پیار کی جانے والی ہستی تھا۔ مگر انسان صرف چاہے جانے کے لیے پیدا نہیں ہوا۔ چاہنے کے درد سے آشنا ہونا زندگی کی مٹھاس ہے۔ اپنی دریافت کا راستہ چاہنے اور شدید چاہنے ہی میں ہے۔ چاہے جانا جمود ہے، جہالت اور فنا ہے

رشید کے لیے کالج کا زمانہ مطلق العنانی کا دور تھا۔ مکمل آزادی سے لطف اندوز ہونے کے مواقع قدم قدم پر موجود تھے۔ تعطیلات کے دوران گاؤں جا کر اس کا جی اچاٹ، بے مزہ رہتا۔ پرانے راستے۔ پگڈنڈیاں... ایک طرح سے سورج کا طلوع غروب اور وہی پرانے چہرے جن پر کوئی نہ کوئی رشتہ چسپاں تھا۔ رفتہ رفتہ اس نے چھٹیوں کا زیادہ عرصہ شہر میں گزارنا شروع کر دیا۔ وہ شہر کے حوالے سے خود اپنی دریافت کر رہا تھا اور ششدر تھا۔ یہاں نیلی آنکھوں والی نائلہ تھی۔ بلونہ طاہرہ تھی، سانولی سلونی کے سراپے میں تو سارا کالج گم تھا۔ اور ان سب میں نمایاں ہستی رملہ تھی۔ رملہ کے پاس سے گزر جانا ہی گویا نئی دنیا سے آگاہ ہو جانا تھا۔ وہ کسی پر اعتماد ماحول کی پروردہ تھی۔ اسے کالج میں پڑھنے کا سلیقہ آتا تھا۔

پہلی ہی نظر میں رملہ رشید کے دل میں گھر کر گئی۔ صبح شام رات اور دن، سفر میں حضر میں اس کے دل کی آنکھوں کے سامنے ایک تصویر ابھرتی رہتی۔ جس کی بیک گراؤنڈ میں لال اینٹوں کے ستون سے لپٹی بوگن بلیائی بیل تھی۔ پھولوں کے گہرے گلابی شعلوں نے ہر شے کو دہکا رکھا تھا۔ انہیں شعلوں میں ایک چنگاری تھی رملہ، جس نے رشید کے بھس بھرے دل کو سلگا کے رکھ دیا۔ اور اب ہر طرف دھواں دھواں تھا چڑھتی عمر میں لڑکوں کے جسم میں خون نہیں خالص پیٹرول دوڑتا پھرتا ہے۔ دھوپ تک سے آگ پکڑنے کو تیار۔ رملہ ایم۔ اے

انگریزی کے فائنل میں تھی اور وہ صرف سالِ اوّل کا طالب علم ۔۔؟ تو کیا ۔۔؟ عشق اور مشک موقع محل کب دیکھتے ہیں۔ چل نکلتے ہیں۔

رملہ .. انگلش ڈیپارٹمنٹ کے برآمدے میں اپنے پسندیدہ ستون کے ساتھ ٹیک لگائے کسی گہری سوچ میں غرق تھی۔ لڑکے لڑکیاں کلاسیں ختم ہونے کے بعد جا چکے تھے۔ رشید اس کے قریب جا کر ایک دم رک گیا۔ رملہ اس کو دیکھ کر حسب معمول ہولے سے بولی۔

"ہیلو..."

"ہیلو..."

وہ عام لڑکیوں کی طرح چھوٹی موٹی نہ تھی۔ لنک شک کم دکھائی اعتماد سے بات کرتی.. رشید نے ہمت کر کے انگریزی میں کہا۔

"میں آپ سے دوستی کرنا چاہتا ہوں"

"او... کیوں نہیں" Cute وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرائی۔ رشید نے نظریں نیچی کرلیں۔ دوستی کی ابتدا ہو گئی۔

اب وہ بلا جھجک رملہ کے پاس جا کھڑا ہوتا۔ وہ رشید سے اس کی سمجھ بوجھ کے مطابق باتیں کرتی۔ صحت اور پڑھائی کے متعلق پوچھتی۔ خاص انداز میں نصیحتیں بھی کرتی، تاہم ان کی گفتگو کا موضوع محبت کبھی نہ ہوا۔ جس کی رشید کو بہت جلدی تھی۔

بڑے دنوں کی چھٹیاں ہوئیں تو وہ ایک دن کے لیے گاؤں چلا گیا۔ اس بار گاؤں جانے کے پیچھے ایک مقصد بھی تھا۔ وہ نئے سال پر رملہ کو ایسا تحفہ دینا چاہتا تھا جو اتنا قیمتی ہو کہ رملہ کبھی اسے اپنے سے جدا نہ کر سکے۔ اس کے لیے بھاری رقم درکار تھی۔ ماں سے رقم مانگی تو اس نے چپکے سے اپنا طلائی کڑا بیٹے کے حوالے کر دیا۔

"میرے لیے تجھ سے پیاری کوئی چیز نہیں۔ لے ضرورت پوری کر"

جیب میں کڑا ڈالے وہ موقع کی تلاش میں تھا۔ وہ یہ کڑا رملہ کو پہنانا چاہتا تھا۔ خواہش یہ تھی کہ اس کی پسند کے لحاظ سے کڑا فروخت کر کے ہی کوئی اعلیٰ تحفہ خریدا جائے۔ لیکن رملہ آج کل سنجیدگی سے پڑھائی میں جٹی ہوئی تھی۔ سیمینار روم میں کتابیں سامنے پھیلائے سر ہاتھ پر دھرے یا تو کچھ غور کر رہی ہوتی یا دھڑا دھڑ نوٹس بنا رہی ہوتی۔ ایسے میں اسے ڈسٹرب کرنا کچھ اچھا نہیں لگتا۔ رشید تھوڑی دیر دروازے پر منڈلاتا رہا۔ پھر جرأت کر کے کمرے کے اندر چلا گیا۔

"سلام..."

"سلام بھئی... کیسے ہو۔۔؟" رملہ نے بغیر دیکھے جواب دیا۔

"باجی۔ ! آپ میرے ساتھ چلیں گی۔۔؟"

"کہاں۔۔؟" وہ ابھی بھی کام میں منہمک تھی۔

"انار کلی۔۔!"

"کیا لینا ہے۔۔؟" رملہ نے قلم چلاتے چلاتے لگاوٹ سے پوچھا۔

"تحفہ"

"کس کے لیے۔۔؟" وہ شرارت سے مسکرائی اور نگاہ اٹھا کر رشید کی طرف دیکھا رشید لرز گیا۔ وہ پھر لکھنے لگ گئی۔

"ہاں... ! بولو... کس کے لیے۔۔؟" رملہ نے اپنا سوال دہرایا۔

"آپ کے لیے"

"میرے لیے !" رملہ نے کاغذ اور قلم ہٹا دیے وہ قدرے چونک گئی۔

"تو تم... میرے لیے تحفہ خریدنا چاہتے ہو۔۔! پھر تتلا کر پوچھا۔

منے میاں کی جیب میں کتنے پیسے ہیں۔۔؟ رشید نے احتیاط سے لپٹا ہوا طلائی کڑا کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ سرگوشی سی سنائی دی۔

"اس کو بیچ دیں گے" رملہ بھونچکا سی رہ گئی اس سرگوشی سے۔

"کہاں سے لیا۔۔؟"

"اماں سے" رشید کا جواب مختصر تھا۔

چوری تو نہیں کیا۔۔؟

"ہرگز نہیں... آپ کو تحفہ دینے کے لیے میں چوری نہیں کروں گا۔"

"شاباش"

رملہ نے اس کی پیٹھ تھپکی۔

"اچھا سنو... سیمو... چوری نہیں کیا... تو چوری ہو جائے گا۔ باپ رے پانچ چھ تولے سونا تم جیب میں لیے پھرتے ہو...!"

آپ رکھ لیجیے۔

"کیوں... میں کیوں رکھوں؟"

"آپ ہی کا ہے"

"نا... ایسے نہیں کہتے"

"تو پھر کیسے کہتے ہیں—؟ میں آپ کا احترام کرتا ہوں۔ عزت کرتا ہوں۔

"اور... اور مجھے... وہ ہکلانے لگا تو رملہ نے بات مکمل کردی۔

"مجھے آپ سے محبت ہے" رشید کی آنکھیں چھلک آئیں اور اس نے دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ لیا۔ رملہ نے دیکھا کہ رشید کا وجود دھیرے دھیرے کانپ رہا ہے۔ اس وقت وہ انتہائی بے بس نظر آتا تھا۔ کچھ لمحے اسی طرح گزر گئے۔ رشید روتا رہا اور رملہ سوچتی رہی کہ کیا کرے۔ اچانک اس نے رشید کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے اور اس کی بھیگی آنکھوں میں جھانکا جہاں ابدی ازلی گواہی تھی۔

"میں تیرے لیے جیتا ہوں— صرف تیرے لیے" رملہ نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اس کے ہاتھوں سے رشید کے ہاتھ یوں چھوٹ گئے جیسے نیند سے بوجھل ہاتھوں سے کھلونا... اس وقت دونوں بچوں کی مانند تھے۔ حیران حیران اور چونکے ہوئے— خجل اور خائف— خاصی دیر گزر جانے کے بعد رملہ نے سوال کیا۔

"رشید...! مجھ سے بیاہ کرو گے—؟"

رشید کو اس سوال کی توقع نہ تھی۔ وہ آپ سیٹ ہوگیا۔ یہاں تک تو اس نے کبھی سوچا ہی نہ تھا، اور یہ بات فی الحال سوچنے کی تھی ہی نہیں۔ اس کے ذہن نے زقند بھری۔

"دیکھیے! آپ مجھے Emberiss کیے دے رہی ہیں... نہیں میں... اس سوال کا جواب..." اسے نہیں سوجھ رہا تھا رملہ نے فقرہ مکمل کیا...

"اس کا جواب تم اماں سے پوچھ کر دوگے—! ہیں نا—؟"

"ہوں" اس نے بے خیالی میں کہا— "مگر آپ میرے ساتھ تحفہ خریدنے تو چلیں..." اظہار میں خجالت کے روڑے سے اٹک رہے تھے۔

"مگر مجھے آپ سے کچھ نہیں لینا ہے" رملہ کے لہجے میں کوئی جھول نہ تھا۔

"کیوں—؟" رشید پریشان ہو اٹھا۔

"اس لیے کہ آپ نے اپنی اماں سے نہیں پوچھا... اچھے بچے ایسا نہیں کرتے۔ ہوں" رملہ نے کڑا دوبارہ رومال میں باندھ کر اس کی جیب میں رکھ دیا۔ خود پرس اور کتابیں پکڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں تو چلتے ہیوں گی... بڑی سردی لگ رہی ہے۔ چلو گے—؟" وہ اس کے پیچھے پیچھے سر جھکائے سیمینار روم سے باہر آگیا۔ ریڈنگ روم سے گزرتے ہوئے اسے دل وجان دونوں بوجھل لگ رہے تھے۔ رملہ نے کاؤنٹر پر کتابیں واپس کیں اور عجلت سے سیڑھیاں اتر گئی۔ رشید لڑکوں کے جھنڈ میں شامل ہوگیا۔ لڑکے کسی ٹرپ پر جانے کا پلان بنا رہے تھے۔ رشید کو اس پلان میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ سیدھا کینٹین پہنچا۔ رملہ اسے دروازے پر ہی مل گئی۔

"آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔"

"آپ نے بھی میری بات کا جواب نہیں دیا" رملہ نے زور دے کر کہا۔

"پہلے آپ"

"نہیں پہلے آپ"

وہ بے ساختہ ہنسنے لگے۔ تھوڑی دیر پہلے کی یبوست ایک قہقہے سے کافور ہوگئی۔

رملہ کالج اوور ہوتے ہی گھر چلی گئی۔ اب کالج کے ہر کنگرے سے خاموشی لپٹ چکی تھی۔ البتہ میوزک روم سے آتی طبلے کی دھمک رشید کے دل کی گمبھیر حالت کو اور گمبھیر کر رہی تھی۔ وہ ہوسٹل جانے کی بجائے لان میں پڑے بینچ پر لیٹ گیا۔ اسے بھوک تھی نہ پیاس اور نہ ہی کسی اور سے بات کرنے کو جی چاہتا تھا۔ وہ تنہا رہنا چاہتا تھا اپنے اندر جھانکنے کے لیے ویسے بھی وہ اب تک قابل اعتماد دوست نہیں بنا سکا تھا۔ کھانے پینے کے یار بہت تھے۔ دوسرے آتے ہی مخالف جنس کی کشش نے اسے اتنی فرصت نہ دی کہ وہ ہم عمروں میں گھل مل سکے۔ وہ بے مدہ تنہا تھا اور تنہائی اسے میٹھے ہلکورے دے رہی تھی، کچھ گھنڈیاں کھول رہی تھی۔

اگلے روز پھر اسے رملہ نے مایوس کیا۔ آج تو حد ہی ہوگئی۔ پروفیسر روم کے اندھیرے کوریڈور میں سے گزرتی رملہ کسی پروفیسر کے کمرے میں جا رہی تھی۔ اس کی ہم جماعت لڑکیاں تیز تیز باتیں کرتی اس کے ساتھ چل رہی تھیں۔ دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے رشید کو دیکھ کر رملہ ٹھٹھک گئی اور بازو سے پکڑ کر روشنی میں لاتے ہوئے بولی۔

"کیا بات ہے ۔۔؟"
"کچھ نہیں" وہ بوکھلا گیا۔ رملہ کی سہیلیاں یوں ہنسی جیسے انھیں رشید کے بارے میں پورا علم ہو۔
اور تب ہی ۔۔۔ ناٹے قد کی زرد رو انیسہ آگے بڑھی ۔۔۔ "سنا ہے ۔۔۔ آپ بڑے اداس ہیں آج کل"
"نہیں تو" رشید کے ہاتھ سے کتابیں چھوٹتے چھوٹتے بچیں۔ رملہ لگاوٹ سے مسکرائی۔ رشید کو یہ مسکراہٹ زہر لگی۔ محبت کا گراف کئی ڈگری نیچے آرہا ۔۔۔

رشید کی بھرپور کوشش کے باوجود رملہ تحفے والی بات تک نہ پہنچی نہ معلوم کیوں وہ ہر بار Crazy boy کہہ کر ٹال دیتی تھی۔ انھیں کوششوں کے دوران زرد رو انیسہ اس کی راہ میں باہیں پھیلائے آگئی۔ وہ ازخود اس کے پاس پہنچ جاتی۔ چلتے کو روک لیتی۔ وہ بے حد باتونی مگر بیمار سی لڑکی تھی۔ اس میں کسی قسم کی کشش اور دلکشی نام کو نہ تھی۔ وہ لڑکوں سے بے تکلف باتیں کرتی۔ ہر کلاس کا لڑکا جونیر ہو یا سینر اس سے مل سکتا تھا۔ وہ کالج کی مختلف سیڑھیوں پر بیٹھی لڑکوں لڑکیوں سے چیخ چیخ کر باتیں کرتی ۔۔۔ اس کا یہ اعلان عام تھا کہ "مجھے بھائی بنانے کا بہت شوق ہے"۔
"کیا آپ کا سگا بھائی کوئی نہیں" لڑکے پوچھتے ۔۔۔
"کیوں نہیں ۔۔۔ ماشاءاللہ چار ہیں ۔۔۔ بھائی تو جتنے ہوں اتنے اچھے ہیں نا رشید" وہ اطمینان کے ساتھ جواب دیتی۔
رشید کی کوئی حقیقی بہن نہ تھی۔ ویسے گاؤں کی ہر لڑکی تو اس کی نانی دادی بہن ہی بتاتی تھیں۔ اب کے عید پر گھر گیا تو ماں نے کسی لڑکی کا ذکر کرتے ہوئے اسے بتایا ۔۔۔ ہم تجھ سے اس کی منگنی کرنے والے ہیں" تو اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا اس نے تذبذب کے ساتھ ماں سے پوچھا ۔۔۔
"وہ تو میری بہن ہے"۔
"نہیں" ماں نے مختصر جواب دیا۔
پھر وہ نانی کے پاس گیا۔ دادی سے پوچھا۔ وہ چلتے چرخوں کی ہتھیاں تھام کر بولیں ۔۔۔
"ہاں افضلاں ٹھیک کہتی ہے۔ جوان ہوگئے ہو ۔۔۔ جوانی میں سوچ بدل جاتی ہے۔ تم بھی بدلو ۔۔"
"مگر ۔۔۔"
"مگر کا مطلب ۔۔؟"
"وہ میری ماسی کی لڑکی ہے۔ میری بہن ہے ۔۔"
"چل بک نا ۔۔ کاڑھنی میں دودھ پڑا ہے۔ موٹی موٹی ملائی آچکی ہوگی ۔۔۔ سویوں پر ڈال کر کھالے ۔۔" رشید نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔ ملائی کھاتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا اچانک گھر والوں کو میری شادی کی کیا سوجھی۔ جب رملہ نے اس سے پوچھا کہ مجھ سے شادی کروگے تو وہ تب بھی الجھ گیا تھا۔ دنیا نے اسے ایک دم شادی کے قابل قرار دے کر اسے حیران کر دیا تھا۔ اور انیسہ کہہ رہی تھی "مجھے تو بھائی بنانے کا شوق ہے"۔

ایک روز انیسہ باتیں کرتی کرتی اس کو انار کلی تک لے گئی۔ رشید کھسیانا سا گھبرایا گھبرایا اس کے ساتھ چلتے ہوئے خود کو اجنبی سا لگ رہا تھا۔ ایک جوان شہری لڑکی۔ چپڑ چپڑ باتیں کرتی انیسہ میں اگر چہ اسے کوئی دلچسپی نہ تھی پھر بھی ایک مہم جوئی کی امنگ دل میں موجود تھی سو وہ کشاں کشاں گیا جہاں وہ رکی وہ بھی رکا۔ جہاں وہ پہنچی وہ بھی پہنچا۔ اب وہ ایک بڑے جنرل اسٹور کے اندر کاؤنٹر کے سامنے کھڑے تھے۔ سیلز مین نے مختلف رنگوں اور ڈیزائنوں کی درجن بھر فینسی جرسیاں، سویٹر، کارڈیگن کاؤنٹر پر پھیلا دیئے۔ انیسہ نے بڑی مشتاق بیگم کی مانند ناک بھوں چڑھا کر ایک ایک کو الٹایا پلٹایا، دیکھا، پرکھا اور ایک پر انگلی رکھتے ہوئے بولی۔
"کیا خیال ہے اس کے بارے میں ۔۔؟" انیسہ نے رشید سے ایسے پوچھا جیسے چونچال بیویاں شوہروں سے پوچھتی ہیں۔ پھر کارڈیگن کو چھاتی پر پھیلاتے ہوئے بولی۔
کہو تو لے لوں ۔۔۔ ٹھیک لگ رہی ہے؟" رشید کن پٹیوں تک سرخ ہو گیا ایسی بے تکلفی اور بے ساختگی ۔۔ ؟ اسے توقع نہ تھی۔
اس نے سر کی ہلکی سی جنبش سے "ہاں" کہہ دی۔ بالکل ان شوہروں کی طرح جو بیوی سے دو قدم پیچھے رہ کر شاپنگ کرواتے ہیں۔ اس ہلکی سی "ہاں" نے اسے آسودہ بھی کیا اور اپنی نظر میں اہم بھی بنا دیا۔ اب وہ تن کر کھڑا تھا اور مسرور تھا۔ جب وہ دو جرسیوں کی پے منٹ کر کے اسٹور سے باہر نکلے تو انیسہ نے پوچھا۔
"رشید ۔۔۔ تمہیں پنک رنگ پسند ہے نا ۔۔؟" رشید کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ایسے موقعوں پر کیا جواب دیتے ہیں۔ لیکن رات کو رملہ کی یاد نے اسے تڑپا تڑپا دیا ۔۔۔
"ظالم، ظالم" وہ بڑبڑایا، نیم خوابیدہ، نیم جاں۔

صبح ناشتے پر اس کے روم میٹ نے انکشاف کیا...

بھئی کیا "ظالم. ظالم" کی رٹ لگا رکھی تھی رات بھر۔ اپنا سائیکو انیلیسز کرواؤ۔ نہیں تو پاگل ہو جاؤ گے" رشید کے ذہن اور رویے میں کئی تبدیلیاں آ رہی تھیں۔ رملہ جہاں تھی وہیں رہی۔ البتہ انیسہ روز بروز اس کے قریب آتی گئی۔ ماں کا کڑا اس نے بیچ دیا اور جتنی رقم تھی چند دنوں میں خرچ کر دی... اب کے تعطیلات میں وہ گھر بھی نہیں جا سکا۔ بس جی ہی نہیں چاہا۔ کالج بند ہونے کے بعد انیسہ لائبریری سے کتابوں کے لین دین کے سلسلے میں تقریباً ہر روز آ جاتی تھی۔ پھر دونوں گھومنے نکل جاتے۔ ریستوران میں چائے پیتے لارنس گارڈن کے گوشوں میں بیٹھ کر گھنٹوں گپ شپ ہوتی۔ انھیں ملاقاتوں کے دوران انیسہ نے اسے اس تجربے سے گزار دیا۔ جس کے متعلق رشید کی معلومات ابھی محدود تھیں۔ انیسہ کے بے باک پن اور سپردگی نے اسے کافی نڈھال اور چکنا چور کر دیا۔ رملہ کا خیال جو ہر وقت اس کے ساتھ رہتا تھا اب بہت دھندلا گیا۔ وہ اس سے بہت دور کھڑی اس کی افتاد کا جیسے مذاق اڑا رہی تھی۔ انیسہ کا ردِ عمل بالکل ویسا ہی تھا جب وہ پہلی بار شاپنگ کر کے نکلے تھے اور انیسہ نے کہا تھا۔

رشید...! تمہیں سچ مچ پسند ہے نا۔۔۔؟

اور رشید کو پتہ نہیں چل سکا تھا کہ ایسے موقعوں پر کیا جواب دیتے ہیں۔

رملہ فائنل کے امتحانات میں بال بال پھنس چکی تھی۔ وہ بھی سالانہ امتحان کی تیاری کرنا چاہتا تھا۔ اس عرصے میں انیسہ نے اسے کافی سنبھالا دیا۔ اسے پتہ بھی نہیں چلا کہ اس نے کب رملہ کے پاس رکنا چھوڑا اور کب رملہ نے اس کو Crazy boy کہنا ترک کیا۔ معاملات غیر محسوس طور پر انجام پذیر ہو رہے تھے۔ انیسہ اب کالج میں کم دکھائی دیتی تھی۔ رشید پر رومانوی دورے بھی کافی کم ہو چکے تھے۔ شدت میں ٹھہراؤ آتا جا رہا تھا۔

مارچ اپریل کے زمانے میں کالج کی زندگی گویا دم لینے کو رک جاتی ہے۔ کلاسیں امتحانات کی وجہ سے نہ ہونے کے برابر ہوتی ہیں۔ جوش و خروش اور ولولے دب سے جاتے ہیں۔

ان ہی دنوں میں رشید کو گھر سے خط موصول ہوا۔ لکھا تھا

برخوردار، نورِ چشم، بعد دعائے خیر کے واضح ہو کہ تمہاری منگنی کی رسم خدا کے فضل و کرم سے انجام پائی۔ مبارک ہو۔" رشید کی اہمیت گھر کے لوگوں کے لیے جتنی تھی اسے اندازہ تھا۔ اس منگنی کی خبر نے اسے چونکایا نہیں کیوں کہ خاندانوں کے اندرونی معاملات بزرگوں کی مرضی اور وساطت سے طے پاتے ہیں۔ یہ تو اک دن ہونا تھا۔ مگر وہ یہ اطلاع تنہا ہضم نہیں کر پا رہا تھا۔ لہٰذا اس نے انیسہ کو یہ خبر سنانا ضروری سمجھا۔ جوں ہی انیسہ سے سامنا ہوا رشید نے بتایا...

"مجھے گھر والوں نے بلایا ہے۔"

"کس لیے... ؟ امتحان نہ دو گے۔"

"وہ تو دونگا... بس ذرا منگنی ونگنی کا چکر ہے۔"

"انکار کرنے جا رہے ہو۔۔۔؟"

"وہ کیوں۔۔؟"

انیسہ اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ چند ہی دنوں میں یہ جھینپو سا چھوکرا اتنا نڈر ہو چکا تھا۔ اس نے بلا تامل پوچھا

"میں بھی ساتھ چلوں۔ مجھے گارڈن دیکھنے کا بہت شوق ہے۔"

"نہ... نہ" رشید نے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے ایسے کہا جیسے کوئی بچہ دوسرے بچے کو کسی بھوت پریت سے ڈرائے۔

"نہ... دادا ماریں گے۔"

"کیوں... میں تمہاری بہن نہیں... اور گاؤں کے لوگ تو بہنوں کی بڑی قدر کرتے ہیں۔ ہیں نا۔۔۔؟"

"وہ تو ٹھیک ہے... لیکن میں تمہیں ساتھ نہیں لے جا سکتا۔ گاؤں کے لوگ ایسی آزادی کو پسند نہیں کرتے۔"

"اچھا ایسے کرتے ہیں۔ یہاں سے اکٹھے چلیں گے۔ آگے جا کر الگ الگ ہو جائیں گے۔" اور

"میں نے تمہارے بارے میں گھر والوں کو بتایا نہیں ہے۔"

"بتایا کیوں نہیں۔ تم مرد لوگ ہوتے ہی ایسے ہو" انیسہ نے تیوری سے کہا۔ مگر میں جاؤں گی... ماں جی سے ملوں گی اور کہوں گی کہ ایسے دودھ پیتے کو گود سے الگ کیوں کیا...؟"

"نہیں... تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے۔"

"ڈرتے ہو۔۔۔؟"

"ہاں..."

"کس سے ؟"
"پتہ نہیں ۔"
"اچھا تو پھر.. آج سے ختم" وہ جانے کے لیے تیزی سے مڑی۔
"کیا ؟"
"کیا۔!" اچانک انیسہ نے اپنی زرد بے مروت آنکھیں رشید کی آنکھوں میں ڈال دیں اور ٹک ٹک دیکھا کی۔ رشید نے شکست کے انداز میں نظریں جھکالیں اور فوری فیصلہ سنایا...
"اچھا چلیں گے ... نتائج کی ذمہ داری تم پر..."
"میں سنبھال لوں گی ..." انیسہ نے اعتماد سے کہا۔
گاؤں کے ریلوے اسٹیشن پر اترنے کے بعد کافی فاصلہ پیدل چلنا پڑتا تھا۔ یا پھر کوئی ٹوٹا پھوٹا تانگہ ٹم ٹم مسافروں کو لادے جاتا۔ رشید نے اسے تانگے پر جانے کا مشورہ دیتے ہوئے گھر کا اتہ پتہ بتا دیا۔ اور خود پیدل چل پڑا۔
جب انیسہ گھر کے احاطے میں داخل ہوئی تو جیسے ٹھہرے ہوئے سمندر نے یکایک ہلکورا سا لیا۔ اور جب اس نے بتایا کہ وہ شہر سے آئی ہے اور رشید صاحب سے ملنا چاہتی ہے تو تجربہ کار عورتوں کے ماتھے ٹھنکے انھوں نے ایک دوسری کی جانب سوالیہ انداز سے دیکھا۔ فضلاں اسے سرس کے نیچے بچھے پلنگ پر بٹھاتے ہوئے بولی۔
"رشید تو کافی دن ہوتے آیا ہی نہیں۔ بلکہ اس نے خط کا جواب تک نہیں دیا مجھے بڑی فکر ہو رہی ہے بلکہ ... بلکہ ... بلکہ"
"آپ رشید کی امی ہیں" انیسہ نے بھانپ لیا تھا۔
فضلاں اس کے لیے چھاچھ، دہی، مکھن، دال اور تنوری روٹیاں ایک بڑی سینی میں رکھ کر لے آئی ... انیسہ دیکھ رہی تھی کہ ماحول میں اس کے لیے پذیرائی نہیں ہے۔ دادی اور نانی تو اس کے پاس آکر بیٹھی ہی نہیں۔ انھوں نے انیسہ کو دیکھنے آنے والی لڑکیوں اور بچوں کو بھی دھتکار دیا۔ انیسہ کھانا کھا چکی تو فضلاں نے تجسس کا اظہار کیا۔
"کیا کام تھا رشید سے ۔ ؟"
"وہ آجائے تو بتاؤں ..."
"اسے آنا ہے"
"کہتا تھا ... تم پہنچو ... میں آتا ہوں"
ماں کا دل دھک سے رہ گیا ... کچھ ہونے والا ہے۔ کوئی بڑی بات ہو چکی ہے فضلاں اسے صحن سے کوٹھری میں لے گئی ۔ اس کا سراپا کانپ رہا تھا۔
"لے یہاں آرام کر ... لمبا سفر کر کے آئی ہو"۔
سفر کی تکان، مرغن غذا اور کمرے کی پرسکون فضا نے انیسہ پر غنودگی طاری کردی اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی سوگئی۔ آنکھ کھلی تو سہ پہر کے سائے اچھے خاصے ڈھل چکے تھے ۔
"رشید آگیا۔ ؟ اس نے آنکھ کھلتے ہی پوچھا۔
"نہیں" فضلاں پیڑھی پر بیٹھی لسن پیاز چھیل رہی تھی مزید کچھ نہ بولی ... انیسہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ بات واقعی تشویش والی تھی۔ وہ اب تک کیوں نہیں پہنچا تھا۔ ؟ کیا عزائم تھے اس کے ۔ ؟ وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر پھس پھس رونے لگی۔
"آپ کا بیٹا ... ڈرپوک اور جھوٹا ہے وہ آپ کا سامنا کرنے سے گھبراتا ہے ... میں بھروسے میں ماری گئی ..."
"کیا کہا ؟" فضلاں کو آنے والے وقت نے ہراساں کر رکھا تھا۔ "اس نے میری زندگی خراب کر دی" وہ زور زور سے رونے لگی تو فضلاں نے اسے کلاوے میں لے لیا ...
"نہ رو ... نہ رو ... ابھی آتا ہوگا ... میرا بیٹا جھوٹا نہیں ابھی اتنا ہوشیار نہیں ہوا۔ میں سمجھ گئی ... سب کچھ سمجھ گئی ... مگر تو رومت برادری ہے۔ شریکا ہے ... میری مت ٹھکانے نہیں وہ آجائے تو ..."
دیا بتی جلنے تک رشید آگیا گھمبیر فضا نے کروٹ سے لی۔
یہ وہ وقت تھا جب گاؤں کے مرد ڈھور ڈنگر باندھ کر صحنوں میں بچھی چارپائیوں پر آبیٹھتے ہیں۔ دن بھر کی رپورٹیں گھر والوں کو پہنچاتے ہیں اور ان کے حال چال سے آگاہ ہوتے ہیں۔
فضلاں جب چولہے پر موٹی موٹی روٹیاں ڈال رہی تھی رشید الگ چارپائی پر ... ہاتھوں کا تکیہ بنائے آسمان پر ابھرتے تاروں کو لاتعلقی سے دیکھ رہا تھا کہ دادا نے حقے کی نے بھائی کو تھماتے ہوئے کہا۔

"سنا ہے۔ شہر سے مہمان آئے ہیں ۔"

رشید نے رخ پھیرا تو فضلاں نے آنکھ کے اشارے سے کھسک جانے کے لیے کہا... اور وہ سلسلۂ کلام شروع ہونے سے پہلے بکریوں کے پاس جاکر میمنوں کو پچکارنے لگا۔

دادی نے پیالیوں میں سالن نکالتے ہوئے دیورانی کو حکم دیا "کوٹھری میں دیا رکھ آؤ۔"

"رکھ دیا" جواب مختصر تھا۔

"فضلاں کی ماں... سنا ہے شہر سے مہمان آئے ہیں" نانا نے بیوی سے پوچھا۔

"کیوں رشید کی دادی" رشید کے دادا نے اپنی بیوی سے دوبارہ استفسار کیا۔ برکتے رشید کی دادی شش و پنج میں تھی۔ کچھ ثانیے چپ رہی۔ زہریلی آواز سے بولی۔

"بہو سے پوچھو۔ اب بتا تاں سسر کو..." برکتے معاف کرنے والی نہ تھی۔ فضلاں کے ہاتھ تیزی سے روٹیاں گھڑ رہے تھے۔

"ہاں... ہاں فضلاں... بول دے سے۔" فضلاں کی ماں نے جرأت دلانے کے لیے بیٹی کو ٹہوکا دیا۔ فضلاں کا دوپٹہ ماتھے تک سرک آیا۔

"تایا... رشید نے جو کچھ بھی کیا... سوچ سمجھ کر ہی کیا ہوگا۔ پڑھا لکھا ہے۔ ہم سے زیادہ دماغ رکھتا ہے۔"

"فٹے منہ... تے لکھ دی لعنت۔ میں بتاتی ہوں جو ہوا... اور کیا پتا کس کا بیج اور کتنا جھوٹ کتنا سچ۔ ماں جتنی دن دے گیا کل میں دیوا تمہارا پوتا ہوگا بڑا مان تھا دادے کو پوتے پہ... نانے کو دوہتے پر۔"

"او چپ کر... بھلئے مانسے... ہوا کیا... کیوں زمانے کو سنائی ہے۔" "زمانہ دیکھے گا۔ صرف سنے گا نہیں... خیر سے پردادا بننے والے ہو۔"

رشید کے پاؤں تلے زمین ڈولنے لگی۔ جو کچھ کہا جا رہا تھا اس کے متعلق تو اس نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ انیسہ کی بے خوفی اور جرأت کا تجربہ اسے یقیناً تھا۔ مگر اسے اس حد تک پہنچ جانے کا گمان تک نہ تھا۔ وہ باپ بننے والا تھا... انیسہ نے بتایا کیوں نہیں۔ یہ کیا ہوا... ؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔

اس نے دیکھا کہ دادی آگ بھبھوکا ہو رہی ہے۔ کبھی وہ ڈوئی کو ہنڈیا کے کنارے پر بجاتی تھی۔ کبھی چولہے میں جلتی لکڑیوں کو خواہ مخواہ الٹتی پلٹتی تھی۔

"میری تو اس گھر میں کتّی کی حیثیت ہے۔ بھونکنے والی، راکھی کے لیے۔ کوئی سمجھے نہ سمجھے۔" اس نے روٹیوں کی چنگیر دونوں بدھوں کے درمیان پھینکی اور چادر کو بکل ماری...

"اچھا... اللہ حافظ... اب میں اس گھر میں نہیں رہ سکتی۔ جس میں اتنا گند گھلنے والا ہو... بڑی میم لایا ہے۔ نہ منہ نہ متھا۔ ادھری کو ہٹ کر لی" وہ چل دی۔

"برکتے کچھ عقل کو ہاتھ مار" شوہر نے غرا کر کہا۔

"نہیں بھابی... یہ نہیں ہوگا" غفور نے بھابی کو پکڑ لیا۔ فضلاں اور اس کی ماں خاموش تھیں۔ تب ہی انیسہ کوٹھری کی دہلیز پھلانگ کر باہر آگئی۔ اس نے چہرے کو چادر سے ڈھانپ رکھا تھا۔ فضلاں نے پیڑا وہیں چھوڑا اور بڑھ کر انیسہ کو چارپائی پر بٹھا دیا۔

"باہر مت جانا... شریک 'سو ہیں' لے رہے ہیں۔" وہ دوڑ کر صدر دروازے کے آگے کھڑی ہو گئی۔ اس نے اپنی آواز اور احساس کے تمام زیر و بم دبا لیے اور بولی۔

"اب کوئی باہر نہیں جائے گا... جو کچھ ہوگا... اسی چار دیواری کے اندر ہوگا۔

نہیں تو میں جان دے دوں گی ۔ میں اپنا گناہ آپ بھگتوں گی۔" اس نے رشید کو مخاطب کیا۔

رشیدے ۔ اتم سے بہتر تھا میں پتھر جنتی..."

رشید پر رخ پتھرا چکا تھا۔ تمام واقعات اس کی توقع اور سمجھ سے بالاتر تھے انیسہ نے اس پر سارے حملے اچانک اور تابڑ توڑ کیے تھے۔ یہ حملہ بے حد شدید تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے پیارے گھٹ گھٹ کر ذلیل ہو رہے تھے اور وہ کچھ نہ کر سکتا تھا۔ شرم و حیا کا جنازہ اس طرح نکلے گا اس نے کبھی سوچا نہ تھا۔ وہ اتنا احمق اور اندھا تھا اسے آج پتہ چل رہا تھا... سب ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے اور چپ تھے... فیصلے کی قوت کسی میں نہ تھی۔ اچانک دادا اٹھے... نہ جانے وہ کیا کرنے جا رہے ہیں۔ سب دم بخود تھے کہ کیا ہونے والا ہے۔ ! وہ ہولے ہولے چلتے فضلاں کے پاس جا کھڑے ہوئے۔ ان کی بھرائی ہوئی آواز سب کے کانوں سے ٹکرائی... وہ فضلاں کو گلے لگا کر کہہ رہے تھے۔

"ہم بے وقوف تو ہیں... مگر بے غیرت نہیں... یہ لڑکی اب یہاں رہے گی۔ اور تم ماں بیٹا... بھگتو نہ بھگتو ہلا کیا ہے۔ آج ہی سل نہ ہوں گے... گھر کی بات گھر میں رہنی چاہیے۔"

رشید آنکھوں پر بازو رکھ کر جہاں کھڑا تھا کھڑا رہا۔

ابھی لکھنؤ دور ہے

ڈاکٹر بشیشر پردیپ

اے ۵۵۵، اندرا نگر۔ لکھنؤ ۱۶

چار سال پہلے کی وہ ملاقات میں بھول چکا تھا۔ میں ہی نہیں میری بیوی رشمی بھی بھول چکی تھی۔ پنچ ٹائم میں دفتر سے گھر آنے پر ڈاک میں سری نگر سے آیا ایک خوب صورت ویڈنگ کارڈ دیکھا تو چند سیکنڈ میں مجھے یاد آگیا کہ یہ ان تین لڑکیوں میں سے ایک کی شادی کا کارڈ ہے جن سے آج سے چار برس قبل سری نگر میں ملاقات ہوئی تھی۔

ان تین لڑکیوں میں سے ریناکس لڑکی کا نام تھا یہ اب بھی یاد نہیں آرہا تھا۔ میں نے دوبارہ ویڈنگ کارڈ پڑھا۔

"شری متی اور شری کیلاش ناتھ ٹکو اپنی بیٹی رینا کی شادی شری متی اور شری ہرش دھر کے صاحب زادے اقبال دھر سے کر رہے ہیں۔ اس پُرمسرت موقع پر آپ کی شرکت ان کے لیے باعثِ تشکر ہوگی۔ پروگرام،

استقبال برات۔ سات بجے شام ۱۵ نومبر ۱۹۸۸ء

مقام۔ برلنگٹن ہوٹل لکھنؤ۔"

یعنی شادی لکھنؤ میں تھی اور وہ بھی آج ہی۔

رینا ٹکو۔ کشمیر میں رہنے والی ایک لڑکی۔ اس کی شادی یہاں لکھنؤ میں ہو رہی تھی۔ یہ کیسا اتفاق تھا؟! میں نے رشمی کو شام کو تیار رہنے کے لیے کہہ دیا۔

ان دنوں سری نگر میں کرفیو لگا ہوا تھا۔ میں اور رشمی جب پہل گام سے لوٹے تو سری نگر میں اپنے ہوٹل "لگن" تک پہنچنے میں بڑی مشکل کا سامنا کرنا پڑا۔ صبح جب پہل گام گئے تھے تو حالات نارمل تھے لیکن رات کو لوٹنے پر معلوم ہوا کہ شہر میں کرفیو لگ گیا ہے۔ دوسرے دن ہم نے یوں بھی آرام کرنے کی ٹھان رکھی تھی۔ کرفیو نے ہمارے اس پروگرام میں مدد کی۔ ہم سارا دن ہوٹل ہی میں پڑے رہے۔ تیسرے دن بھی کرفیو تھا۔ لیکن ہمارا ہوٹل کینٹ ایریا کی کالونی سرنا در میں تھا۔ اس علاقہ میں کرفیو نہیں تھا۔ ہم اپنی اس کالونی میں گھوم پھر سکتے تھے۔ چنانچہ صبح ناشتہ کرنے کے بعد ہم کالونی میں گھومنے کے لیے نکلے۔ اور گھومتے ہوئے کالونی سے باہر سڑک پر آگئے۔ اور وہاں سے کچھ دور تک بھی ہو آئے۔ واپسی میں سڑک کے اس موڑ پر جہاں سے ہمارے ہوٹل کو راستہ جاتا تھا ہمیں دو لڑکیاں ملیں۔

اُن میں سے جو بڑی تھی اس نے پوچھا۔

"انکل۔ یہ راستہ کھلا ہے کیا۔؟"

"نہیں۔ بس تھوڑی دور تک جا سکتے ہیں۔ آگے نہیں جانے دیتے۔"

وہ دونوں ہی خوب صورت تھیں۔ ایک کی عمر سولہ سترہ برس کی ہوگی اور دوسری کی انیس بیس کی۔

میں نے پوچھا۔

"آپ کو کہاں جانا ہے۔؟"

"انکل میں نے دفتر جانا ہے۔ سوچا شاید راستہ کھلا ہو۔"

بڑی لڑکی نے جواب دیا۔

"نہیں۔ آپ آگے نہیں جا سکتیں۔ پھر دفتر تو آج بند ہوگا۔ کرفیو میں دفتر کون جا سکتا ہے۔"

"ہاں۔ یہ تو ہے۔"

وہ دونوں ہمارے ساتھ واپس چل پڑیں۔

"یہ تو سروس کرتی ہیں۔ اور آپ۔؟" میں نے چھوٹی لڑکی سے پوچھا۔

"میں پڑھتی ہوں۔ انٹر میں۔" اس کے گورے چہرے پر سرخی جھلک آئی۔

"آپ تو یہیں کی رہنے والی ہیں نا۔۔؟"
"جی ہاں ۔ ہم لوگ کشمیری ہیں۔ اور یہیں سرناور میں رہتے ہیں ۔" بڑی لڑکی نے جواب دیا۔
"ہم لوگ ہوٹل گگن" میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ اسی کالونی میں جو ہوٹل گگن ہے نا۔۔ اس میں ۔۔" میں نے بتایا۔۔
"آپ لوگ کہاں سے آتے ہیں ۔۔؟"
"لکھنؤ سے۔"
"لکھنؤ سے۔۔؟" اب کی چھوٹی لڑکی بولی ۔۔" اس کے چہرے پر سرخی کے علاوہ اس کی آنکھوں میں بھی چمک آگئی ۔
"لکھنؤ تو بہت دور ہے یہاں سے ۔۔ ہے نا۔۔؟" اب اس کی آنکھوں میں ایک ان دیکھے دور دراز علاقے کا تصوّر جھلکنے لگا۔
"نہیں ۔ ایسا دور تو نہیں ہے ۔ ہم لوگ بھی تو آئے ہیں وہاں سے ۔ آپ لوگ بھی ضرور آیئے لکھنؤ۔۔"
"ہاں ۔ لکھنؤ دیکھیں گے کبھی۔" بڑی لڑکی بولی۔
کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر رشمی نے پوچھا۔
"آپ دونوں بہنیں ہیں کیا۔۔؟"
"جی ہاں ۔ ہم دونوں کزن ہیں۔۔" بڑی لڑکی بولی ۔" اس کے ممی پاپا اننت ناگ میں رہتے ہیں۔ یہ یہاں پڑھتی ہے۔ ہمارے یہاں رہتی ہے۔" اور چھوٹی لڑکی کا چہرہ پھر سرخ ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ جب بھی بولتی تھی یا جب بھی اس کے بارے میں بات ہوتی تھی، اس کے چہرے پر سرخی جھلکنے لگتی تھی۔
ہم اپنے ہوٹل کی طرف جانے لگے تو بڑی لڑکی بولی۔
"آیئے انکل ۔ آپ لوگ ہمارے گھر آیئے۔ وہ سامنے ہمارا گھر ہے۔"
ہم دونوں رک گئے۔ اور ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ ہماری ہچکچاہٹ کو دیکھتے ہوئے اس نے پھر کہا۔
"چلیے نا آنٹی۔ چلیے نا انکل۔"
میں نے دیکھا چھوٹی لڑکی کی آنکھوں میں بھی اصرار تھا۔
آیئے نا۔" اس کے لہجے کی اپنائیت اور اس چھوٹی لڑکی کی آنکھوں کے خاموش اصرار نے ہمیں مجبور کر دیا۔
"اچھا چلیے۔" میں نے کہا اور وہ دونوں خوش خوش آگے آگے چلنے لگیں۔
"وہ رہا ہمارا گھر۔" بڑی لڑکی نے دائیں طرف چار مکان چھوڑ کر ایک مکان کی طرف اشارہ کیا۔ آس پاس کے بنے مکانوں کے مقابلے میں ان کا مکان کافی چھوٹا تھا۔ ہمیں صحن میں سے گزارنے کے بعد بڑی لڑکی سامنے بنی لکڑی کی سیڑھیوں کے پاس رک گئی۔ اور بولی "آیئے اوپر آیئے۔ اوپر ہماری بڑی دیدی ہیں۔" ہم اس کے پیچھے تھے اور ہمارے پیچھے تھی اس کی چھوٹی بہن۔ آٹھ دس سیڑھیاں چڑھنے کے بعد وہ ہمیں دائیں طرف بنے ایک کمرے میں لے گئی۔ سامنے پلنگ پر ایک چوبیس پچیس برس کی ایک لڑکی بیٹھی تھی اور اس کے ساتھ ایک بزرگ عورت۔ اس لڑکی نے ان کو کشمیری زبان میں ہمارے بارے میں بتایا کہ یہ لوگ ٹورسٹ ہیں۔ لکھنؤ سے آتے ہیں اور ہوٹل گگن میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ "ٹورسٹ"، "گگن اور" لکھنؤ" کے الفاظ سے ہم نے یہی مطلب نکالا۔ ہم دونوں نے ان کو نمستے کہتے ہوئے ہاتھ جوڑ دیے۔ اس لڑکی نے ان کا تعارف کراتے ہوئے پہلے بزرگ عورت کی طرف اشارہ کیا۔
"یہ میری بڑی دیدی ہیں۔ اور جمّوں میں رہتی ہیں ۔۔" اور پھر اس لڑکی کا تعارف کراتے ہوئے اپنی ساتھی چھوٹی لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔
"یہ اس کی بڑی بہن ہیں۔۔ ان کی ابھی تھوڑے دن پہلے سروس لگی ہے یہاں۔" اور اس چھوٹی لڑکی کے گورے چہرے پر پھر سرخی دوڑ گئی۔
وہ جو اس چھوٹی لڑکی کی بہن تھی اور جو سب سے بڑی تھی۔ جس کی وہاں ملازمت لگی تھی بہت اچھی اردو بولتی تھی۔ لکھنؤ کے بارے میں بولی۔
"لکھنؤ تو بہت مشہور شہر ہے۔ ایک تاریخی شہر ہے۔ لکھنؤ کی تہذیب۔ لکھنؤ کی نفاست۔ لکھنؤ کی نزاکت۔۔"
"جی ہاں۔ آپ لوگ آیئے نا کبھی لکھنؤ کی سیر کرنے ۔ آپ آیئے اور ہمارے گھر ٹھہریے۔
یوآر ویل کم ٹو سٹے وِد اس (you are welcome to stay with us)" میں نے کہا۔ اور جواب بھی اس سب سے بڑی لڑکی نے دیا۔
"شکریہ۔۔ ہم ضرور آئیں گے کبھی۔ لکھنؤ دیکھنے کا ہمیں بہت شوق ہے۔ لیکن آپ تو جانتے ہیں انکل۔ کشمیر ایک ٹورسٹ شہر ہے۔ دنیا بھر کے سیاح آتے ہیں یہاں۔ اس کی دوری کچھ معنی نہیں رکھتی۔ لیکن لکھنؤ ہمیں بہت دور لگتا ہے۔ لیکن پھر بھی دیکھیے شاید کبھی موقع مل جائے"
اسی وقت وہ لڑکی جو ہمیں ساتھ لائی تھی اٹھی اور یہ کہتے ہوئے باہر نکل گئی۔

"پہلے میں آپ کے لیے چائے بنا لاؤں۔"

ہم نے اسے نہیں روکا۔ چائے کے لیے منع کرنا ہمیں ان کے خلوص کو ٹھیس پہنچانے کے مترادف لگا۔

باتوں باتوں میں پتہ چلا کہ اس کے والد سرکاری کام کے سلسلہ میں چار پانچ روز کے لیے بارہ مولا گئے ہوئے ہیں اور اس کی ماں اس کے بھائی کے پاس قاضی کنڈ گئی ہوئی ہے۔ اس کا ایک ہی بھائی ہے جو اسٹیٹ بنک آف انڈیا قاضی کنڈ میں کام کرتا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ آئی تو اس کے ہاتھوں میں ایک لکڑی کی بڑی سی ٹرے تھی جس میں چائے کے دو گلاس رکھے تھے اور دو پلیٹیں رکھی تھیں جن میں پراٹھے رکھے تھے۔

"ارے یہ پراٹھے کیوں بنا لائیں آپ۔ ہم تو صرف چائے لے لیتے۔"

"نہیں انکل۔ بس ایک ایک پراٹھا ہی تو ہے۔ ہم خالی چائے کیسے پلاتے۔" اسی دوران وہ چھوٹی لڑکی اٹھی اور اس نے کونے میں رکھے ایک اسٹول کو ہمارے سامنے رکھ دیا۔ جس پر اس نے چائے کا سامان رکھا۔ ہم نے چائے کی طرف دیکھا تو وہ بولی۔

"آپ اسے کشمیری چائے کہہ سکتے ہیں لیکن دراصل یہ مغل چائے ہے۔ بلکہ قہوہ ہے۔ اس میں دودھ نہیں پڑتا۔ بادام کوٹ کر ڈالا جاتا ہے اور چھوٹی الائچی بھی۔" ہم نے دیکھا گلاسوں میں سنہری رنگ کا مشروب تھا اور اس میں کوٹے ہوئے بادام کے ٹکڑے تیر رہے تھے۔ خستہ قسم کے پراٹھے کھانے اور ساتھ میں اس چائے کو پینے میں واقعی مزا آگیا۔

اور پھر میں نے انھیں جیب سے نکال کر اپنا پتہ لکھا کارڈ دیا۔ اور اُن سے اُن کا پتہ مانگا۔ وہ چھوٹی لڑکی اٹھی اور ایک کاپی کے پھاڑے ہوئے کاغذ پر پتہ لکھ لائی۔

'دیپا۔ رینا۔ انجنا۔ مکان نمبر ۲۲۳، سرنا ور۔ سری نگر کشمیر'

اور اب یہ ویڈنگ کارڈ۔ یعنی رینا کی شادی کا دعوت نامہ، ہمیں اس ملاقات کی یاد دلا رہا تھا۔ ان تینوں لڑکیوں میں سے رینا کون تھی۔ میں اور رشمی قیاس لگانے لگے۔

میں نے رشمی سے کہا۔

"ان لڑکیوں نے ہمیں یاد رکھا۔ ہم تو بھول ہی گئے تھے ان کو۔ اُن سے ہوئی تقریباً گھنٹہ بھر کی اس ملاقات کو۔"

اور پھر مجھے یاد آیا کہ ان سے پتہ لینے کے بعد میں نے کہا تھا۔

"ہم واپس جا کر آپ کو خط لکھیں گے۔ آپ بھی جواب ضرور دیجیے گا۔"

لیکن ہم نے کوئی خط نہ لکھا۔ پہلے کچھ دن خط لکھنے کے بارے میں سوچتے رہے پھر یہ بھی بھول گئے۔ مجھے یہ بھی یاد آیا کہ ان سے رخصت ہوتے وقت میں نے کہا تھا۔

"ہم لوگ پرسوں صبح دس بجے اپنے ہوٹل سے روانہ ہوں گے۔ ہوٹل سامنے ہی تو ہے۔ جاتی بار آپ سے مل کر جائیں گے۔"

اور میں نے اس روز صبح رشمی سے کہا تھا۔ "چلو ان لوگوں سے مل آئیں۔"

لیکن رشمی نے ٹال دیا تھا۔ نہ جانے کیوں وہ ملنے کے لیے تیار نہ ہوئی؟۔ اور پھر اچانک بارش شروع ہوگئی تھی۔ موسلا دھار بارش۔ اور اس موسلا دھار بارش نے جیسے رشمی کو ایک بہانہ دے دیا تھا۔ رشمی نے کہا تھا۔

"اب اس بارش میں کہاں جا سکتے ہیں۔ اب تو آپ یہ منائیے کہ دس بجے تک موسم صاف ہو جائے!" اور میں نے بھی کچھ اسی طرح دل کو سمجھا لیا تھا۔ کبھی ان میں سے کسی لڑکی سے ملاقات ہوگئی تو کہوں گا بارش کی وجہ سے ہم لوگ آنہ سکے۔ لیکن میرا دل اداس ہوگیا تھا اس وقت۔ اور اب یہ سوچ کر افسوس ہوا کہ چار برس گزر گئے اور ہم نے کبھی یاد ہی نہ کیا۔ اور ان لوگوں نے اتنے عرصہ کے بعد بھی یاد رکھا۔ اور اس چھوٹی سی ملاقات کی بدولت جو ایک انجان سا، ایک بے نام سا رشتہ بن گیا تھا۔ اسے پھر سے تازہ کرنے کے لیے انھوں نے ویڈنگ کارڈ بھجوا دیا ہے۔

"رشمی کچھ یاد آیا۔ یہ رینا ان میں سے کس لڑکی کا نام تھا۔۔؟"

"میرے خیال میں اس لڑکی کا جو ہمیں اپنے گھر لے جانے کے لیے اصرار کر رہی تھی۔ یعنی جو دو لڑکیاں پہلے ملی تھیں ان میں سے بڑی لڑکی۔"

"نہیں۔ میرے خیال میں اس لڑکی کا جس کا بات بات پر چہرہ سرخ ہو جاتا تھا۔" اور میری نگاہوں کے سامنے وہ معصوم گورا چہرہ ابھر آیا اچانک سرخ ہوتا ہوا۔

"سب سے بڑی لڑکی بھی تو ہو سکتی ہے جو بہت اچھی اردو بولتی تھی۔" رشمی نے کہا۔

"ارے شام کو شادی میں تو جانا ہی ہے۔ وہاں پتہ چل جائے گا۔"

کارڈ میں برات کے سواگت کا مقام برلنگٹن ہوٹل لکھا تھا۔ وہ لوگ کشمیر سے دو تین روز تو ضرور پہلے آئے ہوں گے۔ اگر کارڈ کچھ

روز پہلے مل گیا ہوتا تو ہم لوگ ان سے مل بھی آتے۔ لیکن یہ کارڈ بھی تو پورے پندرہ دن بعد ملا ہے۔ اب تو شام کو ہی ملاقات ہوگی۔ کچھ دیر پہلے چلیں گے تاکہ بھیڑ ہونے سے پہلے ان لڑکیوں سے ملاقات ہو جائے اور اگر ہو سکے تو دلہن سے بھی۔ کارڈ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ لڑکے والے لکھنؤ کے کشمیری محلہ میں رہتے ہیں۔ یعنی لڑکی نے شادی کے بعد لکھنؤ ہی میں رہنا ہے!

شام کو میں دفتر سے ذرا جلد ہی آگیا۔ برات کا سوآگت سات بجے شام لکھا تھا۔ ہم وقت سے بہت پہلے برلنگٹن ہوٹل کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہاں پہنچے تو امید کے خلاف وہاں کوئی شامیانہ یا کوئی سجاوٹ نظر نہ آئی۔ کہیں بھی شادی کا کوئی منظر نہ تھا۔ یہ کیسی شادی ہے؟! ہم حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ ہم دونوں کے ذہنوں میں ایک ہی جیسے سوالات ابھر رہے تھے۔ انھوں نے برات کے سوآگت کا مقام تو نہیں بدل دیا۔؟ شادی کی تاریخ تو نہیں بدل گئی؟ کوئی حادثہ تو پیش نہیں آگیا۔؟ ہم نے ہوٹل کے مختلف کمرے دیکھ ڈالے چھوٹی سی بھیڑ بھی کہیں نہ ملی۔ ہوٹل کے منیجر سے پوچھا تو پتہ چلا کہ شادی تو اسی ہوٹل میں ہونی تھی اور ہوٹل بک بھی ہوا تھا۔ لیکن پچھلے ہفتہ کوئی صاحب آئے اور کہہ گئے کہ شادی منسوخ ہو گئی ہے۔ انھوں نے کوئی وجہ نہ بتائی۔

ہم دونوں حیران اور اداس لوٹ آئے۔ ہم دونوں ہی ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے۔ آخر کیا وجہ ہو سکتی ہے شادی کے منسوخ ہو جانے کی۔؟! کہیں اس لڑکی کو کسی سے محبت تو نہیں تھی۔ وہ کسی خاص لڑکے میں دلچسپی رکھتی ہو اور اس کے ساتھ بھاگ گئی ہو!؟

اور پھر ہم نے فیصلہ کیا کہ ایک دو روز تک انھیں خط لکھیں گے۔ اگر انھوں نے ہمیں اپنا سمجھ کر کارڈ بھیجا ہے اور کسی وجہ سے شادی منسوخ ہو گئی ہے تو خط لکھ کر ان سے شادی کے منسوخ ہو جانے کی وجہ پوچھنے میں حرج ہی کیا ہے۔ لیکن خط لکھ کر پوچھنا ہمیں کچھ عجیب سا بھی لگ رہا تھا۔ چار پانچ دن گزر گئے اسی کشمکش و پنج میں۔ ہم روز ہی اس شادی کے بارے میں باتیں کرتے۔ اس شادی کے منسوخ ہو جانے کے بارے میں۔ ان لڑکیوں کے بارے میں۔ اور اس ملاقات کے بارے میں۔ اور چھٹے دن ہمیں ان کا خط ملا۔ یہ خط لڑکی کی بڑی بہن کی طرف سے تھا۔ اور اس خط سے سمجھ میں آگیا کہ شادی اس لڑکی کی ہونا تھی جس کا چہرہ بات بات پر سرخ ہو جاتا تھا۔ سب سے چھوٹی لڑکی کی۔ میں خط پڑھ رہا تھا اور مجھے اس خط کے اوپر اس لڑکی کا چہرہ نظر آرہا تھا۔ سرخ ہوتا ہوا معصوم چہرہ۔ خط میں لکھا تھا۔

ڈیر انکل۔

رینا نے ایم۔ اے کر لیا تھا۔ اور اس کی شادی لکھنؤ کے ایک کشمیری گھرانے میں طے ہوئی تھی۔ لڑکا بھی ایم۔ اے تھا اور سب تعلیم یافتہ لوگ تھے۔ ہم سب اس رشتہ سے خوش تھے۔ لکھنؤ ہمارے لیے بہت دور تھا لیکن لکھنؤ میں آپ جو رہتے تھے!۔ اور رینا بہت خوش تھی کہ وہ لکھنؤ میں جا کر بسے گی۔ ہم لوگ خوش تھے کہ لکھنؤ شہر دیکھیں گے۔ لیکن ہم لوگوں کی قسمت میں یہ رشتہ نہ تھا۔ شادی کی سب تیاری ہو چکی تھی۔ کارڈ وغیرہ بھیجے جا چکے تھے کہ رینا کے سسرال والوں کی طرف سے اچانک کچھ "مانگیں" آگئیں۔ کچھ کھلے منہ اور کچھ اشاروں میں۔ ہم لوگ تو شاید ان کی مانگیں پوری بھی کر دیتے لیکن رینا نے منع کر دیا۔ اس نے یہاں شادی ہی سے انکار کر دیا۔ مانگ تو انکل ایک معمولی چیز کی بھی ہو بہت کھلتی ہے۔ اور بھیانک سپنے دکھانے لگتی ہے۔ ہے نا۔؟

اچھا جو منظور خدا۔

امید ہے آپ اور آنٹی راضی خوشی ہوں گے۔

آپ کی،

انجنا

میں نے خط پڑھ کر آہستہ سے رشمی کی طرف بڑھا دیا۔ جس انجانے بندھن کو میں چار برس سے بھولا ہوا تھا اس بندھن میں مجھے ایک دم شدت سی محسوس ہونے لگی۔ ان لوگوں کا درد، ان کی پریشانی مجھے سب اپنی لگنے لگی۔ اور میرا دل بے چین ہو اٹھا۔ اور جب رشمی نے خط واپس میری طرف بڑھایا تو مجھے وہ معصوم چہرہ پھر نظر آنے لگا۔ سرخ ہوتا ہوا۔ لیکن اب اس سرخی میں ایک غصہ تھا۔ ایک ملال تھا۔ اور۔۔ اور ارادے کی پختگی تھی۔

●●

اُڑان

رفیعہ منظور الامین

میڈیا سینٹر، یونیورسٹی آف کشمیر، سرینگر

بھوپال گیس کے المیے میں تین ہزار انسان ہلاک ہوئے۔ اور ان کے پیچھے جو زندہ درگور ہوئے ان کا شمار ہی کیا۔ انسان جب قدرت سے ٹکر لیتا ہے تو عفریت جنم لیتے ہیں۔ سائنسی ترقی نے جہاں جہاں بنجر سے ہاتھا پائی کی ہے وہاں وہاں ایسے ہی عفریت اٹھ کھڑے ہوتے ہیں جنہوں نے انسانی نسل کو ایسے گھاؤ دیئے ہیں جنہیں وقت کا مرہم کبھی مندمل نہ کرسکا۔ محبت، ہمدردی، خلوص کے معنی بدل گئے۔ انسانیت کے دھارے بدل گئے۔

عابدہ بھی قدرت کی ستم ظریفی کا شکار تھی۔ ماں باپ نے گیس پھانک لی ختم ہوگئے اور ساتھ ہی اپنے لاڈلے دس سالہ بیٹے اور چار سالہ نسیم کو بھی لے گئے۔ بڑا بیٹا اسد بیوپار کے سلسلے میں گوالیار گیا ہوا تھا، بچ گیا۔ عابدہ بھی بچ گئی کیونکہ وہ رو رو کر دوپٹے میں منہ لپیٹے فرش پر ہی سو گئی تھی سانس آنسو بھرے نم دوپٹے نے اس کی جان بچالی۔ رونے کا کارن یہ تھا کہ اس کے جہیز کے لیے جو کنگن بنوار کھے تھے وہ بھی ابا آج ہی بیچ آئے تھے۔ جب سے بیوپار ٹھپ ہوا تھا بس یہی اطوار تھے ابا کے ——— ایک ایک چیز جو اس کے لیے بنوار کھی تھی بکتی جا رہی تھی۔ بیوپار بھی ایسا کون بڑا تھا۔ چھوٹی موٹی منیاری سامان کی دوکان تھی۔ اس پر اسد کا اصرار کہ اب اس کی شادی کردی جائے۔ جہاں جوان بیٹی نظروں کے سامنے جو کٹریاں بھر رہی ہو وہاں آپا پہلے بہو کیسے لے آتے۔ اسد کو دلاسہ دیتے رہے کہ بس عابدہ کے ہاتھ پیلے ہوجائیں اسد کے لیے بھی نوبت نقارے بجوا دیئے جائیں گے۔ لیکن وہ عابدہ کے لیے لڑکا کہاں سے لاتے۔ جو آتا رقم کے لیے منہ پھاڑے آتا۔ عابدہ تھیں قبول صورت، سگھڑ، سبھی کچھ تھی۔ لیکن جس بات سے بات بنتی ہے وہی بات اس کے پاس نہیں تھی۔ وہ پیسے کی کھنک! ——— بغیر گھنگھرو رادھا کیسے ناچتی! اور اب دیکھو تو یہ قیامت ٹوٹ پڑی۔

مرنے والوں کے لواحقین کو جو معاوضہ ملا اس نے اسد کو بھی فائدہ پہنچایا۔ لیکن گوالیار میں ہی اس نے رضیہ سے اپنی بات پکی کرلی تھی۔ بیوی زبردست آئی، اس نے معاوضے پر عابدہ کا حق کبھی نہیں مانا۔ ٹوٹتے ہوئے گھر کی جگہ اچھے خاصے پکے مکان نے لے لی۔ گھر کا فرنیچر، برتن سب کچھ بدل گئے۔ لیکن عابدہ کی قسمت نہیں بدلی۔ وہ مسلسل دل یزداں میں کانٹے کی طرح کھٹکتی رہی۔ آخر ایک دن اسد کی بیوی نے ہی اس کا رشتہ لگا لیا۔

لڑکے کی عمر پینتیس سال تھی۔ اس نے بھی گیس کے تھپیڑے سہے تھے۔ آنکھوں سے مسلسل پانی بہتا تھا۔ بیوی ایک بیٹا اور بیٹی جان بحق ہوچکے تھے۔ اسے ایک جوان بیوی کی سخت ضرورت تھی جو اس کی خدمت کرسکے۔ ویسے وہ عابدہ کے لیے بالکل آئیڈیل تھا کیونکہ اس کے تقاضے کچھ نہیں تھے۔ بات پکی ہوگئی اور عابدہ نے رو رو کر اپنا برا حال کرلیا کیونکہ اس نے مضبوط چھڑی کو دیکھ لیا تھا جس کے بغیر اس کا ہونے والا خاوند دو قدم بھی نہیں چل پاتا تھا۔ اب اسے ہی اس چھڑی کی جگہ لینی تھی۔ وہ زندگی بھر چھڑی بنے کیسے رہ سکتی تھی۔ چھڑی بھی تو کبھی کھونٹے سے سر ٹکا دیتی ہے۔ وہ کس سینے پر سر لگائے آنکھیں بند کیے دنیا کے ستم بھول سکتی۔ وہ سینہ جو ہمیشہ دھونکنی کی طرح دھڑکتا رہتا تھا۔ بلغمی کھانسی کی وجہ سے! ویسے بھی نوجوان کندھے دنیا کا ہر بوجھ اٹھا لیتے ہیں لیکن کسی اور کا بوڑھاپا ان کے لیے بہت بھاری ہوتا ہے۔ عابدہ تو یوں بھی جوان تھی دلکش تھی رسیلے خوابوں کی ماری تھی۔

ایسے میں نزہت آپا فرشتۂ رحمت بن کر آئیں نزہت آپا امریکہ رہتی تھیں۔ جب بھی ہندوستان آتیں تو یہاں سے ڈھیر ساری چیزیں امریکہ لے جاتیں جو وہاں چوگنے داموں بیچتیں تو آن کا کرایہ نکل آتا۔ مزید فائدہ ہی ہوتا۔ اب وہ بھوپال چاندی کا زیور خریدنے آئی تھیں۔ وہ رشتے میں اسد کی دور کی سالی بھی لگتی تھیں اور وہ اسد کے ہی کے ذریعہ چاندی کے گہنے تھوک میں خرید رہی تھیں۔ گھر میں وہ اٹھتے بیٹھتے عابدہ کو مستعدی سے کام کرتے دیکھتیں۔ ان کی نظر میں ان کے چار بچے جو بیسوں گھنٹے لپے رہتے جو ہر دم گھر کو اکھاڑا بنائے رکھتے۔ وہ ڈھیروں برتن جو ڈش واشر کو ترستے رہتے۔ محنتی شوہر کی مسلسل ریں ریں کہ انہیں گھر کا کام اور چاروں بچوں کو سنبھالنا بہت عذاب لگتا ہے کیونکہ ان کی نوکری نہ ہونے کی وجہ سے نزہت آپا ہی کے بل بوتے گھر چل رہا تھا۔ ویسے بھی نزہت آپا کو گھر کے کام اور بچوں کی دیکھ بھال پسند نہیں تھی۔ عابدہ انہیں ہر تن کا جن لگی۔ جو ہاتھ ان کے سب مسائل حل کردے۔

انہوں نے بیروقت برباد کیے اپنی تجویز اسد کے سامنے رکھ دی۔

"عابدہ کو مجھے دے دو۔
"کیا کہہ رہی ہیں آپ"۔ اس نے حقیقت کو مذاق سمجھ کر کہا۔ اگلے مہینے اس کی شادی ہے"
"کون! اس بڈھے کھوسٹ سے؟" نزہت آپا بولیں۔
"بڈھا ہے تو کیا ہوا۔ رضیہ تنک کر بولیں "لاکھوں روپیہ ملا ہے اسے گیس سے مرنے والے خاندان کا۔ جب وہ مرے گا تو کوئی ہیں تھوڑے ہی وہ پیسہ ملنا ہے۔ سب کچھ اسی کا تو ہوگا" انہوں نے کپڑے دھو کر انگنی پر پھیلاتی عابدہ کی طرف اشارہ کیا۔
بڑی گرمی تھی۔ نزہت آپا نے بٹوے سے نکالے ڈالروں کا پنکھا بنا کر جھلتے ہوئے کہا" پیسہ تو تمہیں کبھی مل سکتا ہے" کبھی آگے تمہاری مرضی" وہ نوٹ بٹوے میں واپس رکھنے لگیں۔
"کیا کہہ رہی ہیں آپ"۔ غیرت مند بھائی نے بے چین ہو کر کہا" میں اپنی بہن نہیں بیچوں گا"
"تم بھی کیا اوندھی باتیں کرتے ہو"۔ اس سے پہلے کہ نزہت آپا کا بٹوہ وہ ڈالر ہضم کر جاتا رضیہ نے نوٹ جھپٹ لیے"۔ نزہت آپا کوئی غیر تھوڑے ہی ہیں۔ لوگ زندگی بھر خواب دیکھتے ہیں اور امریکہ کی چوکھٹ بھی نہیں چھو پاتے۔ عابدہ تو نصیبوں والی ہے۔ اور سچ پوچھو تو وہ بڈھا مجھے بھی پسند نہیں تھا۔ منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت۔ چلا ہے اتنی سی چھوکری بیاہنے"
نصیبوں والی عابدہ کا سودا ہو گیا۔
عابدہ بھی خوش تھی کہ چلو گھلے ہوئے بڈھے سے جان چھوٹی، اور وہ بھی کہاں جا کر؟ امریکہ! ــــ اس نے ایک دو فلموں میں اپنے ایکٹروں ایکٹریسوں کو امریکہ کی سڑکوں پہ کودتے پھاندتے دیکھا تھا۔ اسے اپنی قسمت پہ یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ خود سچ مچ وہاں پہنچ گئی۔ اس کے علاوہ نزہت آپا نے چپکے سے اسے بتایا تھا کہ انہوں نے وہاں اس کے لیے ایک لڑکا دیکھ بھی لیا ہے۔ انہوں نے اسے بتایا کہ وہ دل سے مجبور تھیں جو کسی کا دکھ نہیں دیکھ پاتا تھا۔ کم بخت دل ہی ایسا دیا تھا اللہ نے انہیں، لہٰذا وہ چاہتی تھیں کہ عابدہ کو اس دوزخ سے نجات دلائیں جس کے شعلے اس کی طرف لپکے ہی چلے آتے تھے۔ بڈھے کی سرد آگ اسے خاکستر میں دبی چنگاری بنا دے گی جو صدیوں جلتی رہے مگر کبھی شعلہ نہیں بن پائے گی۔ عابدہ کو نزہت آپا کے ڈائیلاگ بہت اچھے لگے ــ وہ خود بھی کتنی اچھی تھیں۔ کتنا درد مند دل تھا ان کا۔
چمبیلی کی لچکیلی ڈال جو سوکھنے جا رہی تھی دوبارہ ہری ہو گئی۔
اب وہ نزہت آپا کے کن کن احسانوں کا بدلہ چکاتے۔ ایرپورٹ جانے سے پہلے خود انہوں نے اسے تیار کیا تھا۔ اپنا نیا چاپانی سلک کا سوٹ پہنایا۔ اس کے بال جو خود اس کے قابو میں نہیں آتے تھے انہیں نزہت آپا نے ایک جوڑے کی شکل میں سنوار دیا تھا۔ وہ خود کو بہت اچھی لگی۔ معصوم، الہڑ، حیران آنکھیں، بیضوی چہرہ اور مسکراتے سے ہونٹ۔
سفر خوابناک رہا۔ وقت کا احساس ہی ختم ہو گیا۔ عابدہ تو بس اتنا ہی جانتی تھی کہ اتوار کو جہاز وطن سے اڑا تھا اتوار ہی کو امریکہ پہنچ گیا۔ تقریباً ۲ گھنٹے وقت پیچھے ہو گیا تھا۔ فرینکفرٹ سے کچھ نئے مسافر ساتھ ہو گئے۔ کچھ نے ساتھ چھوڑ دیا۔
نیویارک ایرپورٹ پہ وہ دم بخود مسحور سی دیکھتی رہی کہ نزہت آپا کس قدر مستعد تھیں، کیوں نہ ہو اس نے سوچا امریکہ جو رہتی ہیں! ـ اور وہیں چپ چاپ کھڑی رہی جہاں نزہت آپا نے اسے کھڑے ہونے کے لیے کہا تھا۔
نزہت آپا کے بات کرنے کا انداز بھی کتنا نیا نکلا تھا۔ زبردست خود اعتمادی تھی ان میں کسی سے مسکرا کر بات کر لیتیں تو کسی کے ساتھ بالکل سنجیدہ ہو جاتیں۔ لیکن ہر حال میں ان کی خوبصورت گردن تنی سی رہتی۔ انہوں نے ایک نظر عابدہ کو دیکھا اور اسے وہیں ٹھہرنے کا اشارہ کر کے کہیں چلی گئیں۔
عابدہ نے دیکھا ان کے ساتھ کوئی اور بھی تھا۔ "خدانخواستہ کہیں نزہت آپا نے کسی امریکن سے شادی تو نہیں کی ہوتی ہے، عابدہ چکرائی کیونکہ نزہت آپا کے ساتھ جو شخص تھا وہ قطعاً ہندوستانی نہیں تھا۔ سرخ و سفید لگتا تھا ابھی پرستان سے آیا ہے گہری نیلی پتلون، آسمانی رنگ قمیض، لگتا تھا پولیس افسر ہوگا۔ کچھ دیر بعد نزہت آپا لوٹیں وہی لافانی مسکراہٹ لبوں پہ لیے۔ مطمئن ـــــ اور پرسکون۔
عابدہ نے اپنا بیگ اٹھایا۔ لیکن نزہت آپا نے اسے ابھی وہیں رکنے کے لیے کہا اور آگے بڑھ گئیں۔ وہ کافی دیر ان کے انتظار میں کھڑی رہی۔ آخر تھک کر وہیں بیٹھ گئی۔ اس نے دیکھا کئی اور گورے بھی ٹانگیں پسارے نیچے بیٹھے گئے تھے۔ کیونکہ مسلسل جہازوں کی ٹریفک جاری تھی۔ چھٹیاں امریکنوں کو بے چین کر دیتی ہیں۔ وہ گھروں سے نکل پڑتے ہیں۔ ہفتے کے پانچ دن محنت کرنے والے یہ لوگ جب چھٹیاں کہیں گزار کر واپس گھر پہنچتے ہیں تو تازہ دم اپنے کام میں جٹ جاتے ہیں۔
"چلیئے" ـــــ ایک مہذب نوجوان نے پاس آکر کہا ـــــ ایرپورٹ کے اس جم غفیر میں جہاں، گورے، کالے، چپٹے ہر طرح کے لوگ تھے ایک خوش شکل ہندوستانی کو دیکھ کر عابدہ کی ڈھارس بندھی۔
"میں ..... میں ....." اس نے گھبرا کر ادھر دیکھا ادھر نزہت آپا آگئی تھیں۔
"انہوں نے ہی مجھے آپ کو لینے کے لیے بھیجا ہے"۔ نوجوان نے ایک دل آویز مسکراہٹ کے ساتھ اس کا بیگ اٹھاتے ہوئے کہا۔
عابدہ نے اس نوجوان پہ ایک بھرپور نظر ڈالی "آپ، آپ کون ہیں" ـــــ بمشکل اس کی زبان سے نکلا۔

"بس، سمجھ جائیے" اس نے چھیڑنے والے پُراسرار انداز میں کہا۔
عابدہ کے بہت کچھ سمجھ میں آ گیا۔ یہ نزہت آپا کی شرارت تھی۔ وہ شرما گئی۔ اس نوجوان کو پہلے ہی ایرپورٹ بلا رکھا تھا اور اب اس کے ساتھ اسے تنہا چھوڑ کر خود باہر نکل گئیں۔

"وہ باہر آپ کا انتظار کر رہی ہیں" نوجوان نے اسے لگاوٹ کی نظر سے دیکھا۔ "میں بھی تو ابھی ابھی پہنچا ہوں۔ چند دنوں کے لیے اٹلی گیا ہوا تھا۔ وہیں مجھے ان کا ٹیلی گرام ملا۔"

کاؤنٹر پہ پہنچے اور کیو میں کھڑے ہو گئے۔ اس نوجوان کے آنے کی وجہ سے عابدہ ایک گونہ بے فکر ہو گئی تھی۔ صرف دل کی دھڑکن تھی کہ اس کے ساتھ گھسر پھسر کیے جا رہی تھی۔ کاؤنٹر پہ کھڑے افسروں کے چہروں پہ وہ خشونت نہیں تھی جو ہندوستانی افسروں کے چہروں پہ ہوتی ہے۔ نہ سامان کی وہ حریص نوچ کھسوٹ ہوئی کہ مسافر سے کچھ نہ کچھ ہتھیا لیا جائے۔ وہ بڑی سہولت سے ایرپورٹ سے باہر نکل آئے۔

لیکن نزہت آپا کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ پارکنگ لاٹ میں جگمگاتی چمچماتی کاریں جھلکے ہوئے تاروں کی طرح تھیں۔ وہ کاروں کی بھول بھلیوں سے ہوتے ہوئے ایک جگہ رک گئے لیکن اس دوران دو اور لوگ ان کے ساتھ ہو گئے تھے جو تھے وہ بھی ہندوستانی لیکن ان کے چہروں پہ اپنائیت کہیں نہیں تھی۔ عابدہ بری طرح چکرائی۔ لیکن اس سے پہلے کہ اس کی چیخ نکلتی۔ ادھیڑ عمر والے نے اس کے منہ پہ ہاتھ رکھ دیا۔ دوسرے ہی لمحے اسے گھسیٹ کر کار میں ڈال دیا گیا۔

"تم اٹلی سے واپس ہو رہے ہو یا ہندوستان سے" نوجوان کے ایک ساتھی نے کہا۔
"کہاں سے پھانسی ہے یہ چڑیا۔ ابھی تو اس کے پر بھی نہیں کھولے" دوسرے ساتھی نے کہا۔
"لگتا ہے پھر کسی لڑکی کے چکر میں پھنس گئے ہو" پہلے نے منہ بنا کر کہا۔
"بکواس مت کرو" نوجوان نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا "تمہیں میں شکل سے چڑی مار لگتا ہوں؟"
"پھر بھی کچھ تو بتاؤ یہ بلا کیوں سر لے آئے ہو"
"یہ جس عورت کے ساتھ آئی اس پہ پولیس کو شک ہوا۔ لیکن تلاشی لینے پہ وہ صاف چھوٹ گئی۔ اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔"
"پھر بھی .... یہ لڑکی ...." ایک نے ٹوکا۔
"بات مت کاٹو" نوجوان بپھرا "میں کہہ نہیں سکتا کہ اس کے پاس بھی کچھ ہوگا کہ نہیں"
"پھر کیوں یہ مصیبت لے آئے" ادھیڑ ساتھی پھر بولا۔
"صبر سے کام لو نا ——" نوجوان بولا —— "وہ عورت بار بار اس کے جوڑے کی طرف دیکھے جا رہی تھی اور جب وہ اسے چھوڑ کر چمپت ہو گئی ...."

عابدہ نے اس کی باقی بات نہیں سنی کیونکہ وہ مارے ڈر کے بے ہوش ہو چکی تھی۔
لمبے سفر کے بعد جب کچھ اور بندشوں کے ساتھ عابدہ کا جوڑا کھولا گیا تو وہ سفید سفوف والی پڑیا بھی نکل آئی جو اس کے بال سنوارتے وقت نزہت آپا نے چپکے سے اس کے جوڑے کے اندر رکھ دی تھی۔

●●

اندر کی گنگناہٹ

منشا یاد

۲۶۲ ای سٹریٹ ۵، جی ۷/۴ اسلام آباد پاکستان

چند روز پہلے بھی اس نے یہی بات کہی تھی اور میں نے بہت سی دوسری باتوں کی طرح سنی ان سنی کر دی تھی مگر آج صبح جب میں دفتر جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا اس نے اپنی بات دہرائی۔ میں اس وقت جلدی میں تھا اسے کوئی جواب نہ دے سکا مگر منی بس میں بیٹھے بیٹھے اس کی بات پر غور کر کے دہل سا گیا۔ مجھے مرحومہ خالہ جان۔ آپا بانو اور ہیڈ کلرک ہدایت اللہ یاد آنے لگے۔

خالہ جان کے بارے میں میری معلومات زیادہ وسیع نہ تھیں وہ ایک دور افتادہ گاؤں میں بیاہی ہوئی تھیں۔ ان کا میاں مردم بیزار قسم کا آدمی تھا اور سسرالی رشتہ داروں کو تو بالکل پسند نہ کرتا تھا۔ وہ خالہ جان کو بھی میکے جانے اور اپنے رشتہ داروں سے ملنے کی اجازت نہیں دیتا تھا اور جو رشتہ دار کبھی کبھار ان کا حال احوال معلوم کرنے چلے جاتے وہ ان سے بھی اچھا سلوک نہ کرتا تھا اس لیے خالہ جان سے بہت کم ملاقات ہوتی تھی شاید دس پندرہ برسوں میں میں نے انھیں صرف چند بار دیکھا ہوگا۔ البتہ انتقال سے کچھ عرصہ پہلے وہ اپنے میکے آگئی تھیں تب ان سے ملاقات ہوتی رہتی تھی۔

ان کی دو بیٹیاں تھیں جو اپنے باپ کے پاس رہتی تھیں انھیں بھی بہت کم لوگوں نے دیکھا تھا۔ شاید بیٹا پیدا نہ کر سکنے کی وجہ سے خالو ان سے ناراض رہتے تھے پھر انھوں نے زیادہ وقت اپنی بیوہ بھابی کے ہاں گزارنا شروع کر دیا۔ جب میں آخری بار نانا جی کے ہاں خالہ سے ملا وہ نماز پڑھ رہی تھیں۔ ان دنوں وہ تقریباً ہر وقت نماز پڑھتی رہتی تھیں مصلے سے اٹھا کر کوئی انھیں ادھر ادھر لے جاتا تو چند ہی لمحوں بعد وہ یہ کہہ کر دوڑ پڑتیں۔

"ہائے میری نماز قضا ہو رہی ہے۔"

نماز پڑھتے ہوئے انھیں رکعتوں اور سجدوں کی گنتی بھول جاتی تھی وہ ایک ایک رکعت میں کئی کئی سجدے کرتیں اور بار بار انھیں سجدہ سہو پڑ جاتا۔ نماز کے علاوہ وضو کرنا اور ہاتھ پاؤں دھوتے اور پاک کرتے رہنا ان کی دوسری بڑی مصروفیت تھی۔ ناپاکی کا احساس ان کے ذہن پر ایسا سوار تھا کہ کوئی چھو بھی دیتا یا کوئی نجس جانور دور سے نظر آجاتا تو ان کے کپڑے پلید ہو جاتے۔ خدا جانے انھوں نے کس قسم کی زندگی گزاری تھی ان پر کیا بیتی اور کیا حادثہ پیش آیا تھا کہ اتنا نہانے دھونے اور صابن رگڑنے کے بعد بھی وہ پاک نہ ہو چکتیں۔ کچھ عرصے سے ان کا ذہنی توازن قائم نہ رہا تھا مگر انھیں کسی بات کا ہوش تھا تو اپنے تن من کا۔ مجال ہے دوپٹہ سر سے ڈھلکنے دیتیں یا کسی غیر مرد کی نگاہ اپنے بدن پر پڑنے دیتیں۔ اب تو خیر ان کی جوانی ڈھل چکی تھی مگر میں نے جب انھیں اپنے بچپن میں دیکھا وہ بہت خوب صورت تھیں۔ امی کہا کرتی تھیں کہ وہ تو کسی اور ہی دنیا کی مخلوق تھی پتہ نہیں ہمارے گھر میں کیسے پیدا ہو گئی تھی۔

مجھے یاد ہے جب میں چھوٹا سا تھا تو وہ ایک بار ہمارے ہاں میری بیمار والدہ کی مزاج پرسی کے لیے آئی تھیں اور جب بھی اکیلی ہوتی تھیں اپنے آپ سے باتیں کرتی رہتی تھیں۔ میں نے کئی بار کوشش کی کہ سنوں وہ کیا باتیں کرتی ہیں مگر ان کی کوئی بات سمجھ میں نہ آتی تھی۔ ان کے چلے جانے کے بعد میں نے کئی بار والدہ کو انھیں یاد کر کے اداس ہوتے دیکھا جس سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ خالہ اپنے گھر میں خوش نہیں تھیں مگر میں ان کے دکھ کی صحیح نوعیت نہ جان سکا۔ پھر جب وہ نانا جی کے پاس آگئیں تو میں انھیں دیکھنے کئی بار گیا۔ وہ اب بھی اکیلے میں زیر لب کچھ پڑھتی یا بڑبڑاتی رہتی تھیں۔ ان کے سونے جاگنے کا کچھ پتہ نہ چلتا تھا۔ سوتے میں بھی بلیوں اور کتوں کو دھتکارتی اور بڑبڑاتی رہتیں۔ مگر ان کی کوئی بات ٹھیک طرح سے سمجھ میں نہ آتی تھی۔ ان کا انتقال ہوا تو مجھے افسوس سے زیادہ سکون کا احساس ہوا۔

بانو میری تایا زاد بہن تھی مجھ سے کئی سال بڑی۔ وہ بھی بہت حسین اور نرم و نازک سی تھی شاید خوب صورت لوگ ہی زیادہ حساس ہوتے ہیں۔ وہ بھی بہت جلد غصے میں آجاتی بہت جلد من جاتی چھوٹی سی بات پر کھلکھلا کر ہنسنے لگتی اور ذرا سی ناپسندیدہ بات سن کر بلک بلک کر رونے لگتی۔ چونکہ اس کا کوئی سگا بھائی نہیں تھا اس لیے مجھ سے بہت پیار کرتی تھی جس روز میں اس کے ہاں کھیلنے نہ جاتا وہ اداس اور پریشان ہو جاتی اور میرے لیے طرح طرح کی چیزیں اور کھلونے لے کر ہمارے گھر آجاتی۔ جن دنوں ہمارے گھروں کے باہمی

تعلقات خراب ہوتے ہیں ایک دوسرے کے ہاں آنے جانے سے منع کردیا جاتا مگر ہم چھپ چھپ کر مل لیتے۔ وہ پنگھٹ سے پانی بھرنے جاتی تو میں بھی وہاں پہنچ جاتا یا وہ چھٹی کے وقت اسکول کے باہر کھڑی ہوجاتی۔ اکثر میرے لیے کھانے پینے کی چیزیں لیکاتی یا تلاش کرتی رہتی۔

میں ان دنوں چوتھی جماعت میں پڑھتا تھا جب آپا کا رشتہ طے ہوا۔ مجھے یاد ہے میں اس کی منگنی کی خبر سن کر خوشی خوشی اس کے گھر پہنچا تو وہ مجھے لپٹا کر دیر تک روتی رہی۔ میرا خیال تھا اسے اپنے ابا کا گھر چھوڑنے اور مجھ سے دور چلے جانے کا صدمہ تھا میں نے اسے تسلی دی "آپا۔ میں تمہیں وہاں بھی ملنے آیا کروں گا ابا نے وعدہ کیا ہے کہ وہ مجھے ساتویں جماعت میں چڑھتے ہی بائیسکل لے دیں گے بس دو تین سال کی تو بات ہے۔"

اس نے مجھے پیار کیا اور روتے ہوتے بولی۔

"پتہ نہیں میں اس وقت کہاں ہوں گی میرے ویر"

اس وقت تو میں اس کی بات نہیں سمجھ سکا تھا مگر بعد میں پتہ چلا کہ اس کے رشتے کی بات پہلے اس کے ماموں زاد سے چلی تھی اور وہ بہت خوش تھی مگر پھر برادری میں ایک قتل ہوگیا اور بہت سے رشتے ناتوں کی اکھاڑ پچھاڑ ہوگئی اب جہاں اس کی شادی ہونے والی تھی وہ ایک بدصورت اور گنوار سا آدمی تھا اور اگرچہ اس کے پاس ضرورت کے مطابق کافی اراضی تھی مگر اس کا اپنا آدھا دھڑ سوکھا ہوا تھا۔

مجھے یاد ہے منگنی کے ایک سال بعد جب آپا کی شادی ہوئی تو اسے بے ہوشی کے دورے پڑنے لگے تھے۔ مگر سب یہی کہتے تھے شادی کے بعد ٹھیک ہوجائے گی جب اس کی ڈولی اٹھانے لگے اس نے منع کردیا کہ جب تک وہ مجھ سے نہیں مل لیتی ڈولی نہیں اٹھانے دے گی میری ڈھنڈیا پڑی میں اس وقت اپنے ایک ہم عمر کے ساتھ قریب ہی کیکر کے پیڑ پر چڑھ کر گوند اتارنے میں مصروف تھا۔ مجھے درخت سے اتار کر اس کے پاس لایا گیا وہ مجھے لپٹا کر اتنی دیر تک روتی رہی کہ سب پریشان ہوگئے کیوں کہ برات کو دور جانا تھا اور دیر ہو رہی تھی۔ بڑی مشکلوں سے مجھے اس سے الگ کیا گیا۔ اس کے چھ سات ماہ بعد ایک روز مجھے پتہ چلا کہ آپا سخت بیمار ہے اور مجھے یاد کرتی ہے۔ والد صاحب کا ارادہ تھا میری دسمبر کی چھٹیوں میں مجھے اس کے پاس لے چلیں گے مگر وہ چھٹیوں سے پہلے خود ہی آگئی۔ وہ بستر پر لیٹی ہوئی تھی اس کا چہرہ کمہلا گیا تھا مجھے دیکھ کر رونے لگی مگر مجھے اپنے قریب آنے سے منع کردیا مبادا اس کی بیماری مجھے لگ جائے۔ میں روزانہ اس سے ملنے جاتا اور گھنٹوں اس کے پاس بیٹھا رہتا مگر وہ میرے بجائے خود سے باتیں کرتی رہتی۔ اسے بار بار کھانسی اٹھتی اور وہ قریب رکھی انگیٹھی میں خون آلود بلغم تھوکتی رہتی۔

اب میں ہائی اسکول میں داخل ہوگیا تھا اور بورڈنگ ہاؤس میں رہتا تھا۔ میری چھٹیاں ختم ہوئیں تو میں شہر چلا گیا۔ ایک دن گاؤں سے ایک آدمی آیا اور مجھے اپنے ساتھ گاؤں لے گیا اس نے بتایا تھا کہ آپا آخری وقت میں بھی مجھے پکارتی اور یاد کرکے روتی رہی تھی۔ میں گاؤں پہنچا تو اس کی آخری خواہش کے مطابق اس کا جنازہ میرے انتظار میں رکھا ہوا تھا۔

جہاں تک ہدایت اللہ ہیڈ کلرک کا تعلق ہے اس کا انتقال گذشتہ برس ہوا وہ عمر میں مجھ سے چند سال بڑا تھا اور تقریباً تین سال سے میرے ماتحت کام کر رہا تھا۔ اس کا قد لمبا اور صورت شکل اچھی تھی اگر کبھی وہ صاف ستھرا اور اچھا لباس پہن کر آتا جو وہ بہت کم پہنتا تھا اور میرے سامنے بیٹھ جاتا تو پتہ چلانا مشکل ہوجاتا کہ افسر کون ہے اور ماتحت کون۔ اسے خالہ جان یا بانو آپا کی طرح اپنے آپ سے باتیں کرنے کی عادت یا بیماری بھی نہیں تھی البتہ وہ جب بھی میرے پاس آتا گنگنا رہا ہوتا۔ شروع شروع میں مجھے غصہ آتا میں اسے کوئی کیس لے کر آنے کو کہتا تو وہ اچھا جی کہہ کر گنگناتا ہوا چلا جاتا پھر جب کاغذات لے کر لوٹتا تو بھی گنگنا رہا ہوتا۔ فائل کھول کر مجھے کیس کے بارے میں بتاتا اور جب میری بولنے کی باری آتی گنگنانے لگتا۔ یہ گنگناہٹ عام گنگناہٹ سے قدرے مختلف ہوتی اس کے ہونٹ تو ہمیشہ بند ہوتے، نتھنے بھی نہ پھڑکتے بلکہ شاید اسے پتہ بھی نہ چلتا کہ وہ گنگنا رہا ہے۔ کچھ عرصہ تو میں ضبط کرتا رہا پھر اسے دو تین بار ڈانٹا تو وہ حیران ہوا اس نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

"سر میں ایسی گستاخی کیسے کر سکتا ہوں کہ آپ بات کر رہے ہوں تو میں خاموشی اور توجہ سے سننے کے بجائے گانے گنگنانے لگوں"

یہ کہہ کر وہ پھر گنگنانے لگتا۔

پھر آہستہ آہستہ مجھے یقین ہوگیا کہ وہ ایسا جان بوجھ کر نہیں کرتا بلکہ یہ گنگناہٹ کہیں اس کے بہت اندر خود بخود ہوتی رہتی تھی جس کی اس کو بھی کچھ خبر نہیں تھی ویسے بھی یہ گنگناہٹ اتنی مدھم اور بے ضرر سی ہوتی تھی کہ عام طور پر کسی کو اس کا پتہ ہی نہ چلتا تھا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ وہ کون سی باتیں ہیں جو ہدایت اللہ کسی سے کہہ نہیں سکتا اور اپنے اندر منہ ڈال کر کرتا رہتا تھا مگر میں کبھی نہ جان سکا۔ میں نے اس کے لیے دل میں ہمدردی محسوس کرتے ہوئے اس کے نجی حالات معلوم کرنا چاہے مگر ہمارے درمیان عہدے اور درجے کا جو فرق تھا وہ رکاوٹ بن گیا۔ تاہم پی اے سے مجھے معلوم ہوا کہ ہدایت اللہ کی بیوی اچھے خاندان سے تعلق رکھتی تھی پڑھی لکھی اور حسین عورت تھی ان کا ایک پیارا سا بچہ بھی تھا اور ہدایت اللہ چھوٹے بھائی بہنوں کی شادیوں کے فرائض سے عہدہ برآ

ہو چکا تھا ایسے حالات میں بظاہر کوئی وجہ ایسی نظر نہ آتی تھی جس سے اندازہ ہو سکتا کہ وہ ذہنی یا جذباتی طور پر پریشان ہے یا اس کے دل و دماغ پر کوئی بوجھ یا دباؤ ہے دفتر میں بھی روٹین کا کام تھا اور وہ اپنے فرائض خوش اسلوبی سے سرانجام دیتا تھا۔ ہاں اسے اکثر بھول جانے کی بیماری تھی نہایت ارجنٹ قسم کی چٹھی ڈسپیچ کرانے کی بجائے دراز میں رکھ دیتا یا نہایت ضروری کیس پٹ اپ کرنا بھول جاتا۔

ایک روز سیکشن سے شور سنائی دیا میں نے نائب قاصد کو بلا کر معلوم کرنا چاہا مگر بار بار گھنٹی بجانے پر بھی وہ اندر نہ آیا تو میں نے اندازہ لگایا کہ اسی شور کی وجہ سے اسے آواز سنائی نہیں دی ہوگی یا یہ بھی ممکن ہے کہ وہ خود اس جھگڑے میں ملوث ہو۔ جب قدرے توقف کے بعد بھی گھنٹی بجانے پر اسٹاف کا کوئی آدمی یا نائب قاصد اندر نہ آیا تو میں اٹھ کر سیکشن کی طرف آیا۔ دروازہ نیم وا تھا اور اندر سے کسی عورت کے لڑنے بولنے کی آواز سنائی دے رہی تھی میرے سیکشن میں دو لڑکیاں ماتحت کلرک کے طور پر کام کرتی تھیں اور ان کی سہیلیاں یا دوسرے شعبوں کی لڑکیاں بھی ان کے پاس آتی جاتی تھیں۔ ضرور کسی لڑکے نے کوئی بدتمیزی کی ہوگی میں دروازہ کھول کر اصل حالات معلوم کرنا چاہتا تھا مگر مجھے یہ مناسب معلوم نہ ہوا کہ اسٹاف کے کسی جھگڑے میں اس طور شرکت اور دخل اندازی کروں آخر مقدمہ تو میرے ہی پاس آئے گا۔ پھر شیر اپنے کچھار میں شیر ہوتا ہے میں اس خیال سے واپس اپنی سیٹ پر آ گیا اور انتظار کرنے لگا کہ نائب قاصد یا ہیڈ کلرک مجھے آکر سب حالات بتائیں۔

بعد میں پتہ چلا کہ ہدایت اللہ کی بیوی دفتر آئی تھی دونوں میں گھریلو معاملات پر جھگڑا چل رہا تھا وہ کہیں جانا چاہتی تھی اور ہدایت اللہ اسے اجازت دیئے بغیر گھر سے نکل آیا تھا۔ دونوں دفتر میں بھی لڑتے جھگڑتے رہے۔ عملے کے لوگوں نے مجھے بتایا کہ ہدایت اللہ کا رویہ نسبتاً نرم اور مدافعانہ تھا مگر وہ بگڑتی چلی گئی اور چیختی چلاتی روتی دھوتی گھر کی چابیاں پھینک کر اور بچے کو ساتھ لے کر میکے چلی گئی۔ اسٹاف کے لوگوں نے صلح صفائی کی بہت کوشش کی مگر وہ ہوا کے گھوڑے پر سوار تھی۔ چونکہ ہدایت اللہ کا اس میں کوئی قصور نہ تھا اور نہ ہی اس نے اپنی بیوی کو دفتر میں آکر شور و غل کرنے اور جھگڑا کرنے کو کہا تھا اس لیے میں نے وضاحت طلب کرنا یا اسے وارننگ دینا مناسب خیال نہ کیا بلکہ ایسے خاموش ہو گیا جیسے مجھے کسی بات کا علم ہی نہ ہو اب سوچتا ہوں کہ کاش میں ایسا نہ کرتا اسے اپنا ماتحت سمجھنے اور دفتری ضابطوں کی پاسداری کرنے کے بجائے اسے اپنے جیسا ایک انسان سمجھتا تو شاید وہ حادثہ رونما نہ ہوتا جو وقت گزر جانے کے بعد میرے لیے بھی پشیمانی کا سبب بنا۔

ہوا یوں کہ ایک روز ہدایت اللہ کی عرضی آئی کہ وہ بیوی بچوں کو لینے لاہور جانا چاہتا ہے اس لیے مہربانی کر کے اسے تین دن کی رخصت اور اسٹیشن چھوڑنے کی اجازت دی جائے۔ میں دل میں یہ سوچ کر خوش ہوا کہ ضرور اس کی اپنی بیوی سے صلح ہو گئی ہوگی مگر چوتھے روز اس کے بجائے تار آیا کہ اس کی چھٹی ایک ہفتہ کے لیے بڑھا دی جائے کیوں کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ پہلے تو مجھے خیال آیا کہ ہدایت اللہ کی بیوی سے صلح ہو گئی ہے اس لیے اب اس نے سیر سپاٹے اور سسرال کی میزبانی کا لطف اٹھانے کے لیے بہانہ کیا ہے لیکن پھر ہدایت اللہ کا سابقہ رویہ ذہن میں آیا وہ جھوٹ نہیں بولا کرتا تھا نہ ہی بہانے بازی کا عادی تھا۔ کیا پتہ اس کی بیوی ابھی تک ناراض ہو وہ اسے منانا اور واپس لانا چاہتا ہو لیکن وہ مانتی نہ ہو۔ کیوں کہ جیسا مجھے بتایا گیا تھا اس کی بیوی ایسے لوگوں میں سے تھی جو چیخ چلا کر بات کرتے اور رو دھو کر جی ہلکا کر لیتے ہیں مگر ہدایت اللہ چپ چاپ سب کچھ برداشت کرنے کا عادی تھا ضرور کسی دن اس کا دل بیٹھ جائے گا یا دماغ کی کوئی شریان پھٹ جائے گی۔ بہرحال میں نے اس کی چھٹی منظور کر لی۔

جب چھٹی ختم ہونے پر بھی تین روز اوپر ہو گئے تو مجھے اس پر غصہ آنے لگا یہاں دفتر کا ڈھیروں کام پڑا تھا اور وہ سسرال کی میزبانی کے مزے لوٹ رہا تھا۔ اور عین اس وقت جب میں اسے جلد واپس آکر رپورٹ کرنے کی ڈکٹیشن دے رہا تھا ٹیلی فون کے ذریعے اطلاع ملی کہ ہدایت اللہ سب سے بڑے باس کے پاس پہنچ گیا ہے اور اب کوئی نوٹس اس تک نہیں پہنچ سکتا۔

ہدایت اللہ کے واجبات کے سلسلے میں کئی ماہ تک اس کا سالا دفتر کے چکر لگاتا رہا اگرچہ اس سے کچھ پوچھنا بیکار تھا مگر پھر بھی اس سے قدرے بے تکلفی ہوئی تو اس نے بتایا کہ میاں بیوی کے تعلقات شروع دن سے ناخوشگوار چلے آتے تھے اس نے بتایا کہ اس کی بہن نسبتاً زیادہ پڑھی لکھی اور بہتر ماحول میں پلی بڑھی تھی اس نے یہ بھی بتایا کہ وہ اپنے کسی کلاس فیلو سے شادی کرنا چاہتی تھی مگر قریبی رشتہ داری کی وجہ سے بزرگوں نے اس کی مرضی کے خلاف ہدایت اللہ سے اس کی شادی کر دی تھی۔

واجبات کا چیک تیار ہو گیا تو عدت ختم ہو جانے کے بعد ہدایت اللہ کی بیوی ایک دن دفتر آئی میں نے نائب قاصد سے کہا کہ وہ اسے میرے کمرے میں لا کر تعظیم سے بٹھائے اور کافی تیار کرے۔ میں نے اکاؤنٹس آفیسر کو بھی کاغذات سمیت اپنے کمرے میں بلا لیا۔ تاکہ تمام کارروائی میری نگرانی میں مکمل ہو سکے۔ وہ دروازہ کھول کر اندر آئی تو میں اپنی کرسی سے اچھل پڑا۔

"پروین تم ؟"

"جاوید تم" وہ بدک کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اور آج میری بیوی نے دوسری مرتبہ مجھ سے پوچھا ہے کہ میں اندر ہی اندر کیا سوچتا گنگناتا رہتا ہوں اور اس کی بات پر غور کر کے میں دہل سا گیا ہوں کہ کیا میں بھی ؟!

●●

آؤ محبّت کو ایک نیا موڑ دے دیں

م۔م۔راجندر
۶۸، چترا دہار، نئی دہلی ۹۲

صنم، ناہید کے پاس اپنی پڑھائی کے لیے کچھ نوٹس لینے آئی تھی مگر بارش ہوجانے کی وجہ سے اُس کے پاس ہی رُکی ہوئی تھی۔ یوں تو وہ ناہید سے چھتری لے کر بھی جاسکتی تھی کیونکہ اس کا گھر بالکل سامنے مشکل سے سو گز کے فاصلے پر تھا مگر دونوں کو باتوں میں اتنا مزہ آرہا تھا کہ انھیں کوئی ایسی بات سوجھی بھی نہیں۔ گرم گرم پنیر اور پیاز کے پکوڑوں اور چائے نے ایسے خوشگوار بھیگے بھیگے موسم میں باتوں میں اور بھی مزہ پیدا کر دیا تھا۔ تاہم صنم نے گھر فون کر دیا تھا کہ وہ بارش تھمتے ہی آجائے گی۔

صنم نے اپنی کلائی کی گھڑی میں دیکھا تو نو بجنے والے تھے۔ اُس نے آگے کو جھک کر کھڑکی کے شیشے سے چہرہ لگا کر باہر جھانکا مگر بجلی کے ایک دو کھمبوں سے ٹھٹھرتے ہوئے بلبوں کی مدھم سی روشنی کے سوا اور کچھ نظر نہیں آیا۔ پانی سے تر اور ٹپکتے درختوں اور پودوں اور چاروں طرف پھیلی ہوئی گھاس پر ایک پراسرار اندھیرے کی چادر پڑی ہوئی تھی، اور بارش کی بوندوں کی ٹپ ٹپ کی مترنم آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ صنم پیچھے ہٹ گئی اور ناہید سے بولی۔

"نو بج گئے، اب میں چلتی ہوں۔ مجھے اپنی کوئی چھتری دے دے۔"

"دیوانی ہوئی ہے کیا؟" ناہید بولی "اس اندھیرے میں اور ایسے موسم میں تو تنہا جائے گی۔ تو ذرا سی دیر اور رُک جا۔ بھائی جان کار سے آتے ہی ہوں گے۔ میں تجھے خود چھوڑ آؤں گی۔"

"نہیں ناہید، مجھے کون سا دور جانا ہے۔ وہ تو رہا گھر سامنے۔ تو بس اپنے برآمدے سے کھڑی دیکھتی رہیو۔ یا امّی کو فون کرکے اپنی کار منگوا لیتی ہوں مگر یار ہم لڑکیاں اتنی ڈرپوک کیوں ہیں؟ چل اٹھ چھتری دے۔ میں چلتی ہوں۔"

صنم ناہید کی چھوٹی، پھولدار گلابی رنگ کی چھتری لے کر اور نوٹس کو اچھی طرح محفوظ کرکے ناہید کے برآمدے سے مسکرا کر کودپڑی جیسے کوئی بھیگی سی ہری بھری ٹہنی کنارے سے کسی ندی کے پانی پر ہوا کے ایک ہلکے سے جھونکے سے جھول جاتی ہے۔ ناہید برآمدے میں کھڑی ہوئی دیکھتی رہی اور جب صنم آدھا راستہ طے کر گئی اور ناہید کی امّی نے اندر سے اسے آواز دے دی تو وہ چلی گئی۔ دونوں کوٹھیوں کے درمیان یہ راستہ پچھواڑے کی طرف کا کچا تھا جس پر آنا جانا عام طور پر پیدل چلنے والوں کا تھا۔ مگر یہ راستہ اتنا چوڑا تھا کہ ناہید کا بھائی ساجد تو اپنی کار اسی راستے سے لے جاتا اور لے آتا تھا۔ صنم کوئی بیس برس کی، بڑی حسین لڑکی تھی جس نے ابھی ابھی بی۔اے پاس کرکے ایم۔اے میں داخلہ لیا تھا۔ وہ کسی ایسی پہاڑی چڑیا کی طرح سبک جسم اور معصوم تھی جو صرف چہچہاتی ہوئی ڈال ڈال پات پات اڑتی رہتی ہے اور جس کے لیے یہ کائنات بڑی حسین اور بڑی رنگین ہوتی ہے۔ صنم ایک ہاتھ سے چھتری سنبھالے اور ایک ہاتھ سے شلوار کے پائنچے ذرا اوپر کیے اور دونوں طرف سے جھینگروں اور مینڈکوں کی آوازیں سنتی ہوئی بے خبر جارہی تھی کہ اچانک کار کی تیز روشنی سامنے سے اس پر پڑی اور وہ ایک طرف کو ہوگئی۔ یہ ساجد کی کار تھی جو اس کے بالکل قریب آکر رُک گئی۔ اس میں سے بھیگتا ہوا سا ساجد نکلا اور اپنے بالوں کو جھٹک کر مسکرا کر بولا۔

"صنم تم اور ایسے موسم میں یوں تنہا! بھئی خدا کے لیے یوں خطرہ مول نہ لیا کرو۔"

"کیسا خطرہ؟" صنم مسکرا کر بولی "ناہید سے نوٹس لینے گئی تھی۔ بارش کی وجہ سے آپ کے گھر رکنا پڑا۔ گھر تک پہنچ ہی گئی ہوں۔ اور آپ اس وقت کہاں سے آرہے ہیں؟"

"ہوسٹل سے ہی"

"پڑھائی کیسی چل رہی ہے؟" صنم نے پوچھا۔

"صنم یہ میڈیکل کی پڑھائی بڑی جان لیوا ہے۔ ابھی دو سال ہی ہوئے ہیں اور تین سال مزید جھک مارنی پڑے گی۔ بڑا طویل کورس ہے اور اس کے بعد کسی ہسپتال میں انٹرن شپ اور پھر ایم ڈی کرو۔ اور باہر جاؤ تو نصف زندگی یا نصف جوانی ضرور گزر جائے۔ سناؤ تم کیسی ہو؟"

"بالکل ٹھیک۔ اچھا تو میں چلوں؟" صنم بولی۔

"بھئی کھڑکی رہو دومنٹ۔ تم تو چھتری تلے ہو۔ بھیگ تو ہم رہے ہیں۔ اچھا بیٹھو میں چھوڑ دیتا ہوں۔"

"صرف چند گز تک؟"

"تو کیا ہو گیا" ساجد بولا "کچھ لمحوں کا تو اکٹھے سفر ہو جائے گا۔"

"لمحوں کا سفر" صنم نے مسکرا کر دیکھا "یہ بھی کوئی سفر ہے؟ اچھا میں چلتی ہوں۔ خدا حافظ۔"

"صرف ایک بات سنتی جاؤ" ساجد نے روکا "ذرا دل ہلکا ہو جائے گا۔ مگر بُرا نہ ماننا۔"

"نہیں مانوں گی۔ مگر ذرا جلدی کیجیے۔"

"صنم تم بہت حسین ہو" ساجد بولا

"یعنی کتنی؟" صنم شرارتاً بولی

"چلیے صاف بیانی سے کام لے لیتے ہیں۔ اتنی تو نہیں کہ کوئی تمھیں دیکھتے ہی دم توڑ دے لیکن کسی قوسِ قزح کی طرح پیاری اور دلنواز جسے دیکھتے رہنے پر بھی جی نہ بھرے۔ لو اب تم جا سکتی ہو اور جب تک تم گھر میں داخل نہ ہو جاؤ گی میں نہیں جاؤں گا۔ شب بخیر۔"

گھر میں داخل ہونے کے بعد صنم نے ساجد کی کار اسٹارٹ ہونے اور اس کے چلے جانے کی آواز سن لی تھی۔ اس نے اوپر اپنے کمرے میں جا کر نوٹس رکھے، کھڑکی میں سے ناہید کے اندھیرے میں ڈوبے بھیگے بھیگے مکان کی طرف جھانکا اور نیچے اتر آئی کیوں کہ میز پر شام کا کھانا لگ رہا تھا۔

اس رات صنم سوچنے لگی کہ کیا ساجد اس سے پیار کرتا تھا۔ ساجد کی ہر بات سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اسے چاہتا تھا یا اس میں ایک خاص دلچسپی لے رہا تھا۔ دلچسپی اور محبت میں کیا فرق ہوتا ہے یا کس منزل پر دلچسپی محبت میں بدل جاتی ہے۔ وہ نہیں جانتی تھی۔ وہ صرف یہ جانتی تھی کہ ساجد اس کی سہیلی ناہید کا بھائی تھا اور بے حد حسین تھا۔ اس کی دل نشین باتیں اور ان کے کہنے کا انداز اسے اور بھی حسین بنا دیتا تھا۔ صنم کی آنکھوں کے سامنے ساجد کا مسکراتا چہرہ بار بار ابھر رہا تھا۔ لمبا قد، چوڑے متوازی کندھے اور فراخ سینہ، بے حد جاذبِ نظر چہرہ اور آنکھوں میں پلتی اور ان سے جھانکتی ہوئی محبت اور خلوص کے چراغ روشن۔ لہراتے ہوئے گھنے سیاہ بال، بھلا کسی بھی نوجوان لڑکے میں کوئی اس سے زیادہ حسن کیا چاہے گا۔ پھر جب وہ ناہید کے گھر جاتی اور ساجد موجود ہوتا تو وہ ان کے پاس ہی آ کر بیٹھ جاتا تھا اور بار بار صنم کی طرف دیکھتا رہتا تھا۔ کئی مرتبہ وہ کالج کے راستے میں بھی صنم سے مل چکا تھا۔ وہ ہر مرتبہ صنم کو دیکھتے ہی اپنی کار روک لیتا تھا اور اس نے صنم سے ہر مرتبہ ایسے بات کی تھی جیسے وہ صنم کو مدتوں سے جانتا تھا۔ ایک دفعہ تو ناہید نے بھی صنم کو چھیڑا تھا اور اس سے کہا تھا "صنم تو اپنی کوئی چھوٹی سی فوٹو مجھے دے دے۔ بھائی جان مجھے بڑا تنگ کر رہے ہیں۔"

اس کے چند روز بعد کی بات ہے۔ صنم اپنے کالج کے بس اسٹاپ پر کھڑی تھی۔ آج اسے کالج میں کچھ رکنا پڑا تھا اور جس اسپیشل بس میں وہ دوسری لڑکیوں کے ساتھ جاتی تھی، وہ کب کی جا چکی تھی۔ وہ کسی اور بس کا انتظار کر رہی تھی کہ ساجد جانے کہاں سے آ گیا۔ اس نے کار روک لی اور اتر کر بولا۔

"آج تو ہم چاند ستارے بھی مانگ لیتے تو ہمیں مل جاتے۔ دیکھو نا مجھے تمھارا خیال آیا اور تم سراپا یوں کھڑی مل گئیں۔ چلو آؤ گھر ہی جا رہا ہوں۔"

صنم بیٹھ گئی۔ یہاں سے گھر تک صرف دس منٹ کی ڈرائیو تھی مگر ساجد نے اسے پندرہ منٹ کا سفر بنا دیا۔ وہ بولا۔

"بھئی کچھ تو بولو نا۔ کیا ہم اتنے بور ہیں کہ تم نے چپ سادھ لی ہے۔"

"کیا بولوں" صنم مسکرائی "کوئی بات کہنے کو ہے ہی نہیں۔ چلیے آپ کی خیریت پوچھ لیتی ہوں۔ بتایئے کیسے ہیں آپ؟"

"بس جی رہے ہیں" ساجد بولا "ویسے یہ بات کرنے کا انداز روایتی سہی بڑا عمدہ ہے اور بعض مرتبہ دو دلوں کو قریب لے آتا ہے۔ اچھا یہ بتاؤ کبھی میرے بارے میں بھی سوچتی ہو؟"

"نہیں، اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔"

ساجد راستے بھر صنم سے ایسی ہی ہلکی، بے معنی سی باتیں کرتا رہا۔ مگر ساجد کے اسے گھر کے باہر اتارنے کے بعد صنم اپنے کمرے میں جا کر لیٹی تو ساجد کے خیال میں گم ہو گئی۔ یہ اسے کیا ہوتا جا رہا تھا، وہ سوچنے لگی۔ کیا وہ بھی ساجد کو چاہنے لگی تھی؟ ساجد ہر وقت اس کے ذہن پر کیوں چھایا رہتا تھا۔ وہ اب رات کو دیر تک کیوں جاگتی رہتی تھی اور کئی مرتبہ ساجد کا خیال آتے ہی وہ تکیے پر سر رکھ کر بے اختیار رو کیوں پڑتی تھی؟

ایک روز جب صنم ناہید کے پاس اس کے گھر میں بیٹھی تھی اور ناہید چائے کے لیے اندر کچن میں چلی گئی تھی تو ساجد نے چپکے سے اندر آ کر اسے ایک خط پکڑا دیا اور چلا گیا۔ صنم نے وہ خط اپنے پرس میں رکھ لیا۔ اس نے گھر لوٹتے ہی اوپر اپنے کمرے کی تنہائی میں ساجد کا خط پڑھا۔

"اچھی صنم،

امڈتے، پھیلتے جذبات کے جس طوفان میں سے میں گزر رہا ہوں، وہ تم سے کیسے بیان کروں۔ جب تم ملتی ہو تو دل کی بات ہونٹوں پر آ کر جم جاتی ہے۔ سوچا اس خط کا سہارا لے لوں کیونکہ اگر تم میرے سامنے نہیں ہو گی تو شاید اپنی بات کہہ سکوں گا۔

صنم میں تمھیں دل و جان سے پیار کرتا ہوں۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ تم ہی وہ لڑکی ہو جسے خدا نے میرے لیے بنایا ہے۔ میں پل پل تمھارے تصور میں

کھویا رہتا ہوں، اور تمھیں دیکھے ہوئے ایک دن بھی گزر جاتا ہے تو میں بڑا بے چین ہو جاتا ہوں۔

جہاں تک میں محسوس کر پایا ہوں۔ شاید تمھارے دل میں بھی میرے لیے ایک شیریں انجانا ساجذبہ پل رہا ہے۔ میں نے کئی دفعہ تمھاری حیران سی آنکھوں میں وہ اداسی اور دھند بھی دیکھی ہے جسے صرف محبت کا پاکیزہ جذبہ ہی جنم دیتا ہے۔

میں اکثر اپنے ہوسٹل میں، سنسان بھیگی راتوں میں، اپنے جذبات سے مغلوب ہو کر اپنے بستر پر دھیرے دھیرے رو یا بھی ہوں۔ شاید محبت کی راہ میں اس طرح آنسو بہانا ہم دل جلوں کی قسمت میں لکھا ہو۔

کیا ہم زیادہ سے زیادہ نہیں مل سکتے؟

تمھارا ۔۔۔۔ ساجد

اس خط کو پڑھ کر صنم بڑی اداس ہو گئی۔ وہ بستر پر لیٹ گئی اور ایک مرتبہ اور اس نے یہ خط پڑھا۔ وہ ایک لمبی سوچ میں غوطہ لگا گئی۔ اس کے بعد اس نے اس خط کے پرزے پرزے کر کے اسے کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ جانے اسے کیا ہوا کہ وہ پلنگ پر اوندھے منہ لیٹ گئی اور دھیرے دھیرے آنسو بہانے لگی۔

اس کے کالج میں روز تین دن کی چھٹیاں تھیں۔ وہ ان تین دنوں میں گھر سے باہر نہیں نکلی۔ ناہید کے گھر بھی نہیں گئی۔ ہاں ناہید سے فون پر بات ہو جاتی تھی اور ناہید ایک دن اس کے گھر بھی آ گئی تھی۔ صنم نے یہ دن اپنے اور ساجد کے بارے میں سوچتے ہوئے گزار دیے۔ وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ وہ اور ساجد صرف جذبات کے تیز دھارے میں بے سوچے سمجھے بہے جا رہے تھے۔ وہ صرف بیس سال کی تھی اور ساجد بائیس کا ہوگا۔ ایسی سر اٹھاتی، البڑ نوجوانی میں جب دو حساس دلوں کو تنہائی میں ملنے کا موقعہ ملے گا تو محبت کے جذبات کی یلغار ہوگی۔ ابھی تو دو سال تک اس کی اپنی پڑھائی بھی مکمل نہیں ہوگی اور پھر اس کا ارادہ کچھ اور کرنے کا بھی تھا۔ ساجد کی ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کی پڑھائی میں ابھی تین سال اور لگیں گے اور پھر اسے ایم۔ ڈی بھی کرنی ہے۔ ناہید نے اسے یہ بھی بتایا کہ ان کے ابو تو ساجد کو ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کے بعد امریکہ بھیجنے کی بھی سوچ رہے تھے۔

ان حالات میں صنم نے بڑی سنجیدگی سے سوچا، یہ محبت بیچ میں کہاں سے حائل ہو گئی؟ پانچ چھ برس تک تو ساجد، اور وہ شاید خود بھی، اس قابل نہیں ہوں گے کہ ذمے داری سے اس جذبات کے بندھن میں داخل ہوں جو ہمیشہ کے لیے دو دلوں کو ایک کر دیتا ہے۔ جب وقت کا اتنا بڑا فاصلہ ہمارے درمیان ہے تو محبت کی یہ چھوٹی سی کاغذی کشتی تلخ حقیقتوں کے امڈتے ہوئے نالے میں کسی بھی لمحے، کسی بھی منزل پر، پھٹ کر ڈوب سکتی ہے۔

جب دو تین دن اسی طرح سوچتے گزر گئے اور ساجد سے کوئی ملاقات نہیں ہوئی تو اس نے اپنا لیٹر پیڈ لیا اور ساجد کو یہ خط لکھ دیا۔

”ساجد بھائی

آپ کا دیا ہوا خط میں نے دو بار پڑھا۔ آپ نے مجھے اپنی محبت کے قابل سمجھا، اس کے لیے آپ کا بہت بہت شکریہ۔ مجھے بھی یہ اعتراف کرنے میں کوئی جھجک نہیں کہ میں نے بھی آپ کو دل و جان سے چاہا ہے اگرچہ یہ دوسری بات ہے کہ حیا نے مجھے کبھی اپنے جذبات کے اظہار کی اجازت نہیں دی۔ لیکن راتوں کی تنہائی میں میں بھی آپ کے بارے میں سوچ سوچ کر آنسو بہاتی رہی ہوں۔

شاید ہم غلط وقت پر، یا وقت سے پہلے ایک جذباتی بہاؤ میں بہہ گئے ہیں اور میں ان دنوں بڑی سنجیدگی سے اس بارے میں سوچتی رہی ہوں۔ اس منزل پر جذبات سے مغلوب ہو کر ہم کس سمت اور کہاں جائیں گے؟ اس محبت کا انجام کیا ہوگا؟ ابھی کئی سال تک تو میری اور آپ کی پڑھائی ہی ختم نہیں ہوگی۔ پھر شاید آپ کے ابو، جیسا کہ ناہید نے مجھے بتایا، آپ کو امریکہ بھی بھیج دیں گے۔ اتنے لمبے عرصے میں محبت کے کچے جذبات کی ہماری کاغذی ناؤ جانے کب اور کہاں اٹک کر ڈوب جائے گی۔

جہاں تک میرا تعلق ہے میں آپ کو دل سے چاہتی ہوں اور زندگی میں آپ سے بہتر ہم سفر کا میں تصور بھی نہیں کر سکتی۔ اگر آنے والے ان تمام سالوں تک آپ کے دل میں میرے لیے ان جذبات کا کچھ بھی بچا تو میں آپ کی ہمیشہ کے لیے بننے میں اپنی خوش قسمتی سمجھوں گی۔ میں عورت ہوں اور عورت کی انتظار کی آنکھیں تو کبھی نہیں تھکتیں۔ ہاں اب اس فاصلے پر مجھے بھول بھی جائیں گے تو وہ کوئی عجیب یا غیر قدرتی بات نہیں ہوگی اور مجھے کوئی گلہ نہیں ہوگا۔ دراصل وہی منزل ہمارے کسی بھی فیصلے کے لیے صحیح منزل ہوگی۔

آئیے ہم اپنی محبت کو ایک نیا موڑ دے دیں۔ ایک صحت مند موڑ۔ آج کے بعد ہم ایک دوسرے سے ملنے کی کوئی شعوری کوشش نہیں کریں گے۔ مگر جب بھی ملنا ہو گیا تو صرف دوست کے طور پر ملیں گے۔ اس کے لیے ہمیں جذباتی سطح پر محبت کے ان غیر وقتی جذبات کو جھٹک دینا ہوگا۔ اس طرح ہم اپنی پڑھائی پوری کر سکیں گے، اطمینان اور سکون کے ساتھ۔

میرا تو یہ قطعی اور آخری فیصلہ ہے اور مجھے امید ہے کہ اگر آپ کو مجھ سے سچا پیار ہے تو آپ بھی اس فیصلے پر عمل کر کے میرا ساتھ دیں گے۔ خدا را اس خط کو پڑھ کر رونے نہ لگ جائیے۔ ویسے رونے سے دل بڑا ہلکا ہو جاتا ہے۔ آپ میرا خط چاہیں تو کئی بار پڑھ سکتے ہیں مگر اسے پھاڑ ضرور دیجیے۔ میں نے بھی آپ کا خط تلف کر دیا ہے۔ اس طرح یہ کچی یادیں بھی دفن ہو جائیں گی۔

آپ کی ۔۔۔۔ صنم

خط لکھ کر صنم نے اسے ایک بار اور پڑھا۔ اس نے اسے لفافے میں بند کیا، اس پر ٹکٹ لگایا اور ساجد کا ہوسٹل کا پتہ لکھ کر اسی وقت نیچے جا کر خط لیٹر بکس میں ڈال آئی۔ وہ لوٹی تو بڑی مضمحل اور اداس تھی۔ اس کا جی چاہا کہ اپنے آپ کو پلنگ پر گرا کر زار و قطار رونے لگے مگر اس نے اپنی تمام ہمت اکٹھی کی آنسوؤں کو آنکھوں میں ہی پی لیا اور اپنی میز پر بیٹھ کر اپنی کتابوں کو سمیٹ کر ٹھیک سے لگانے لگی! ●●

ناسٹلجیا

فردوس حیدر

۱۰ اسی ڈیفنس کمرشل ایریا۔ اے کورنگی روڈ۔ پوسٹ کوڈ ۵۵۰۰، کراچی۔ ۴۶ (پاکستان)

میں کٹہرے میں کھڑی کر دی گئی ہوں۔

فردِ جرم عائد کرنے کے لیے یہاں لانا ضروری نہیں اور سزا پانے کے مجرم ہونا شرط نہیں پھر بھی میں ہر مرتبہ یہاں لائی جاتی ہوں۔ میں نے چاہا کہ عام لوگوں کی روش اپنالوں۔

یا پھر اعتبار کرنا چھوڑ دوں لیکن ممکن نہ ہوا۔ میں اپنی غلطی کا اعادہ کرتی ہوں اور بار بار اذیت کی بھٹی میں جھونک دی جاتی ہوں۔

"تم خود سانپ کی زد میں کیوں آتی ہو؟" مجھ سے پوچھا جاتا ہے۔

"نہیں تو..... میں انسان سے محبت کرتی ہوں" میں ہمیشہ کی طرح اپنی غلطی کا اعتراف نہیں کرسکتی۔

"انسان کو سانپ بننے دیر نہیں لگتی" کسی نے سمجھانے کی کوشش کی "تم اسی لمحے کی شناخت نہیں کرسکتی"۔

"شناخت۔ شناخت۔ شناخت" میرے وجود کے اندر میرے باپ کے الفاظ گونجتے ہیں۔ "بیٹی انسان کی شناخت۔ اس کے الفاظ ہیں۔ قول و فعل میں تضاد نہیں ہونا چاہیے"۔

"غور سے دیکھو کیا اس کی آنکھیں جھپکتی ہیں؟" سامنے والے نے پھر پوچھا۔

میں نے غور سے دیکھا اور نفی میں سر ہلا دیا۔

"وہ کینچلی اتار کے تمہارے پاس آیا تھا۔ تم نے غور کیا ہوتا!"

"محبت کرنے والوں کو غور سے دیکھا نہیں جاتا۔ انہیں غور سے سُنا جاتا ہے۔ میرا باپ مجھے جو کچھ کہتا تھا میں غور سے سُنا کرتی تھی۔ لفظوں کا سمندر میرے اندر اترتا رہا۔ میرا باپ میرے اندر ہے۔ میرے وجود کا حصہ....."

"اسے بھول جاؤ۔ ماضی کو فراموش کرنا ہوگا"۔ وردی پوش کی آواز آئی۔

"نہیں یہ ممکن نہیں" میں روتی ہوں۔

"تو پھر سزا کے لیے تیار ہو جاؤ"

"جو چھن جائے یا بچھڑ جائے اسے یاد رکھنا گناہ ہے کیا؟"

"ہاں گناہِ کبیرہ۔ تاریخ کے اوراق پھاڑ دیے گئے ہیں"۔

"مجھ سے الفاظ مت چھینو۔ مجھ سے محبت کرنے والوں کے الفاظ..... میری تاریخ کے اوراق....." میرا سر چکرانے لگتا ہے۔

"اسے لے جاؤ۔ ایسی سزا دو کہ جی سکے نہ مر سکے" فیصلہ سنا دیا گیا۔

"بھاگ جاؤ" ایک آواز سنائی دی۔ یہ آواز میرے باپ کی ہے۔ میں اسے پہچانتی ہوں لیکن میرا باپ کہاں ہے وہ مر کر بھی کیوں زندہ ہے۔ میں اس کی آواز کیوں سُن لیتی ہوں میں بھاگنا چاہتی ہوں۔ لیکن ہر موڑ پہ وہ کھڑا ہے۔ وردی پوش۔ دانت نکوسے۔ وہ میری جانب بڑھ رہا ہے۔ مجھے سزا دینے کے لیے کسی ایسی جگہ لے جانا چاہتا ہے جہاں میں جی سکوں نہ مر سکوں۔

"بھاگ جاؤ" اب کے یہ آواز مجھے میں سے آتی ہے۔ شاید کسی کو مجھ سے ہمدردی ہو گئی ہے۔ یا شاید وہ میرے باپ کے ساتھیوں میں سے ہے۔ میں اس شفیق چہرے کو نہیں دیکھ پاتی ممکن ہے دشمنوں کے خوف سے وہ سامنے نہیں آنا چاہتا۔ یا شاید یہ میرا وہم ہے۔ وہ آواز میرے باپ کی تھی اور میرے اپنے وجود کے اندر سے پیدا ہوئی تھی۔

"میں اپنے وجود سے اپنے باپ کی آواز کیسے نکال پھینکوں۔ میں خالی ہو جاؤں گی" میں لوگوں کو بتانا چاہتی ہوں "لوگو..... لوگو..... مجھے کھنڈر میں تبدیل ہونے سے بچالو" میں سامنے دیکھتی ہوں۔ وہاں کوئی نہیں۔ سب جا چکے ہیں۔ اور وہ جو راستہ روکے کھڑا ہے۔ آنکھ جھپکے بغیر میری جانب دیکھ رہا ہے اس کے کان نہیں۔ مجھ پہ منکشف ہوا یہ وہی ہے جو ہر بار مجھے کٹہرے پہ لا کھڑا کرتا ہے اور میرے باپ کے الفاظ کے معنی

بدل دیتا ہے۔

"کیا سب وردی پوشش ایک جیسے ہوتے ہیں؟" میں سوچتی ہوں۔ "تو پھر ناموس پہ کٹ مرنے والے کون تھے؟"۔ کیا میں ماضی کی قید میں ہوں؟ عام لوگوں کی روشش اختیار کرنے کے لیے مجھے اس قید سے رہائی پانی ہوگی؟۔ میری آنکھیں بند ہونے لگتی ہیں۔ میں گرنے لگتی ہوں۔ مجھے کوئی سہارا نہیں دیتا۔ میں گر جاتی ہوں۔

مجھے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹا جا رہا ہے۔

یہ کون ہے جو مجھے گھسیٹ رہا ہے۔ اس قدر بے رحم..... میں آنکھیں کھولتی ہوں۔ یہ تو میرا بیٹا ہے۔ اس نے میری کوکھ سے جنم لیا۔ نو ماہ کے دن رات میرے اندر دھڑکنے لگے۔ تخلیق کی لذت میں گزرا ہوا ایک ایک پل میری رگوں میں اترنے لگا۔ لیکن یہ کیا ہوا۔ میری زمین پہ خاردار جھاڑیاں اور ببول کہاں سے آئے۔ زمین پیاسی ہے۔ ترخ رہی ہے میں چاروں جانب نگاہ دوڑاتی ہوں۔

"مجھے کیوں گھسیٹا جا رہا ہے؟" میں پوچھتی ہوں۔

"اپنے باپ کو بھول جاؤ" وردی پوشش آواز میں بارود کی بو تھی۔

"لفظوں کی حرمت سے روشناس کرانے والے کو بھول جاؤں؟"

"لفظوں کا کھیل۔ رشتوں کا تقدس۔ کب تک اپنے آدرش کا گریہ کرتی رہو گی؟"

"جب تک میرے اجداد کا اعتبار قائم ہے؟"

"تم اور تمہارے اجداد؟..... تاریخ کے اوراق پھاڑ دیے گئے۔ اعتبار ختم ہوا" وہ میرے بالوں کو زور سے جھٹکا دیتا ہے۔ لوگ ہنستے ہیں۔ جیسے کسی لطیفے پہ ہنسا جاتا ہے۔

"میں تم سب کو تقدس کے نئے معنی سکھاؤں گا" مجھے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹنے والے نے دونوں ہاتھ ہوا میں بلند کیے اور لوگوں کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ پھر اپنے ساتھی کے ہاتھ سے ایک کتاب پکڑ کے سب کو دکھائی "یہ کتاب باہر سے منگوائی ہے نئی طرز تعلیم کے لیے" لوگوں میں کتاب تقسیم ہونے لگی۔

"اس کتاب کا ہمارے اجداد سے کوئی تعلق نہیں" میں چیختی ہوں۔

"کس چکر میں پڑی ہو۔ بھاگ جاؤ۔ جان بچاؤ" کوئی مجھے سمجھاتا ہے۔ یہ آواز کس کی ہے میں سوچتی ہوں۔ شاید کسی کی نہیں۔ شاید میرے باپ کی۔ لیکن وہ تو مر چکا ہے۔ وہ مر کے بھی میرے اندر زندہ ہے۔ اس کے الفاظ میرے وجود میں روشن ہیں۔ میں اس روشنی کو بچانا چاہتی ہوں۔ یہ روشنی آنے والی نسل میں منتقل کرنا چاہتی ہوں۔ لیکن کیسے؟..... تخلیق کا کرب قطرہ قطرہ میری آنکھوں سے بہنے لگتا ہے۔ پیاسی زمین تڑخنے لگتی ہے۔ اصر میری آنکھیں بند ہو جاتی ہیں۔

"اگر تمہیں اختیار دیا جائے تو؟" کوئی مجھے زور سے ہلاتا ہے۔

میں جیسے نیند سے چونکتی ہوں۔ آنکھیں کھولنا چاہتی ہوں۔ لیکن یوں لگتا ہے۔ جیسے کسی نے پپوٹے سی دیے ہوں۔

"کیا میں قوت بینائی سے محروم کر دی گئی ہوں؟" میں رونے لگتی ہوں۔

"تیرے اندر تیرا باپ زندہ ہے وہ تمہیں کسی بھی قوت سے محروم نہیں ہونے دے گا" کسی نے مجھے دلاسا دیا۔

"تاریخ بدل دی گئی ہے۔ اجداد کے الفاظ پہ فخر کرنا جرم ہے" میرے لہجے میں مایوسی ہے۔

"چھوڑو ان باتوں کو" دلاسا دینے والے نے سہارا دیا "اگر تمہیں وردی پوشوں کو قتل کرنے کا اختیار دیا جائے تو؟"

"میں ایسا نہیں کروں گی۔ میں ایسا نہیں کر سکتی۔ میں انسان سے محبت کرتی ہوں۔ میں صرف محبت کر سکتی ہوں" ـــ میں رونے لگتی ہوں۔

"تخلیق کی لذت اور کرب میں کوئی فرق نہیں" ـــــ میں تخلیقی لمحوں کو نہیں روک سکتی۔ ان ہی لمحوں میں میری بقا ہے۔ دلاسا دینے والا حیران ہے۔

"وہ جو تمہیں ہر بار کٹہرے میں لا کھڑا کرتا ہے اور وہ جو تمہیں بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتا ہے ان کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

میں جواب نہیں دیتی۔ اپنے اندر سے اپنے باپ کو نوچ پھینکنے کی ترکیب پہ غور کرتی ہوں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا اور میرے قدم خود بخود کٹہرے کی طرف بڑھنے لگتے ہیں۔ ●●

دیدہ ور

سراج انور

ایشیا فوٹو اسٹوڈیو، اُردو بازار جامع مسجد دہلی ۱۱۰۰۰۶

ورق کوٹنے والا کام دیکھنے میں تو مشکل نظر آتا ہے، لیکن جو بھی انسان اِس کام کو اختیار کرتا ہے، اس کا ایک ہاتھ ہتھوڑا مارنے اور دوسرا ہاتھ چمڑے کی تھیلی کو گھما کر ادھر اُدھر کرنے میں مصروف رہتا ہے۔ اِس کے باوجود اس کا طائرِ خیال متواتر پرواز کرتا رہتا ہے اور تصوّر میں وہ پوری دنیا کی سیر کرنے کی آزادی رکھتا ہے۔ نعمت اللہ کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ تھا۔ چھڑے دم تھے، جورو نہ جاتا اللہ میاں سے ناتا والی بات تھی۔ نو مربع فٹ کی ایک چھوٹی سی کوٹھری بیک وقت ان کا دولت کدہ تھی اور دوکان بھی صبح سے شام تک ورق کوٹتے رہنے کے باعث، موسیقی کے عجیب سے سر ہتھوڑی کی دھمک سے ہم آہنگ ہوکر فضا میں بکھر جاتے۔ جو بھی ان سے ملاقات کی خاطر گلی میں داخل ہوتا، سو میٹر دور ہی سے ہتھوڑے کی اِس دھمک سے اندازہ لگا لیتا کہ وہ دوکان میں موجود ہیں یا نہیں۔ ہتھوڑے کی تان ایک طرح سے اطلاعی گھنٹی کا کام کرتی تھی۔

نعمت اللہ تعلیم کے نام پر صفر تھے۔ یعنی بالکل انگوٹھا ٹیک ایسے لوگوں کو بہت سے شوق چمٹ جاتے ہیں۔ لیکن انھیں زیادہ نہیں صرف دو شوق تھے۔ پان کھانا اور کبھی کبھار سینما دیکھنا۔ فلموں کی ہیروئن چھپن چھری اور ہیرو بے تاب اچھن انھیں بہت اچھے لگتے تھے۔ جب بھی اِن دونوں کی کوئی فلم ٹکڑ والے سینما پر لگتی، وہ بیتاب ہو جاتے اور ایسا نادر موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتے۔

ان کا صرف ایک ہی دوست تھا جس نے شاید چار جماعتیں پاس کر رکھی تھیں اور اپنے کو تعلیم یافتہ کہتا تھا۔ نام تھا سکھدیو اکام تھا رکشا چلانے والوں کے ہاتھ میں لال جھنڈا تھما کر انھیں در در بھٹکانا۔ رکشا چلانے والوں میں چونکہ وہ پڑھا لکھا سمجھا جاتا تھا۔ اِس لیے اندھوں میں کانا راجہ تھا۔ وہ رکشے والوں کو بتایا کرتا کہ خوش قسمتی سے ان لوگوں کا شمار مزدوروں میں ہوتا ہے۔ چنانچہ انھیں مزدور یونین میں شامل ہو جانا چاہیے۔ بہت سے ہوگئے تھے اور بہت سے ہونا چاہتے تھے۔ مزدور جب کمیونزم کا پرچار کرتے ہیں تو وہ زیادہ اثر انگیز ہوتا ہے۔ چنانچہ کامریڈ سکھدیو نے اپنے دوست نعمت کو جسے وہ نیامت کہتے تھے اپنے حلقے میں لینا چاہا۔ لیکن نیامت برسوں سے آنکھوں پر پٹی بندھے ہوئے بیل کی مانند ایک ہی حلقے میں گھوم رہا تھا۔ اس بار پان کا بیڑہ منہ میں رکھنے کے بعد اس نے سڑک پر پچکاری ماری اور بیڑی کا ایک زوردار کش لگا کر نیامت سے بولا۔

"ہتھوڑا تو تمہارے ہاتھ میں ہے ہی، بس ایک درانتی اور لے لو۔"

"کیوں۔۔؟" نیامت کے ہتھوڑے کی ضرب جاری رہی۔

"پکّے کامریڈ بن جاؤ گے۔" سکھدیو نے ایک آنکھ بھینچ کر جواب دیا۔

"اِس سے کیا ہوگا۔؟"

"مزدوروں کی صف میں شامل ہو جاؤ گے۔"

"وہ تو میں ہوں ہی۔" نیامت نے اس کی عقل پر ماتم کرتے ہوئے کہا "خود ہی مزدور ہوں اور خود ہی مالک۔"

"لیکن مزدور یونین میں آنے کے بعد تمہیں تمہارے حقوق ملیں گے۔ تمہاری حق تلفی نہیں ہوگی۔"

"تو اب کون سی ہوتی ہے۔ جب میں ہی سب کچھ ہوں تو مزدور اور مالک میں کوئی جھگڑا ہوتا ہی نہیں۔" نیامت ہنسا۔

"وہ تو ٹھیک ہے یار، مگر تمہاری مالی حالت زیادہ اچھی نہیں ہے" سکھدیو نے کوٹھری کے بام و در پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"ہو گی بھی نہیں۔ جو کماتا ہوں وہ میرے لیے کافی ہے۔" نیامت نے ورقوں پر حملہ جاری رکھتے ہوئے جواب دیا۔ "مجھے تو صرف دو ہی شوق ہیں۔ فلم دیکھنا اور پان کھانا۔ روٹی ملے نہ ملے، پان ضرور ملے۔۔۔ البتہ۔۔۔"

"البتہ کیا۔۔؟"

"اگر تم مجھے ویسا مزدور بنا دو جیسے کہ فیض احمد فیض اور علی سردار سامری ہیں تو میں تمہارے ساتھ آنے کو تیار ہوں۔"

"تمہیں ان کے نام کیسے معلوم ہیں؟" سکھدیوا نے حیرت کا اظہار کیا۔ "یہ تو مزدور شاعر ہیں۔"

"جانتا ہوں۔ رہی یہ بات کہ مجھے ان کے نام کیسے معلوم ہیں تو یہ معمولی سی بات ہے۔" پہلی بار نیامت نے ہتھوڑے کی حرکت روک کر جواب دیا۔ "میں فلمیں دیکھتا ہوں، ریڈیو پر فلموں کے گانے سنتا ہوں، اسی لیے شاعری سے واقفیت ہوگئی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ ان شاعروں کے گانے فلموں اور ریڈیو پر آتے ہیں۔ بار بار نام سن چکا ہوں۔ یہی نہیں بلکہ افسر بے ایمان اور مال بنارا فسر کے گانے اور فلموں کے ڈائلاگ بھی سنتا ہوں۔"

"تمہارا مطلب کیا ہے؟" سکھدیوا نے دیدے پھرائے۔

"دیکھو بھائی۔ فیض احمد فیض مزدوروں کے شاعر ہیں، لیکن مزدور تو فٹ پاتھ پر اپنی جھلنگی میں سو رہا ہے اور وہ عالی شان بنگلے میں راتیں بسر کر رہے ہیں۔ جام پر جام لنڈھا رہے ہیں۔ موٹروں اور ہوائی جہازوں میں سفر کر رہے ہیں۔ کبھی لندن، کبھی روس، کبھی جرمنی کبھی کہیں اور — ان آسائشوں کے باوجود بھی وہ مزدوروں کے شاعر ہیں — ہے نا کمال کی بات؟"

"ہاں وہ تو ہے۔" سکھدیوا نے گردن ہلائی۔ "مگر وہ ہمارے لیڈر..."

"مجھے بالکل ہی گاؤدی مت سمجھو سکھدیوا۔" نیامت نے رکا ہوا جملہ پھر جاری کر دیا۔ "جو لوگ موٹروں اور ہوائی جہازوں میں اڑا کرتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ مزدوروں کے شاعر ہیں۔ میں انھیں تمہاری مزدور یونین کا نمائندہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں۔"

"کیوں کیوں — بھئی وہ لیڈر ہیں اس لیے ہوائی جہازوں میں اڑتے ہیں۔" سکھدیوا نے اسے قائل کرنا چاہا۔

"اگر ایسی بات ہے تو برابری اور مساوات کہاں گئی۔" نیامت نے ہتھوڑا پھر روک لیا۔ "اگر وہ مزدور لیڈر ہیں تو ہونا تو یہ چاہیے کہ سردی میں کسی ٹھٹھرتے ہوئے مزدور کو دیکھیں تو فوراً اپنا کوٹ اتار کر اسے پہنا دیں۔ جو شراب جسم گرم کرنے کے لیے خود پیتے ہیں، اسے بھی پلائیں اور عمدہ کھانا کھلائیں۔ یہ کہاں کی مساوات ہے کہ خود تو محلوں میں رہیں اور مزدور کو جھونپڑی بھی میسر نہ ہو۔ خود تو مکھن توس اڑائیں اور مزدور سوکھی روٹی کے ایک ایک ٹکڑے کو ترستے!"

"تمہاری یہ باتیں تو میری سمجھ میں نہیں آئیں۔" سکھدیوا نیامت جیسے جاہل سے مرعوب ہونے لگا۔ "میرے نزدیک تو کمیونزم کا مطلب یہی ہے کہ سب برابر ہوں اور کسی بھی فرم کے مالکان مزدور کے ساتھ بے انصافی نہ کریں۔"

"خواہ تمہارے لیڈر مزدوروں سے بے انصافی کرتے رہیں اور عمدہ کھانے کھاتے رہیں دوسرے ممالک کی تفریح کرتے رہیں اور عمدہ لباس پہنتے رہیں۔"

"ہاں ہوتا تو ایسا ہی ہے۔" سکھدیوا نے گردن جھکالی۔

"دیکھو سکھدیوا، میں تمہیں بتاتا ہوں کہ برابری اور مساوات کیسے کہتے ہیں۔" نیامت نے ہتھوڑا زمین پر رکھ دیا۔ "مساوات اور برابری اسے کہتے ہیں کہ پیغمبر اسلام کے غلام زید بن حارث کو وہی کھانا ملتا تھا جو وہ خود کھاتے تھے وہی لباس پہننے کو ملتا تھا جو وہ پہنتے تھے۔ حد تو یہ ہے کہ جب زید کے رشتہ دار انھیں لینے کے لیے آئے تو انھوں نے غلامی کو آزادی پر ترجیح دی۔ صاف کہہ دیا کہ اتنے اچھے آقا کو چھوڑ کر وہ کہیں نہیں جائیں گے۔ انھیں اپنے آقا کی غلامی آزادی سے زیادہ پیاری ہے۔ وجہ کیا تھی؟ وہی مساوات اور برابری خلیفہ عمر جب یہودیوں کے قلعے کی جانب چلے تھے تو تھوڑا فاصلہ غلام اونٹ پر بیٹھ کر طے کرتا تھا اور عمر اونٹ کی مہار پکڑ کر پیدل چلتے تھے اور اپنی باری آنے پر اونٹ پر سوار ہوتے تو غلام مہار پکڑ کر چلتا — میرے خیال میں برابری کا اس سے بڑا ثبوت، کوئی مذہب اور کوئی قوم نہیں دے سکتی۔ یا اگر تمہارے کمیونزم میں ہو تو بتاؤ۔"

"یار تو ان پڑھ ہو کر بھی ایسی باتیں کہہ سکتا ہے۔ تعجب ہے۔" سکھدیوا کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئی تھیں۔

"تعلیم کے معاملے میں میری آنکھیں بند رہیں تو کیا ہوا، کان تو کھلے رہے۔" نیامت ہنسا۔ "جو ان کانوں نے سنا، زبان نے اگل دیا۔ پھر آج کل جمہوریت اور وہ کیا کہتے ہیں ڈیمو.. ڈیمو۔"

"ڈیموکریسی — یعنی جمہوریت۔" سکھدیوا نے جلدی سے لقمہ دیا۔

"ہاں، اس کا ڈھونگ بہت رچایا جاتا ہے — مگر میں بتاؤں کہ جمہوریت کسے کہتے ہیں؟"

"کسے کہتے ہیں؟" "بتاؤ بتاؤ۔"

نیامت نے پھر سے ہتھوڑا اٹھا کر چمڑے کی تھیلی پر بجانا شروع کر دیا اور ساتھ ہی اپنی بات جاری رکھی۔

"آج کی طرح نہیں کہ ہمارے شہنشاہ کمرے میں بیٹھے ہوئے ہیں اور گھر پر پہرہ بٹھا رکھا ہے کہ کوئی آکر سوال نہ کرے۔ کسی کو ان کے گھر تک جانے کی اجازت ہی نہیں ہے۔ جب کہ دوسری طرف مسلمانوں کے خلیفہ عمر سے ملنے رومیوں کا ایک وفد آتا ہے۔ آپ ایک چبوترے پر سر کے نیچے پتھر کا تکیہ لگائے اکیلے لیٹے تھے۔ رومیوں کے سردار نے تعجب سے پوچھا کہ آپ اتنی بڑی سلطنت کے مالک ہیں۔ آپ کو خطرہ نہیں کہ کوئی آپ کو مار ڈالے گا! آپ نے اپنی حفاظت کے لیے کچھ لوگ مقرر کیوں نہیں کیے۔ جواب ملتا ہے کہ میں خدا کی طرف

سے لوگوں کی حفاظت کے لیے مقرر کیا گیا ہوں، اس لیے نہیں کہ وہ میری حفاظت کریں! رہنے دو سکھدیو بھائی۔ ہاتھی کے دانت کھانے کے اور ہوتے ہیں اور دکھانے کے اور۔۔۔ میں نے دیکھ لی تمہاری مساوات اور برابری۔ کہیں دوسرے ملک پر امن قائم کرنا ہوا تو فوج لے کر اسی پر چڑھ دوڑے۔۔۔ نہیں بھائی، بخشو، چوہا لنڈورا ہی بھلا۔"

سکھدیو پر یہ راز پہلی بار کھلا کہ نیامت پکا کمیونسٹ ہے لیکن اس کا انداز دوسرا ہے۔ اس کے قول و عمل میں تضاد نہیں ہے، بلکہ جیسا سوچتا ہے ویسا ہی کرتا ہے۔ دنیا میں ایسے کتنے لوگ ہوں گے جو اپنی ضروریات کے مقابلے میں اپنے اصولوں کو بالائے طاق رکھ دیتے ہوں گے۔ مگر یہ نیامت تو ایسا نہیں ہے۔ یہ چاہے تو اسمگ اور کوکین کا دھندا کر کے لاکھوں بنا سکتا ہے۔ لیکن یہ تو اپنی کھال ہی میں مست ہے اور کسی سے کچھ نہیں چاہتا۔ چائے کے ایک کپ میں بھی برابری دکھاتا ہے۔ آدھا کپ مجھے دے دیا اور آدھا برج میں خود پی لیا۔ اس نے سوچا کہ آئندہ اسے نہیں چھیڑے گا۔ اس کی پارٹی ان گنت زبانوں میں اپنے پروپیگنڈے کا لٹریچر تقسیم کرتی ہے۔ لیکن تحریر اس معاملے میں کیا کرے گی جب تک اس پر کوئی عمل پیرا نہ ہو۔۔۔ نیامت وہ لٹریچر پڑھے بغیر بھی عمل کی دنیا میں آگے تھا۔ شاید سب سے آگے!

نیامت میں ایک خوبی یہ تھی کہ اس کی صورت سے معصومیت ہی نہیں یتیمی بھی برستی تھی۔ دنیا میں کچھ بھی ہو جائے وہ اس سے لاعلم رہتا تھا۔ محلّے میں خواہ کتنا بڑا ہنگامہ ہی کیوں نہ ہو جائے، وہ خاموشی سے چمڑے کی تھیلی کو کوٹتا رہتا۔ بعض دفعہ تو اس کا دل چاہتا کہ جھگڑا کھڑا کرنے اور مذہب کا سوال پیدا کرنے والوں کو بھی اس تھیلی میں بند کر کے انھیں کوٹنا شروع کر دے۔ ایسے وقت لمبی لمبی ٹھنڈی سانسیں ان کی ہتھوڑی کی کٹ کٹ سے ہم آہنگ ہو کر ہواؤں میں بکھر جاتیں۔ مذہب سے بیزار رہنے والے ہی مذہب کا سوال اٹھایا کرتے تھے اور ایسے لوگوں سے نیامت کو للّٰہی بغض تھا۔ جب طبیعت اکتا جاتی تو وہ تہمد اتار کر کرتا پاجامہ پہنتا اور کوٹھری کو تالا لگا کر بغیر کسی ارادے کے طویل گلی کو طے کرتا ہوا باہر نکڑ پر آ جاتا۔۔۔ تھوڑے ہی فاصلے پر بالم سنیما تھا۔ اور سنیما سے تھوڑی ہی دور سائیکل اسٹینڈ کے قریب چندو پان والا اپنا خوانچہ لگائے ہوئے بیٹھا دکھائی دیتا تھا۔ نیامت پچاس پیسے نکال کر چندو کو دیتا اور بنارسی پان کا ایک جوڑا کلّے میں دبا کر جگالی کرتا ہوا بالم سنیما پہنچ جاتا اور یوں ہی بے ارادہ ان تصویروں کو دیکھنے لگتا جو شیشے کے شوکیسوں میں لگی ہوتی تھیں۔

جب ایک دن بہت زیادہ ورق کوٹے تو بازوؤں کی مچھلیوں میں درد ہونے لگا۔ اس نے الٹے ہاتھ سے ان مچھلیوں کو دبایا اور اکڑے ہوئے پٹھوں پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ اس نے سوچا لاؤ ذرا ایک پان کا جوڑا ہی ہو جائے۔ تہمد اتار کر اور کرتا پاجامہ پہننے کے بعد خالی جیب میں ایک اٹھنی ڈال کر وہ بالم سنیما کے سائیکل اسٹینڈ پر پہنچا۔ چندو اسے مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔

"اماں کہاں ہو نیامت بھائی؟" اس نے ہنس کر پوچھا۔ "کیا چاندی کے ورق کے ساتھ خود بھی کٹ گئے؟"

"کیا مطلب۔۔۔؟" نیامت نے جیب میں سے اٹھنی نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔

"دکھائی جو نہیں دیتے۔ میں تو سمجھا تھا کہ خود ورق بن کر اپنی چھپن چھری سے لپٹ گئے ہو گے!"

چندو اس کی دکھتی رگ پہچانتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ چھپن چھری یعنی پدما بیروتن پر بری طرح عاشق ہے۔

"اپنا ایسا مقدر کہاں چندو یار۔" نیامت نے بنارسی پان کا جوڑا منہ میں رکھا۔ "یہ تو کبھی کسی قسمت والے کو ہی ملے گی۔"

"میاں دور کے ڈھول سہاونے ہوتے ہیں۔ کبھی قریب سے دیکھ لوگے تو ہوش اڑ جائیں گے۔"

"کیوں۔۔۔؟"

"ایک کلو چونا مل رکھا ہوگا چہرے پر۔ ایسا ہی میک اپ کرواتی ہیں یہ ہیروئنیں۔"

"کوئی ہرج نہیں، چونا کھانے کی تو میری عادت ہو گئی ہے۔" نیامت ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنسا۔ "مل جائے گی تو چونا چاٹ لوں گا۔"

"بڑے رنگیلے ہو یار۔" چندو زور سے ہنسا۔

"خیر ایسی بات نہیں۔ اپنی ایسی قسمت کہاں۔ بس اچھی لگتی ہے اور چھپن چھری کا نام بھی میں نے ہی اسے دیا ہے۔" نیامت بھی ہنسا۔

"کبھی دوپہر والے شو کے وقت آؤ تو تمہیں ان گنت چھپن چھریاں دکھاؤں۔"

"کیا مطلب؟" نیامت چونکا۔

"بھائی کالج کے لونڈوں کے ساتھ بہت سی لونڈیاں بھی فلم دیکھنے آتی ہیں۔ کٹے ہوئے بال، پینٹ قمیص اور گٹ پٹ گٹ پٹ کرتی ہوئی۔"

"مجھے ان سے کیا لینا۔" نیامت نے گردن جھٹکی۔ "بس جو پسند آ گئی، آ گئی۔"

"لیکن تم تو اس کی ایک جھلک بھی نہ دیکھ سکو گے۔" چندو نے کہا۔ "یہ تو فلم ہے، چلتی ہوئی تصویر۔ تھیٹر کا زمانہ ہوتا تو اسٹیج پر زندہ حالت میں ناچتے گاتے بھی دیکھ لیتے۔"

"باغ میں پھول کھلتا ہے تو سب ہی تو اسے توڑنے کے لیے نہیں لپکتے۔ کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اسے دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے ہیں

اور بنانے والے کی تعریف کرتے نہیں تھکتے — میں ایسے ہی لوگوں میں سے ہوں چندو۔"

"ٹھیک ہے استاد۔" چندو نے ایک گاہک کو سگریٹ دیتے ہوئے کہا۔ "تمہارے خوش ہونے کا ٹائم آ گیا ہے۔"

"یعنی — کیا مطلب؟" نیامت چونکا۔

"تمہاری چھپن چھری کی فلم اگلے جمعے سے لگنے والی ہے۔" چندو نے اس کی بیتابی سے دل ہی دل میں لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔

"اگلے جمعے سے لگنے والی ہے! — واقعی؟"

"ہاں — سینما پر اس کی فلم کے پوز بھی لگ گئے ہیں۔"

"کیا نام ہے فلم کا — ؟"

"لال سویرا۔ اِس میں وہی مزدوروں اور سرمایہ داروں کا رونا ہے۔"

"لاحول ولا قوۃ!" نیامت نے منہ سکوڑ کر جواب دیا۔ "وہ بھی لال رنگ میں رنگ گئی؟"

ناک چڑھاتا ہوا وہ سینما کے اندر داخل ہوا اور پدما کی تصویریں دیکھتا رہا۔ ایک تصویر ایسی بھی تھی جس میں وہ ہیرو کے ساتھ چپکی ہوئی تھی۔ نیامت کو اس کا یوں چپکنا اچھا نہیں لگا۔ وہ تو یہ سمجھتا تھا گویا پدما کے جملہ حقوق اسی کے نام محفوظ ہیں۔ بہرحال دل پر جبر کر کے وہ 'لال سویرا' فلم کے سب ہی اسٹلز دیکھتا رہا۔ اور پھر وہ روز ہی وہاں جانے لگا۔ لیکن چندو سے دانستہ کٹ جاتا تھا۔ وہ اس کا مذاق جو اڑاتا تھا۔ ابھی پیشگی ٹکٹ فروخت کرنے والی کھڑکی کے کھلنے میں چار دن باقی تھے اور ان چاروں دنوں میں نیامت نے اپنے صبح شام آستانۂ یار پر گزار دیے۔ وہ ٹکٹکی لگائے تصویروں کو دیکھتا رہتا اور وہ پیاری پیاری کامنی سی مورت اس کے دل میں سمائے چلی جاتی۔ کچھ دلویاں ایسی بھی تو ہوتی ہیں جن سے کسی صلے کی طلب کے بغیر خاموش بیٹھ کر صرف انھیں پوجا جاتا ہے۔ ایسی ہی یہ پدما تھی جو بے چارے نیامت کے حواس پر بری طرح چھا گئی تھی۔

نیامت نے پدما کے زیادہ سے زیادہ قریب رہنے کا ایک طریقہ سوچ لیا تھا۔ اور وہ طریقہ یہ تھا کہ اس کا خیال تھا کہ وہ تینوں شوز کی ایک ساتھ ہی پیشگی بکنگ کرائے گا۔ صرف ساڑھے سترہ روپے کی تو بات تھی۔ حالانکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اِن چار دنوں میں وہ بیس روپے کسی بھی طرح نہیں بچا پائے گا۔ لیکن وہ ایک اچھا اور سچا مزدور تھا۔ اس نے تہیّہ کر لیا کہ صبح شام محنت کرے گا اور رات کو بھی اپنا کام جاری رکھے گا۔ بالم سینما پر جا کر چھپن چھری پدما کے روز درشن کرنے والا کام بھی اس نے بند کر دیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ زیادہ محنت کرنے ہی سے رقم پس انداز ہو سکے گی۔ رات کے وقت پڑوسیوں نے اعتراض بھی کیا کہ راتوں کو کٹ کٹ کٹ کٹ کی آوازیں انھیں سونے نہیں دیتیں۔ لیکن انھوں نے اعتراض بعد میں کیا اور نیامت نے تیسرے ہی دن پچیس روپے بچا کر احتیاط سے اپنے تکیے کے نیچے رکھ دیے۔

فلم شروع ہونے سے ایک دن پہلے وہ صبح دس بجے پیشگی بکنگ والی قطار میں جا کر کھڑا ہو گیا — بہت لمبی قطار تھی۔ تماش بین صبح سات بجے ہی آ کر بیٹھ گئے تھے۔ اس کا نمبر شاید چالیسواں تھا۔ اسے یقین تھا کہ سانپ کی طرح سرکتی ہوئی قطار کچھ ہی گھنٹے میں اس جگہ تک پہنچ جائے گی اور وہ خود کو کھڑکی کے سامنے پائے گا۔ پھر بڑی آسانی سے وہ تینوں شوز کے ٹکٹ لے لے گا۔ چند لوگوں نے بیچ قطار میں گھسنے کی کوشش بھی کی تھی مگر پیچھے کھڑے ہوئے لوگوں نے شور مچا کر انھیں ہٹا دیا تھا۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ نیامت قطار کے سب ہی لوگوں کو اپنا رقیب سمجھ رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ صرف وہ اکیلا ہی اپنی چھپن چھری کو دیکھے اور اِس تماشۂ دید میں کوئی دوسرا حصّہ دار نہ ہو۔ بار بار وہ جیب کو تھپتھپا کر دیکھ لیتا کہ پچیس روپے موجود ہیں نا؟ اتنی محنت سے جمع کی ہوئی رقم اگر کوئی نکال لے تو پھر تو سمجھو کہ وہ ڈوب ہی گیا۔

نوٹ موجود تھے اور وہ بہت بے صبری سے اس وقت کا انتظار کر رہا تھا جب وہ کھڑکی پر پہنچے اور الگ الگ شوز کے ٹکٹ لے۔ اس کا نمبر اب غالباً تیسواں تھا۔ اسے یقین تھا کہ بس کچھ ہی وقت میں وہ وہاں پہنچ جائے گا۔ اچانک ایک عجیب بات ہوئی۔ کالج کے دس لڑکے اور لڑکیوں کی ایک ٹولی ادھم مچاتی ہوئی وہاں آ گئی۔ چار لڑکیاں تھیں اور چھ لڑکے۔ لڑکے کسرتی بدن والے تھے اور لڑکیاں خوب صورت بھی تھیں اور قد آور بھی۔ مزے کی بات یہ تھی کہ لڑکوں کا لباس تو ڈھیلا ڈھالا تھا۔ یعنی بگی پینٹ۔ اوپر سے تھیلے نما اور موری ایسی جیسے چوڑی دار پاجامے کی ہوتی ہے۔ قمیص ایسی کہ جب ایک لڑکے نے دونوں بازو پھیلائے تو یوں لگا گویا کسی چمگادڑ نے اپنے پر پھیلا دیے ہوں۔ یہ قمیص اتنی ڈھیلی تھی کہ نیامت کے خیال میں دو لڑکے بیک وقت اسے پہن سکتے تھے۔ ان لڑکوں کی قمیصوں کے گریبان کھلے ہوئے تھے اور عریاں سینوں پر بالوں کے گچھے گریبانوں سے باہر تک جھانک رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں ایک ایک ڈائری یا کاپی تھی اور تقریباً ہر ایک کے منہ میں ایک ایک سگریٹ دبا ہوا تھا۔ رہ گئیں لڑکیاں تو لڑکوں کے ڈھیلے ڈھالے لباس کے مقابلے میں وہ بے حد چست اور تنگ کپڑے پہنے ہوئے تھیں۔ قمیص اور جین جسم سے اتنی چپکی ہوئی تھی کہ جسم کا ہی ایک حصّہ معلوم ہوتی تھی۔ نیامت کا خیال یہ تھا کہ اگر ان میں سے کسی بھی لڑکی کو ایک لمبے سے کاغذ پر لٹا کر پنسل سے آؤٹ لائن کھینچ دی جائے تو اس کے جسم

کی پوری ساخت، نشیب و فراز اور گولائیاں سب آسانی سے کاغذ پر اتر جائیں گی۔ ان کی پتلونیں کولہوں پر سے اتنی تنگ تھیں کہ یوں لگتا تھا گویا ان پر پ برغلاف چڑھا ہوا ہو۔ ان لڑکیوں نے شاید قمیضوں کے نیچے کچھ نہیں پہن رکھا تھا۔ لہٰذا ان کے سینے بار بار نمائشی انداز میں ادھر ادھر دھکے کھاتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔

یہ آج کے زمانے کی تعلیم یافتہ، بے باک، لادین اور بے لگام نسل تھی۔!

شتر بے مہار کی مانند وہ سب دوڑ رہے تھے، بھاگ رہے تھے اور قہقہے لگاتے ہوئے ایک دوسرے سے چپٹے جا رہے تھے۔ گاندھی جی زندہ ہوتے تو دیکھ کر خوش ہوتے کہ ان میں چھوت چھات بالکل نہیں تھی۔ لڑکی کا لپ اسٹک سے آلودہ سگریٹ، اس کے منہ سے نکال کر لڑکا پی رہا تھا اور لڑکے کے منہ سے جھپٹ کر لڑکی سگریٹ لے لیتی تھی اور اچھل کود کرتی ہوئی اپنی ساتھی لڑکیوں کے پاس چلی جاتی۔ وہ سب مل کر اتنا شور مچا رہے تھے کہ قطار میں کھڑے ہوئے دوسرے تماش بین ناک بھوں چڑھا کر انھیں دیکھ رہے تھے۔ ایک لڑکی نے سگریٹ کا ٹوٹا زمین پر پھینک کر اس نوجوان سے کہا جو قطار سے آگے کھڑکی کی طرف جا رہا تھا۔

"دیپک۔ یار ٹکٹس لو۔ کیوں ادھر ادھر ٹہل رہے ہو؟"

"ابھی لیتا ہوں یار۔ ڈونٹ وری۔"

دیپک اتنا کہنے کے بعد قطار میں کھڑے ہوئے سب سے اگلے آدمی کے آگے گھسنے کی کوشش کرنے لگا۔ یہ دیکھ کر اس آدمی نے ٹوکا۔

"اے مسٹر، کیو میں آئیے۔"

"ابے چپ بے۔" دیپک کے بجائے دوسرے لڑکے نے جواب دیا۔ "ہم لوگ صبح کے آئے ہوئے ہیں۔"

"نہیں نہیں۔ ایسا کس طرح ہو سکتا ہے۔ تم لائن میں نہیں ہو۔" نیامت نے دور کھڑے کھڑے للکارا۔

"تم چپ رہو مین۔" ایک لڑکی نے لہراتے ہوئے بال ایک جھٹکے سے کندھے کے پیچھے ڈالتے ہوئے کہا۔ "اسے ٹکٹ لینے دو۔"

"اچھی دھاندلی ہے۔" نیامت گھبرا کر چپ ہو گیا۔ اس شورہ پشت لڑکی سے کون لڑے؟

"تم اگر آگے چلی جاؤ تو لیڈیز کو ٹکٹ پہلے مل جائے گا۔" ایک ادھیڑ عمر شخص نے کہا۔

"کیوں؟۔ رحم کھا رہے ہو مجھ پر؟۔ ہائیں؟" لڑکی نے آنکھیں نکالیں۔ "کیوں جاؤں میں آگے۔ اب برابری کا زمانہ ہے۔ مرد عورت دونوں برابر ہیں۔ میں تو ویسے ہی ٹکٹ لوں گی جیسے مرد لیا کرتے ہیں۔"

"تمہیں شرم آنی چاہیے۔" اس شخص نے ماتھے پر شکنیں ڈال کر کہا۔

"ابے چپ۔" دیپک وہیں سے چلّایا۔ "کیوں دماغ کھا رہا ہے؟"

قطار میں کھڑے ہوئے لوگ خاموش ہو گئے اور بے بسی سے ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ دیپک ان سب کے ٹکٹ لے کر سائیکل اسٹینڈ کی طرف چلا گیا اور لڑکیاں ایک دوسرے کے منہ سے سگریٹ نکال نکال کر پیتی ہوئی اس کے پیچھے چل دیں۔ قطار آہستہ آہستہ آگے کھسک رہی تھی اور اب نیامت کا نمبر بیسواں تھا۔ وہ بیتابی سے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ سائیکل اسٹینڈ کی طرف سے چیخ پکار سنائی دینے لگی۔ ایک لڑکی چندو سے سگریٹ کا پیکٹ مانگ رہی تھی اور چندو انکار کر رہا تھا کہ پہلے پچھلے ہفتے کے پیسے لاؤ۔

"سالا، حرامی۔ راسکل۔" وہ لڑکی چیخی۔ "تو سمجھتا ہے کہ ہم بھاگ جائے گی۔ ہاں؟"

"میں نے یہ کب کہا جی۔" چندو منمنایا۔ "مگر پچھلے بیس روپے آٹھ آنے بھی تو آپ پر واجب ہیں۔"

"کیوں بے۔ کیا پٹنے کا ارادہ ہے؟" دوسرا ہپّی ٹائپ کا نوجوان آگے آیا۔ "حرامزادے یہاں بیٹھنے جو دیتے ہیں تجھے۔"

"مگر صاحب یہ تو اندھیر گردی ہے، تم لوگ زبردستی کرتے ہو۔" چندو نے خود میں تھوڑی سی ہمت پیدا کی۔

"تو پھر بلالے پولیس کو۔" وہی نوجوان چیخا۔

"پولیس آپ جیسوں کا کیا کرے گی؟" چندو نے ہارے ہوئے جواری کی طرح کہا۔ "وہ بھی تو آپ ہی کا پارٹ لیتی ہے۔"

"زبان چلاتا ہے ہم سے۔ ہائیں۔" ایک سرو قد لڑکی نے چندو کی کمر پر ہلکا سا ہاتھ رسید کیا اور پھر اسی لڑکی نے بڑھیا قسم کے سگریٹ کا ایک پیکٹ نکال لیا۔ چندو نہ نہ کرتا ہی رہ گیا، مگر اس نے پیکٹ پھاڑ کر سب میں ایک ایک سگریٹ تقسیم کر دیا۔

"گھوش بابو آئیں گے تو میں ان سے تمہاری شکایت کروں گا۔" چندو نے ہاتھ ملتے ہوئے جواب دیا۔

"وہ بابو موشائے!"۔ ہپی نوجوان ہنسا۔ "ہمارے کالج کی یونین کا صدر۔ ابے وہ تو بے ضرر آدمی ہے۔ سب کو کمیونسٹ بناتا پھرتا ہے۔ ہم اسی کے کہنے پر تو عمل کر رہے ہیں۔ تجھ جیسے سرمایہ دار کا مال لے کر سب میں بانٹ رہے ہیں۔"

"ہاں یار چندو بابو۔" سرو قد لڑکی نے بناوٹی محبت سے کہا۔ "ہم اسی کے بتلائے ہوئے راستے پر تو چل رہے ہیں۔"

"ہاں۔" دیپک نے چندو کے خوانچے سے ماچس کی ایک ڈبیہ اٹھائی۔ "گھوش بابو بولا تھا کہ سرمایہ داری بری چیز ہے۔ انسان کو چاہیے کہ آپس میں مل بانٹ کر کھائے اور ایک دوسرے کی مدد کرے۔"

"اور ہم مل بانٹ کر کھا ہی رہے ہیں اور تمہاری مدد اس طرح کر رہے ہیں کہ تمہارا یہ خوانچہ ہلکا کر رہے ہیں۔ اب تمہیں یہ بوجھ اٹھا کر اپنے گھر تک نہیں جانا پڑے گا۔" ہپّی نوجوان نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

"چھوڑو بھی دیپک یار۔" سرو قد لڑکی نے سگریٹ کا لمبا سا کش لے کر کہا۔ "اب چندو کو بولو کہ ہم سب کے لیے میٹھا پان لگائے۔"

"چل بھئی شروع ہو جا۔" دیپک نے چندو کو ٹھوکا دیا۔

"نوّے نمبر کا تمباکو ایک پان میں ڈال دیجیو۔" ہپّی کا ایک ساتھی بولا۔

"نہیں یار۔" سرو قد لڑکی گھبرا کر بولی۔ "سنا ہے کہ ایسے تمباکو سے کینسر ہو جاتا ہے۔"

"ارے تو رادھا ڈیر اب ہم کون سی موج کر رہے ہیں۔ جس سماج میں ہم رہ رہے ہیں وہ کینسر ہی تو ہے۔"

"پان کیوں نہیں لگاتا چندو۔ جلدی لگا۔" ایک اور لڑکی نے رعب دکھایا۔

"نہیں جی۔ پہلے میری رقم چکا دو۔" چندو نے احتجاجاً اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ لیے۔ "میرے کافی پیسے ہو گئے ہیں۔ پچھلا تو دیتے نہیں اور نیا مال مانگتے ہو۔ میں نہیں لگاؤں گا پان۔"

"نہیں لگائے گا؟" دیپک نے آنکھیں نکالیں۔

"ہاں نہیں لگاؤں گا۔"

"تیری تو ایسی کی تیسی۔"

دیپک نے اتنا کہہ کر ایک زوردار ٹھوکر اس کے خوانچے پر ماری۔ پھر دوسری۔ پھر تیسری، خوانچہ فٹ بال کی طرح لڑھکتا ہوا دور جا گرا۔ کتھا چونا اور پان سب الٹ گئے۔ سگریٹ کے پیکٹ ادھر ادھر بکھر گئے۔ دیپک نے حملہ جاری رکھا اور دوسرے لڑکے و لڑکیاں مالِ غنیمت اکٹھا کرتے رہے۔ سائیکل اسٹینڈ کے آس پاس کھڑے ہوئے لوگ ششدر رہ گئے۔ ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کریں؟ نیامت کا منہ حیرت کی وجہ سے کھل گیا۔ اس نے آج کے سماج کے پروردہ ان تعلیم یافتہ لڑکوں کو حیرت سے دیکھا۔ اس کا خیال تھا کہ موجودہ نظامِ تعلیم طلبا کو جینے کا نیا انداز اور دنیا میں زندگی بسر کرنے کی نئی جہت سے روشناس کراتا ہے۔ مگر کیا یہی وہ نظام ہے۔ یہی وہ تعلیم ہے اور یہی وہ انداز ہے جو آج کل تعلیم یافتہ نسل اختیار کیے ہوئے ہے! اُن سے اچھا تو وہ خود ہے۔ یعنی انگوٹھا ٹیک! جاہل مطلق اور زمانے کے سرد و گرم سے قطعی ناآشنا۔ جس بورژوا سماج کے بارے میں سکھدیو بار بار کہتا تھا۔ کیا یہ لڑکے لڑکیاں اسی سماج میں نہیں جی رہے۔ کہاں گئے وہ انسانی حقوق، وہ برابری اور اشتراکیت؟ کدھر ہیں وہ سرخ سویرے کے متوالے۔ کہاں چھپ گئے ہیں وہ غریبوں اور مزدوروں کے ہمدرد۔ کیا ان کا فرض نہیں ہے کہ سماج کے اس پکتے ہوئے پھوڑے کا آپریشن کریں!

چندو کی بے بسی دیکھ کر نیامت کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ غریبوں کا تو ہمیشہ اسی طرح استحصال ہوتا رہتا ہے۔ اور غریبوں کی مدد کا نام لے کر جھنڈا بلند کرنے والے ایسے مواقع پر چشم پوشی کر جاتے ہیں!

کھڑکی اب قریب رہ گئی تھی، نیامت کا ہاتھ جیب میں رکھے ہوئے بیس روپے کے سرخ نوٹ اور پانچ روپے کے سبز نوٹ کو چھو رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ اب ٹکٹ لے لے، مگر پلٹ کر دیکھا تو لڑکیوں کو قہقہے لگاتے اور دیپک کو خوانچے سے فٹ بال کھیلتے دیکھا۔ نیامت کے دل کا خون ہو گیا۔ کچھ دیر تک وہ چپ چاپ اس طرف دیکھتا رہا۔ اور پھر جب وہ قطار میں سب سے آگے کھڑکی کے قریب آ گیا تو ایک ٹھنڈی سانس لے کر قطار سے باہر نکل آیا اور ہلکے ہلکے قدم اٹھاتا ہوا چندو کے قریب جانے لگا۔

لڑکے اور لڑکیاں ہنستے ہوئے واپس جا رہے تھے۔ قطار میں کھڑے ہوئے لوگوں کو فلم دیکھنے میں دلچسپی تھی۔ مگر انھیں اس بات کی مطلق پرواہ نہ تھی کہ کچھ ہی فاصلے پر کچھ دیر پہلے کیا ہنگامہ بپا ہو چکا ہے اور چند پہر کیسی قیامت گذر گئی ہے۔ نیامت گردن جھکائے مرے مرے قدم اٹھاتا ہوا چندو کے پاس پہنچا۔ وہ بے چارہ روتا جا رہا تھا اور اپنا بکھرا ہوا سامان اٹھاتا جا رہا تھا۔ پان کچلے گئے تھے اور سگریٹ ادھر اُدھر بکھر گئے تھے۔

نیامت نے مڑ کر فلم کے بینر کی طرف دیکھا۔ اوپر موٹے حروف میں لکھا تھا "سرخ سویرا"۔ وہ سوچنے لگا کہ جب ہر سمت اندھیرا ہی حکمراں ہو تو سرخ سویرا بھی کس طرح اس تاریکی کو دور کرے گا۔

نیامت نے روتے ہوئے چندو کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ اسے دلاسا دیا۔ آنسو پونچھے اور پھر جیب میں سے پچیس روپے نکال کر چندو کی بنڈی کی جیب میں رکھ دیے۔ چندو اسے حیرت سے دیکھتا ہی رہ گیا مگر نیامت اپنے ہونٹوں پر بے حد حسین اور لازوال مسکراہٹ لیے تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

●●

پنجابی

م۔ک۔ مہتاب

۳۸/اے پنچم وہار۔ نئی دہلی ۶۳

وہ شیشم کے پیڑ کے نیچے درخت کے تنے کے ساتھ پشت لگائے کھڑی تھی۔ موسم برسات کے بعد جب ہوا بند ہو جاتی ہے تو دوپہر کا سورج کرنوں کے نیزے برسانے لگتا ہے۔ اس کے چہرے پر چمک رہے پسینے کے قطرے دھاروں کی صورت میں رخساروں سے بہتے ہوئے اس کے خوب صورت ہونٹوں کے کناروں تک چلے آرہے تھے جنہیں وہ بار بار اپنے عنابی دوپٹے سے صاف کر رہی تھی۔ اس سے اس کا گلابی رنگ اور بھی نکھرتا جا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں اور بھی کھلتی جا رہی تھیں اور اس کی آوارہ زلفیں چہرے اور گردن کے گرد چپکتی جا رہی تھیں۔ وہ کبھی ایک اور کبھی دوسرا پاؤں شیشم کے تنے کے ساتھ لگا دیتی تھی۔ اپنے سرو قد کے لحاظ سے وہ درخت کا ہی ایک حصہ معلوم ہوتی تھی۔ شیشم کے پتوں میں سے چھن چھن کر آنے والی دھوپ ان دونوں کے چہروں پر پڑ رہی تھی۔ وہ اس سے کہہ رہی تھی۔

"ریشم! اب تم جلدی سے چلے جاؤ۔ اگر کسی نے دیکھ لیا تو... تمہیں یہاں آنے میں ڈر نہیں لگتا کیا؟ تم ہر ماہ کیسے یہاں آجاتے ہو؟"

"درگی! عشق اسی وقت حقیقی ہوتا ہے جب ڈر کا احساس ختم ہو جاتا ہے کیا ہیر کو رانجھے سے ملنے میں کبھی ڈر لگا تھا کیا سوہنی کو کچے گھڑے پر دریا پار کرنے میں کوئی خوف ہوا تھا؟ میں تو اس لیے آتا ہوں کہ تم ڈر رہی ہوگی کہ میں زندہ بھی ہوں یا نہیں۔ کہیں پولیس کے ہاتھوں مارا تو نہیں گیا۔ یا میرے ہی کسی ساتھی نے مجھے ختم تو نہیں کر ڈالا؟ سچ کہنا! تم یہ سوچتی نہیں رہتی۔ میں تمہارے یہی وسوسے دور کرنے کے لیے یہاں چلا آتا ہوں۔ تمہیں رب کی قسم ٹھیک بتانا کیا میرے آنے سے تمہاری تسلی نہیں ہو جاتی؟"

درگی نے کچھ کہے بغیر ریشم کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔ دونوں کچھ دیر خاموش کھڑے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے گویا سانس کی زبان سے باتیں کر رہے ہوں۔ دوپہر کے اس سناٹے میں ریل گاڑی کی سیٹی سنائی دی اور وجد کی اس کیفیت سے ابھرتے ہوئے درگی نے کہا "ریشم تم اب چلے جاؤ۔ روہتک والی مسافر گاڑی آرہی ہے۔ اگر اس میں سے کسی نے تمہیں دیکھ لیا تو قیامت آجائے گی۔ ادھر خیمے میں ماں بھی میرا انتظار کر رہی ہوگی کہ میں بچی کے میمنے میں گوند بنانے گئی تھی وہاں سے کہاں گم ہو گئی۔ میں شیشیاں اور لیبل وہیں کھلے چھوڑ آئی ہوں۔ تم ایشور کے واسطے اب جلدی یہاں سے چلے جاؤ۔

دھڑ دھڑاتی ہوئی مسافر گاڑی ان کے قریب سے گزر گئی۔ ریشم پنجاب سے آئے ان پناہ گزینوں کے لیے ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ لگے ان خیموں میں سے ہوتا ہوا درختوں کی اوٹ میں گم ہو گیا۔ درگی وہیں سانس روکے کھڑی رہی۔ اس وجیہہ نوجوان کو تاحد نظر دیکھتی رہی جس کا لکڑی کے لٹھے جیسا جسم کتنا باوقار تھا جس کی سانسوں میں جوان خون کی وہ خوشبو تھی جو بھلائے نہیں بھولتی تھی اور جس کے سائے میں زندگی خواب نہیں ایک حقیقت نظر آتی تھی۔ درگی کو ریشم کی حفاظت اور سلامتی کے بارے میں ڈر لگتا تھا لیکن اس کے بغیر بھی زندگی خالی خالی دکھائی دیتی تھی اس لیے وہ ریشم کی آمد اور اس طرح چند منٹ کی چھپ چھپ کر باتوں کا انتظار کیا کرتی تھی۔

پنجاب کے لوگ کسی حد تک ایک انوکھے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ زندگی کے بارے میں کسی تصنع بناوٹ یا بکھیڑے سے کام نہیں لیتے ہر طرح کے تکلفات سے دور رہتے ہیں اور ان کی یہ سادگی ان کے ناموں، لباس، غذا، میل جول ہر چیز میں جھلکتی ہے۔ اچھا بھلا نام درگیشوری درگی بن جاتا ہے۔ فضل الرحمٰن پھجا اور غلام محمد گاماں بن جاتا ہے۔ کرتار کور کو وہ تارو ہی کہیں گے۔ گاڑھے کی چادر بہترین لباس اور ابلی ہوئی گندم ان کے لیے بہترین غذا ہے۔ یہی سبب ہے کہ زندگی کی کلفتوں کو وہ بڑی آسانی سے برداشت کر لیتے ہیں۔ تقسیم ملک کا آرہ انھوں نے اپنے جسم پر چلتے ہوئے دیکھا لیکن اف تک نہیں کی۔ پنجاب دراصل کسی جغرافیائی حد بندی کا نام نہیں بلکہ زندگی کے تئیں ایک انداز فکر کا نام ہے جس میں زندگی بھر کی دشمنی "چھڈ وری" (چھوڑیے بھی یا جانے بھی دیجیے) کے دو الفاظ کہہ کر ختم کر دی جاتی ہے۔ جس میں روٹی بیٹی سانجھی ہوتی ہے جس دوست کا بازو تھامے رکھنا سب سے بڑی انسانی خوبی اور یار مار کرنا سب سے مکروہ انسانی فعل قرار دیا جاتا ہے۔ لاغرض خدمت سب سے بڑی عبادت ہے۔ مذہب نہایت آسان اور ذاتی معاملہ ہے جسے باہمی رشتوں میں بہت کم اہمیت دی جاتی ہے۔

اسی جذباتی وابستگی اور بردباری کے سبب پنجاب میں دہشت گردی کا طوفان انھیں زیادہ پریشان نہیں کر سکا۔ قریب ایک ہزار بیگناہ

بنے یہاں دو برس سے گھٹیا قسم کے خیموں میں پڑے زندگی کی اس نئی مصیبت کے دن صبر و شکر کے ساتھ بسر کر رہے تھے۔ ہر خیمے کے اندر دکھ درد کی داستانیں موجود تھیں لیکن وہ یہ تکلیفات اور غم ایک دوسرے کے سہارے برداشت کر رہے تھے۔ حکومت کی جانب سے انھیں محدود مالی مدد دی جا رہی جس کے لیے انھیں بار بار دفتروں کے چکر کاٹنے پڑتے تھے بال بچوں والے پریشان لوگ اس ناکافی مالی مدد کے سبب بہت پریشان تھے مگر کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانا فطرت کے خلاف تھا اس لیے جو اندوختہ ساتھ لائے تھے کھاتے جا رہے تھے۔ کچھ تندرست اور جوان لوگوں نے ادھر ادھر چھوٹا موٹا کام دھندا بھی کر لیا تھا لیکن بیکار اور نادار لوگوں کے لیے زندگی کا بوجھ ناقابلِ برداشت ہوتا جا رہا تھا۔ نہ اس بے سروسامانی کے ختم ہونے کی کوئی امید تھی نہ واپس جانے کا کوئی امکان۔ پنجاب کے سرحدی اضلاع سے آئے ہوئے یہ خوف زدہ لوگ ان خیموں میں ناگفتہ بہ زندگی بسر کرنے پر مجبور تھے۔

آوارہ بچے کنچے کھیلتے، عورتیں گھر کے کاموں میں لگی رہتیں اور مرد لوگ چارپائیوں پر پڑے اونگھا کرتے۔ اس پر بھی وہ شاکر تھے کہ چلو پینے کو دو گھونٹ پانی سر چھپانے کو ایک خیمہ یا کوٹھری اور کھانے کے لیے سرکار سے دو لقمے تو مل جاتے تھے۔ لیکن مستقبل کی سائیں سائیں کرتی ہوئی اندھیری رات ان کے لیے سوہانِ روح بنتی جا رہی تھی۔

درگی سے اس کی پہلی ملاقات ان کے خیمے میں ہی ہوئی تھی جہاں وہ اپنے بیمار باپ کندن لال، والدہ اور دو چھوٹے بھائیوں کے ساتھ ٹھہری ہوئی تھی۔ جب وہ ایک اور سماجی کارکن کے ساتھ خشک دودھ تقسیم کرنے کے لیے ان کے خیمے میں گیا تو کندن لال دمہ کے حملے کی وجہ سے چارپائی پر اوندھا پڑا ہانپ رہا تھا درگی اس کی پیٹھ سہلا رہی تھی۔ گھٹیا سی قمیض شلوار اور دوپٹے میں بھی اس کا حسین جوان جسم کالے بادل میں پنہاں بجلی کی مانند چمک رہا تھا۔

درگی کی والدہ نے انھیں اپنی زندگی کی پر درد کہانی سنائی تھی۔ وہ دوہرے پناہ گیر تھے تقسیم ملک کے بعد گجرات سے ضلع گورداسپور کے قصبہ فتح گڑھ چوڑیاں میں آکر آباد ہوئے تھے۔ جہاں کندن لال اور اس کا بڑا لڑکا کرشن دیہات میں سودا سلف بیچنے جاتے اور اجناس اکٹھا کرکے شہر میں بیچ کر اپنا گزر بسر کرتے تھے۔ انھیں دہشت گردوں کی دھمکیاں ملتی رہیں لیکن وہ اپنے قصبے میں ڈٹے رہے۔ ایک شام کسی شرارت پسند نے کرشن کی سائیکل چھین لی اور اسے گولی مار کر لاش نہر میں بہا دی۔

اب کندن لال کے لیے وہاں ٹھہرنا ممکن نہیں تھا وہ بچوں کو لے کر دہلی چلا آیا۔ یہاں زندگی کی کوئی سہولت میسر نہ ہونے کے سبب اسے بار بار دمے کے دورے پڑنے لگے۔ فتح گڑھ چوڑیاں کا ایک حکیم اسے دوائی دیا کرتا تھا لیکن اب دوائی لانے کی کوئی صورت باقی نہیں تھی۔

"اب تو میں ایشور سے ہر وقت مرنے کی دعا مانگتا ہوں۔ صرف یہی ڈر لگتا ہے کہ درگی اور سکا کہاں جائیں گے؟" کندن لال ہاتھ جوڑ کر کہہ رہا تھا۔

اتنے میں درگی کی والدہ دو پیالے چائے بنا کر لے آئی۔ "ماں جی! یہ آپ کیا کر رہی ہیں۔ آپ کے پاس تو دودھ کے لیے پیسے بھی نہیں۔"

"کبھی تو تھے۔ جیسی بھی ہے لے لیجیے۔ سکا کا آنند پربت پر برتنوں کے ایک کارخانے میں کام سیکھنے لگا ہے۔ اور لوگ نگر سا ایک کارخانے دار درگی اور مجھے یہ شیشیاں بھرنے کے پیسے دے جاتا ہے۔ چائے پانی کے لیے پیسے بن جاتے ہیں۔"

وہ دونوں چائے کے پیالے پکڑے درگی اور اس کی والدہ کی جانب دیکھ رہے تھے کہ یہ لٹا پٹا قافلہ اب بھی ذہنی طور پر آسودہ حال اور مہمان نواز ہے۔ بیٹھنے کو کوئی جگہ نہیں تھی۔ لہٰذا وہ کھڑے کھڑے ہی درگی کی والدہ سے اردگرد کے خیموں میں مقیم لوگوں کی دکھ بھری داستانیں سن رہے تھے۔

کندن لال کے پاس نہ علاج کے لیے پیسہ تھا نہ یہاں کوئی دوا راس آ رہی تھی۔ اگر فتح گڑھ کے حکیم سے کبھی دوائی آ جاتی تو چند روز آرام سے نکل جاتے تھے۔ وہ مالی امداد لینے بھی چلا جاتا تھا۔ لیکن اس روز تو وہ کراہ کی مانند دوہرا پڑا موت کی دعا مانگ رہا تھا۔ درگی کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے جنھیں وہ اپنے دوپٹے سے صاف کرتی جا رہی تھی۔ جس سے اس کے چہرے کا رنگ اور بھی نکھرتا جا رہا تھا۔

آنسوؤں کے اس دھوئیں نے چائے کی مٹھاس ختم کر دی تھی اور وہ دونوں اپنے حلق میں ایک کڑواہٹ لے کر وہاں سے لوٹے تھے۔

درگی سے اس کی دوسری ملاقات کیمپ میں ہی ویشنو دیوی کے ایک رت جگے میں ہوئی تھی۔ مذہب مصائب میں مبتلا شخص کے لیے بہت بڑا سہارا ہے۔ وہ ڈھولک اور چمٹا بجا کر کچھ دیر کے لیے اپنے جسم کے درد اور ذہن کے کرب کو بھول جاتا ہے۔ اس لیے اگر خیموں کی اس بستی میں ان لوگوں نے اس رت جگے کا اہتمام کیا تھا تو یہ ان کی مادی خوشحالی کی علامت نہیں تھی بلکہ ایک دہلیز تھی جس پر وہ دوزانو ہو کر ان مصائب سے نجات کے لیے دعائیں مانگ رہے تھے۔

وہ بھی وہاں ویشنو ماتا کی حمد و ثنا کے بھجن سن رہا تھا کہ اس نے درگی کو دیکھا جو اس کی دائیں جانب بیٹھی تھی۔ اس کے قریب ہی چارخانہ تہمد اور سرخ قمیض والا ایک نوجوان بیٹھا تھا جس کے چہرے پر سیاہ گھنی منحنی داڑھی تھی۔ اس نے سر پر سفید گوٹے والی سرخ رنگ کی ایک چھوٹی سی چنری باندھ رکھی تھی جیسی عام طور پر ویشنو ماتا کے بھگت باندھتے ہیں۔ وہ بھی تالیاں بجا رہا تھا۔

وہ بھی تھوڑا وا نے کو کھسک کر ان دونوں کے عقب میں جا بیٹھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے بہت ہی قریب بیٹھے ہوئے تھے۔

تالی بجانے کے ساتھ کوئی بھجن نہیں گا رہے تھے بلکہ ایک دوسرے کے ساتھ باتیں کر رہے تھے۔ باتیں جن میں پیار کی گرمی تھی اور محبت کی مٹھاس تھی۔ وہ اپنے ہی وجد میں ڈوبے ہوئے تھے۔

ان کی باتوں سے ظاہر تھا کہ ریشم پہلے بھی وہاں آیا کرتا تھا۔ وہ نئے گڑھ چوڑیاں سے کندن لال کے لیے تازہ دوا بنوا کر لاتا تھا۔ وہ فرصت نہ ہونے پر بھی آتا تھا کیوں کہ ریشم کے کہنے کے مطابق

"بچپن کے قول جان دے کر بھی نبھانے چاہئیں۔" وہ دُرگی کو مشورہ دے رہا تھا۔

"تم لوگ واپس کیوں نہیں آجاتے۔ میں تو تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔"

"واپس کہاں آئیں ریشم۔ کرشن مارا گیا۔ کاکا کو مارنے کی دھمکی دی گئی تھی۔ یہاں بھیک کے ٹکڑوں پر پل رہے ہیں مگر زندہ تو ہیں۔ تم ہی یہ خراب کام چھوڑ کر یہاں کیوں نہیں آجاتے۔"

"اب میرے لیے لوٹنا ممکن نہیں۔ وہ مجھے ہی ختم کر دیں گے۔ تم میرے ساتھ چلی چلو نا۔ تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ وہ شیشم کے لمبے اونچے درخت تمہیں یاد کرتے ہیں جہاں ہم جھولے جھولا کرتے تھے۔ وہ نہر کا پانی تمہیں یاد کرتا ہے جہاں اسکول سے لوٹتے وقت ہم نہایا کرتے تھے۔ وہ کمّو بھٹیاری تمہیں بہت یاد کرتی ہے جس کی بھٹی سے شام کو ہم دونوں مکئی بھنوا کر اور کنویں پر بیٹھ کر کھایا کرتے تھے۔"

"ریشم میں چلی بھی جاؤں تو تم مجھے کب ملو گے۔ تم تو پولیس کے ڈر سے نہ جانے کہاں کہاں بھاگ رہے ہو۔"

"دُرگی! تم چلو تو میں بھی لوٹ آؤں گا خواہ مجھے تمہارے بازوؤں میں ہی موت کیوں نہ آجائے؟ تمہارے بغیر زندگی بکّی کا خالی بھٹہ سا دکھائی دیتی ہے۔"

"نہ بابا نہ!" دُرگی نے ریشم کی کمر میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔ "میں نہیں جاؤں گی۔ میں تمہیں جس حال میں بھی ہو زندہ دیکھنا چاہتی ہوں۔"

ڈھولک اور جھانجروں کی آواز بلند ہو جاتی تو پیار کا یہ نغمہ بے صدا ہو جاتا۔ وہ ان دونوں کے عقب میں بیٹھا ان کی باتیں سن کر منتشر کہانی کا تانا بانا ملانے کی کوشش کرتا رہا۔ ریشم جیسے کہ وہ کہہ رہا تھا واقعی جان کی بازی لگا کر وہاں آتا تھا۔ کندن لال کو بھی اس کی آمد کا علم تھا کیوں کہ ریشم ہر ماہ مقامی بوٹی سے تیار کی گئی حکیم جی کی دوا کندن کے لیے لاتا تھا جس کے لیے دُرگی کی والدہ بھی اس کی احسان مند تھی۔ کندن اور اس کی بیوی دونوں کو علم تھا کہ ریشم اور دُرگی بچپن سے ہی دوست تھے اور اس سے زیادہ انھوں نے جاننے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔

عمر کے ساتھ ساتھ دُرگی اور ریشم کا عشق بھی جوان ہوتا چلا گیا تھا لیکن حالات نے اس میں اتنی رکاوٹیں کھڑی کر دی تھیں کہ ان کے تشنہ لب دریا کے دو کناروں کی مانند ہو گئے تھے جو آپس میں کبھی مل نہیں سکتے تھے۔

اسے اب دُرگی اور ریشم کے تعلقات کا بہت حد تک علم ہو چکا تھا۔ یہ دو دلوں کی روحانی داستان تھی جس میں کہیں بھی کسی کی مداخلت کی گنجائش نہیں تھی۔ پنجاب سے کتنے ہی لوگ کیمپ میں مقیم اپنے رشتے داروں سے ملنے کے لیے روز آیا کرتے تھے۔ اگر ریشم بھی ایک لڑکی سے ملنے آتا تھا تو اس میں کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں تھی۔

ایک شام وہ کیمپ کمانڈنٹ کے دفتر میں بیٹھا مٹی کے تیل کے کارڈ بنا رہا تھا۔ دُرگی آئی۔ وہ رو رہی تھی۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور چہرے پر بھی کچھ سوزش سی تھی۔ دوپٹہ گلے میں لٹک رہا تھا۔ وہ بہت ٹوٹی پھوٹی سی دکھائی دے رہی تھی۔

"کیا ہمارا تیل کا کارڈ بن گیا ہے؟" وہ روہانسی بولی۔

"بن تو گیا ہے لیکن صبح ملے گا۔" "تم رو کیوں رہی ہو؟"

اور وہ اس کی بات سن کر ایک پکے ہوئے پھوڑے کی مانند پھوٹ پڑی۔ کمرے میں اور کوئی نہیں تھا۔ اس نے اُسے دلاسہ دیا اور بیٹھنے کو کرسی دی۔

"دُرگی! میں جانتا ہوں تم لوگ کن حالات میں زندگی بسر کر رہے ہو۔ ایک دن یہ سیاہ رات ضرور ختم ہوگی۔ آرام کی صبح ضرور آئے گی۔"

"انکل گھر میں نہ کچھ کھانے کو ہے نہ پکانے کو۔ تیل خریدنے کے لیے پیسے بھی نہیں ہیں۔ باپو بیماری کے سبب پنشن کے پیسے لینے کچہری بھی نہیں جا سکا۔ اڑوس پڑوس سے کتنا ادھار مانگا جائے۔ ماں کو دس دن سے بخار آ رہا ہے۔ اسے ایک دن پڑوس کی بستی میں ڈاکٹر کے پاس لے گئی تھی۔ اس کے اتنے پیسے لیے کہ پھر وہاں جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ اس مہینے باپو کی دوائی بھی نہیں آئی۔ میں رات رات بھر جاگ کر باپو کی خدمت کرتی رہتی ہوں۔ پتہ نہیں ہماری زندگی کا چراغ کب بجھے گا۔ اب باپو کو گرم پانی کی ٹکور کرنی ہے۔ اسٹوو میں تیل نہیں ہے آپ تیل کا کارڈ دے دیں تو میں کسی سے ادھار مانگ کر تیل خرید لاؤں گی۔"

اس نے دُرگی کو کارڈ تھماتے ہوئے پوچھا۔

"دُرگی! یہ ریشم کون ہے جو تمہیں ملنے آتا ہے؟"

"میرے گاؤں کا ہی رہنے والا ہے۔ باپو کی دوائی لاتا ہے۔ بچپن کا دوست ہے۔"

"میرے خیال میں کوئی اچھا آدمی نہیں ہے۔"

"میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ کہتا ہے پولیس اس کا تعاقب کر رہی ہے۔ لیکن جھوٹ کہتا ہوگا۔ نہیں تو ہر مہینے یہاں کیسے آ سکتا ہے۔ مجھے ڈراتا رہتا ہے۔"

"نہیں درگی۔ میں نے رت جگے میں اس کی باتیں سنی تھیں ہو سکتا ہے سچ کہتا ہو۔ ہو سکتا ہے پولیس نے اس کی گرفتاری کے لیے بھاری انعام مقرر کر رکھا ہو۔ یہ شخص ایک خطرناک قاتل یا اسلحہ درآمد کرنے والا مجرم بھی ہو سکتا ہے۔ یہ آدمی تمہارے سب دکھوں کی دوا بن سکتا ہے۔ اگر تم کہو تو میں کیمپ میں تعینات سی آر پی کے افسر کو اس کی آمد کے بارے میں خبر کر دوں۔ پھر آپ لوگوں کو ایک بہت بڑی رقم مل جائے گی اچھا سا مکان مل جائے گا۔ کندن لال کا کسی اچھے ڈاکٹر سے علاج ہو جائے گا۔ کا کا کو کوئی کام دھندہ بن جائے گا۔ کندن تمہیں بھی کسی اچھے ٹھکانے پر پہنچا سکے گا۔ پھر آپ لوگوں کو یہ ذلت کی زندگی بسر نہیں کرنی پڑے گی اور نہ واپس اس دہشت بھرے ماحول میں لوٹ کر جانا پڑے گا۔"

تیل کا کارڈ چند لمحے درگی کے ہاتھ میں کانپتا رہا۔ پھر زمین پر گر گیا۔ اس نے کارڈ نہیں اٹھایا۔ کرسی سے اٹھ گئی اور کپکپاتے ہوئے ہونٹوں سے بولی۔

"ہم دوست کی دوستی دیکھتے ہیں اس کے عیب نہیں گنتے۔"

درگی جلدی سے کمرے سے باہر چلی گئی۔ وہ بھونچکا سا اس کی جانب دیکھ رہا تھا گویا کسی پنجابی نے اس کے گال پر زور سے طمانچہ دے مارا ہو جس سے اس کا سارا وجود کانپ رہا ہو۔

●●

زیرِ سطح

قیوم راہی

اے۔۳۰، بلاک ڈی نارتھ ناظم آباد کراچی ۷۴۷۰۰، (پاکستان)

"اچھا یار خدا حافظ، اب میں شاید نہ آسکوں جلد ہی لاہور چلا جاؤں گا" تنویر نے بڑی واماندگی کے ساتھ گدلی گدلی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور اپنا دایاں ہاتھ الوداعی انداز میں ہلایا۔

"خدا حافظ"

پھر رکشا ایک گڑگڑاہٹ کے ساتھ تیزی سے دوڑتا ہوا چلا گیا۔ میں اسے دور تک جاتا ہوا دیکھتا رہا حتٰی کہ وہ میری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

سامنے چار پانچ منزلہ فلیٹوں کی بلند و بالا عمارتیں غروب ہوتے ہوئے سورج کی زرد روشنی میں بے رونق معلوم ہو رہی تھیں خالی خالی، اجڑی اجڑی۔ ہمارے دلوں کی اداسی شاید باہر نکل کر ان در و دیوار پر پھیل گئی تھی، اداسی جو ساری فضا اور ماحول پر منڈلا رہی تھی۔ چھٹی کا دن ہونے کے باعث ٹریفک کا زور شور خاصا کم تھا۔ سوائے پھل والوں کی بنا دیواروں اور بنا دروازوں والی دکانوں کے قریب قریب تمام دکانیں بند تھیں۔ ورنہ یہ تو وہ جگہ ہے جہاں کی شامیں خاصی سندر اور زندگی سے بھرپور ہوتی ہیں۔ بڑی گہما گہمی کا سماں رہتا ہے۔ بڑی چہل پہل، بڑی خرید و فروخت کا سلسلہ۔

نہ جانے کیوں رکشا نظروں سے غائب ہو جانے کے بعد بھی میں کچھ دیر تک ساکت و جامد کھڑا ادھر دیکھتا رہا۔ جیسے میں کوئی سپنا دیکھ رہا تھا۔

گذشتہ ایک ڈیڑھ گھنٹے میں جو کچھ میں نے دیکھا، جو کچھ میں نے سنا وہ میرے وہم و گمان میں آ ہی نہیں سکتا تھا۔ ایک گورکھ دھندا۔ ایک تماشا۔ ایک خواب۔ تنویر کا یہ رنگ، یہ ڈھنگ، یہ روپ میرے لیے بالکل نیا اور غیر متوقع تھا جو مجھے چونکا ہی نہیں، بری طرح دہلا بھی گیا تھا۔ میں ان دنوں پھر ذہنی بحران کی زد میں تھا۔ لیکن اس وقت میں اپنے مسائل اور وسوسوں کو بھول سا گیا تھا کہ تنویر کا سیل غم مجھے بہائے لیے جا رہا تھا۔

یہ کوئی تیس برس قبل کی بات ہے۔ لاہور میں ایک پرائیویٹ ادارے کے دفتر میں میری اس سے پہلی ملاقات ہوئی تھی جہاں ان دنوں وہ کام کر رہا تھا۔ میں ان دنوں بڑی بے سر و سامانی کی حالت میں تھا۔ ہندوستان سے ہجرت کے بعد میں بھی لاہور میں اپنے قدم جمانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہم دونوں ہم عمر تھے۔ وہ مجھے بھا گیا۔ شاید یہی کیفیت اس کی بھی تھی۔ یوں ہماری دوستی جلد ہو گئی۔ لیکن قریب اور قریب تر ہونے میں ہمیں خاصا طویل عرصہ گزارنا پڑا۔ شاید ہم دونوں ہی اس سلسلے میں محتاط واقع ہوئے تھے۔ شروع میں ہماری ملاقاتوں کا سلسلہ باقاعدہ نہیں تھا۔ ہم دونوں زیادہ تر اپنے اپنے دھندوں میں مصروف رہتے تھے۔ میں ایک سرکاری دفتر میں ملازم ہو گیا تھا۔ بس گاہے گاہے مل بیٹھنا ہوتا تھا۔ وہ شام کے وقت انارکلی کے ایک ریستوران میں بیٹھتا تھا۔ وہیں کبھی کبھی میں بھی چلا جایا کرتا تھا۔ ملاقات کو زیادہ دن گزر جاتے تو ہم میں سے کوئی ایک دوسرے کے دفتر کا رخ کرتے۔ لیکن جب بھی ملتے دیر تک باتیں کرتے رہتے خاص طور پر فنون لطیفہ اور سیاست کے موضوع پر۔ میں شروع سے ہی اس کی غیر معمولی ذہانت کا قائل ہو گیا تھا۔ ناقدانہ بصیرت، زندگی کے بارے میں صحت مند اپروچ، ملکی اور عالمی سیاست پر گہری نظر۔ وہ ان تمام خصوصیات سے مالا مال تھا۔ میں نے اس کی ذات میں پنہاں مستقبل کے ایک "بڑے آدمی" کی جھلک بار ہا دیکھی تھی۔

اس کی خوبیوں، صلاحیتوں اور خلوص و انس کا رس قطرہ قطرہ موتی بن کر میرے ذہن و دل کی سیپیوں میں گرتا رہا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کے لیے اعتماد میں کچھ اضافہ ہو گیا۔ لیکن اپنے مخصوص نجی معاملات اب بھی ہم نے ایک دوسرے سے پوشیدہ رکھے تھے۔ اتنا فاصلہ اب بھی ہمارے درمیان قائم تھا۔ ہمیں ایک دوسرے کے گھروں کا بھی علم نہیں تھا سوائے اس کے کہ وہ میرے اور میں اس کے محلے کا نام جانتا تھا۔ ایسا شاید مصروفیات اور لاابالی پن کے باعث ہوا تھا یا پھر اس لیے کہ ہم نے اس کی ضرورت ہی محسوس

نہ کی تھی۔ یوں طویل مدت تک میں بھی اس کے گھر نہ جا سکا۔ اس کے والد ایک کامیاب ایڈووکیٹ تھے میں اس کے خاندان کے بارے میں بس اتنا ہی جانتا تھا۔

پھر یوں ہوا کہ ایک دن وہ اچانک مجھے بتائے بغیر، ملے بغیر کراچی چلا گیا۔ جب دس پندرہ دن تک اس کی خبر نہ ملی تو میں ایک دوست سے اس کے گھر کا پتہ معلوم کر کے وہاں پہنچ گیا۔ اس کے چھوٹے بھائی نے جو بہت سیدھا سادا تھا مجھے بتایا کہ تنویر ناراض ہو کر گھر چھوڑ گیا تھا۔ لیکن وہ وجہ نہ بتا سکا۔ وہ بہت چھوٹا تھا اور شاید اس واقعے کی تفصیل سے ناواقف۔

مجھے تنویر سے ایسی امید ہرگز نہ تھی۔ افسوس کے ساتھ اس بات کا مجھے بے حد ملال تھا کہ وہ مجھے بالکل ہی نظر انداز کر گیا تھا۔ پھر میں نے خود کو سمجھا بجھا لیا کہ یقیناً کوئی غیر معمولی دباؤ ہوگا اور وقت کی کمی۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ مجھ سے ملے بغیر چلا جائے۔

کئی ماہ بعد وہ میرے دفتر میں پہنچا تو میں حیران رہ گیا میرے استفسار پر کہنے لگا "بس یار بہت بور ہو گیا تھا سوچا کچھ دن ماحول ہی بدل لیا جائے۔ ایک صاحب کے ساتھ فوراً پروگرام بن گیا۔" میں نے مزید کریدنے کی کوشش نہیں کی۔ مجھے بخوبی اندازہ تھا کہ وہ کوئی گھریلو بات تھی جسے وہ راز میں رکھنا چاہتا تھا۔ کچھ دیر وہ اپنی کراچی کی مصروفیات کے بارے میں بتاتا رہا۔ اب کی بار اس نے کلفٹن، کیماڑی اور ہاکس بے کی بھی خوب سیر کی تھی۔ لیکن میں نے بھانپ لیا تھا کہ وہ کوئی انتہائی ناخوشگوار واقعہ تھا جس کے زیر اثر وہ کراچی فرار ہوا تھا۔

پھر جلد جلد ہماری کئی ملاقاتیں ہوئیں اور میں نے دیکھا کہ وہ نارمل ہو چکا تھا۔

مدت کا تعین تو نہیں کیا جا سکتا اس لیے کہ اپنی یادداشت پر مجھے بھروسہ نہیں رہا۔ اس لیے میں کسی ضابطے یا تسلسل سے اس سرگزشت کو بیان نہیں کر سکتا۔ غالباً انیس بیس برسوں کے دوران تنویر کی زندگی میں خاصے صبر آزما اور ہمت شکن مرحلے آئے۔ اس کی پہلی بیوی قلیل عرصے کی رفاقت کے بعد ایک ایکسی ڈینٹ کا شکار ہو گئی۔ یہ اس کی محبت کی شادی تھی۔ اسے اس محبت کا کوئی پھل نہیں ملا۔ باپ کا انتقال ہوا۔ اور اس کے کاندھوں پر کئی اہم ذمہ داریوں کا بوجھ آن پڑا۔ یہ دوسری بات تھی کہ وہ اس بوجھ کو خاطر خواہ طور پر اٹھا نہیں پا رہا تھا۔ ساحرہ سے دوسری لو میرج کے کچھ عرصے کے بعد گھر میں ناچاقی۔ روز روز کے جھگڑے ٹنٹے جن کے باعث وہ ساحرہ کو لے کر ایک کرایہ کے مکان میں جا بسا۔ میں اکثر اس کے ہاں چلا جاتا تھا۔ یہ تین کمروں کا مکان تھا جسے ساحرہ نے بڑے سلیقے سے سجایا ہوا تھا۔ ساحرہ میری بہت عزت کرتی تھی۔ اور مجھے خاطر مدارات سے نوازتی رہتی تھی۔ تنویر ساحرہ کے ساتھ خوشگوار زندگی گزار رہا تھا۔ ان کے ہاں بیٹا پیدا ہوا لیکن کچھ عرصے کے بعد تنویر کی ملازمت جاتی رہی۔ اس کے باوجود میں نے تنویر کو کبھی پریشان یا مایوس نہیں دیکھا۔ البتہ یوں ضرور ہوا کہ وہ اس اچھی سچویشن والے مکان کو چھوڑ کر وہ ایک چھوٹے سے کوارٹر نما مکان میں منتقل ہو گیا۔ میں حسب معمول اس مکان میں بھی کبھی کبھار جاتا رہا۔ میں نے وہاں ایک دوسری ساحرہ دیکھی۔ وہ اس چھوٹے سے مکان میں خود کو اکھڑا اکھڑا محسوس کر رہی تھی۔ غلیظ اور تنگ گلیاں، آسائشوں سے محروم ہو جانا، شاید وہ یہ سب کچھ برداشت نہیں کر پا رہی تھی۔ ان ہی دنوں، دوبئی سے اس کا کوئی کزن آیا ہوا تھا جو اپنی بیوی کو طلاق دینے کے بعد اپنا گھر بسانے کی فکر میں تھا اور ساحرہ میں بڑی دلچسپی لے رہا تھا۔ ساحرہ دغابازی کا لبادہ اوڑھے تنویر کو اس دور آزمائش میں چھوڑ کر میکے چلی گئی۔ وہ کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح واپس نہیں آئی۔ اس نے تنویر سے طلاق حاصل کی اور اپنے کزن کی رفیقۂ حیات بن کر دوبئی چلی گئی۔ تنویر کو بہر حال ماں کی آغوش میں پناہ ملی۔ اس کا بڑا بھائی اس پر پہلے کی طرح مہربان تھا۔ اپنے معصوم بیٹے کی جدائی کے باوجود میں نے تنویر کو کبھی دل برداشتہ نہیں دیکھا تھا۔ وہ ہر حال میں مست رہتا تھا اور حالات پر قابو پا لیا کرتا تھا۔ دراصل وہ بلا کا رجائیت پرست واقع ہوا تھا۔ اعتماد کی قوت، مضبوط اعصاب اور غیر معمولی حوصلے نے اسے اپنی راہ سے کبھی نہ بھٹکنے دیا تھا۔ وہ زندگی اور اس کی رعنائیوں کا قائل تھا اور اس کے گلشن کے مہکتے ہوئے پھولوں کا ایک ایک بوند رس نچوڑنے کا عزم رکھتا تھا۔

یوں تو لاہور میں میری اور اس کی رفاقت ستائیس برسوں پر محیط ہے لیکن ہم دونوں بے حد سست رفتاری کے ساتھ قریب تر ہوتے تھے۔

میں کئی بار شدید یاسیت اور گھٹن کا شکار ہو کر زندگی سے کچھ اس طرح بیزار ہوا کہ میرے ہر طرف اندھیروں کی دبیز چادر تن گئی۔ لیکن ہر بار اس نے میرے لیے روشنی کے دریچے کھول دیے۔ مجھے گمراہیوں کے اندھے غار میں گرنے سے بچایا اور ذوق جمال دے کر میری فہم و ادراک کے آبگینے کو صیقل کر دیا۔ اور مجھے زندگی کی طرف کھینچ لایا۔ وہ میرا انتہائی پیارا اور مخلص دوست۔ وہ جو محرومیوں اور ناآسودگی کے باوجود مطمئن سا نظر آتا تھا۔ اس کے روزمرہ کے معمولات میں میں نے کوئی فرق نہیں دیکھا۔ صبح دس گیارہ بجے گھر سے نکل جانا۔ دوپہر کو کسی ہوٹل میں روٹی کھانا۔ سہ پہر کو انارکلی کے ایک مخصوص ریستوران میں چائے پینا۔ اور شام کو مختلف بازاروں سے گزر کر حسن کی رنگینیوں میں جذب ہو جانا۔ شام کے اس پروگرام میں کبھی کبھار میں بھی اس کا شریک سفر ہو جاتا تھا۔ رات گئے تک وہ یوں ہی بلا مقصد گھومتا پھرتا دوستوں سے ملتا ملاتا گھر پہنچتا تھا۔

اس سانحۂ شیفتگی کے چار پانچ ماہ قبل بھی وہ دس بارہ دن کے لیے کراچی آیا تھا۔ وہ اپنے کسی واقف کار کے ذریعے ان دنوں سعودی عرب جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ وہ سوسائٹی میں اپنے ایک دیرینہ دوست کے گھر مقیم تھا جہاں وہ ہر بار ٹھہرا کرتا تھا۔ میرے پاس رہائش کا معقول انتظام نہیں تھا ورنہ چند یوم وہ میرے ہاں بھی ضرور قیام کرتا۔ میں ابھی تک صحیح معنوں میں کراچی میں سیٹ نہ ہو سکا تھا۔

ایک شام وہ میری جائے رہائش پر آیا تو اس کے چہرے پر ایک تازگی اور وارفتگی رقصاں تھی۔ بیٹھتے ہی کہنے لگا "خان جی کیا یاد کروگے آج تمہارے لیے ایک نئی خبر بلکہ تصویری خبر لایا ہوں"۔ یہ اس کی عادت تھی، وہ مجھے کئی کئی انداز اور کئی کئی خطابوں سے نوازا کرتا۔ کبھی خان جی تو کبھی شہاب بھائی، کبھی پیارے، کبھی سرکار تو کبھی یار کبھی تم تو کبھی آپ، جناب اور مولانا۔ میں نے پوچھا "کیوں، کیا بات بن گئی ہے"

"بولا "نہیں پیارے وہ بات تو نہیں ایک اور بات بن گئی ہے"۔

"اچھا، مبارک ہو"

"یہ بھی خوب رہی مولانا۔ بات معلوم نہیں اور دی جا رہی ہے مبارک باد"

"اچھا یار میں پہلے چائے کا آرڈر دے آؤں پھر بات ہوگی اطمینان سے"

میں واپس آیا تو وہ مسہری پر لیٹا ہوا بڑے موڈ میں سگریٹ کا دھواں اڑا رہا تھا۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد وہ بولا "یہ کوئی تیس برس قبل کی بات ہے۔ لیکن تم پہلے ایک چیز دیکھ لو" وہ بیٹھ گیا۔ اس نے اپنا بریف کیس کھولا۔ اس میں سے اس نے ایک فوٹو نکال کر میرے سامنے بڑھا دیا۔ میں نے دیکھا وہ ایک لڑکی کا فوٹو تھا۔ بلیک اینڈ وہائٹ لاہور میں بھی اس نے ایک دو لڑکیوں کی تصویریں مجھے دکھائی تھیں جن سے اس کے عشق چل رہے تھے۔ ان میں سے ایک لڑکی ملک سے باہر جا چکی تھی۔ میں فوراً ہی معاملے کی تہہ تک پہنچ گیا

"تو یہ ہے تمہاری نئی دریافت۔ بہت خوب"

"نہیں پیارے، یہ ذرا دوسرے رنگ کی بات ہے"۔

"مثلاً"

"مثلاً یہ کہ یہ تصویر جو تم دیکھ رہے ہو تقریباً تیس برس پرانی ہے، ان دنوں مہتاب گوال منڈی میں رہتی تھی۔ اس کے والد معمولی حیثیت کے آدمی تھے۔ وہ میرے والد کے گہرے دوست تھے۔ ہمارے تعلقات کی نوعیت ان سے رشتہ داری جیسی تھی۔ میں بھی ان کے گھر جایا کرتا تھا۔ مہتاب کی ماں بڑی انوکھی شخصیت کی عورت ہے۔ وہ مجھے بے حد چاہتی ہے۔ اس نے ہمارے عشق کو پروان چڑھانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ لیکن جب شادی کی بات چھڑی اور میں نے امی کو بتایا کہ میں مہتاب کو اپنانا چاہتا ہوں تو ہزاروں سال پرانی کہانی ایک بار پھر دوہرائی گئی۔"

اس دوران میری بیٹی چائے لے آئی۔ تنویر نے اس سے چند باتیں کیں اور وہ چلی گئی۔ تنویر نے دو چار گھونٹ گرم گرم چائے کے حلق سے اتارے اور نیم دراز ہو گیا۔ بولا "تو خان جی اس بے مدفرسودہ کہانی کا جب میں ایک کردار بنا تو مجھے اس کی اذیت کا احساس ہوا۔ میرے والد نے واشگاف الفاظ میں کہہ دیا کہ دوستی اپنی جگہ لیکن وہ کسی ایسے گھرانے کی بیٹی کو بہو بنا کر ہرگز اپنے گھر میں نہیں لا سکتے جو غربت کی چکی میں پس رہا ہو اور لڑکی صرف میٹرک پاس ہو۔ میں گھبرا کر کراچی چلا گیا۔ شکستہ دل تھا اور کیا کر سکتا تھا۔ فرار کا ایک یہی راستہ سجھائی دیا مجھے"۔

"وہی نا جب تم بور ہو کر ماحول بدلنے گئے تھے، مجھ سے ملے بغیر" میں نے پوچھا۔

"ہاں، یہ وہی واقعہ ہے۔ تم بھولے نہیں ابھی تک" اس نے لگاتار کئی گھونٹ بھر کر چائے کی پیالی خالی کر دی اور لیٹ گیا۔ بولا "مہتاب کے والد کو دوستی بہت عزیز تھی۔ وہ جانتے تھے کہ جب تک مہتاب کی شادی نہیں کر دی جاتی کوئی نہ کوئی ناخوشگوار بات پیدا ہو سکتی ہے لہٰذا انھوں نے مہتاب کو وداع کرنے میں دیر نہ کی۔ اور یوں وہ راولپنڈی میں جا بسی۔ کچھ عرصے کے بعد یہ خاندان جو اب صرف دو بھائیوں اور ماں پر مشتمل تھا کراچی شفٹ ہو گیا"۔

میں نے پوچھا "لیکن یہ تیس برس پہلے کی تصویر..."

"بتاتا ہوں، صبر سے کام لو" اس نے بات کاٹتے ہوئے کہا "میں نے تیس برسوں سے مہتاب کو نہیں دیکھا۔ میرا اس سے خط و کتابت کا بھی کبھی رابطہ نہیں ہوا۔ اس کے باپ کا انتقال ہو چکا ہے۔ اس کی ماں جسے میں خالہ کہتا ہوں اپنے بیٹوں کے ساتھ فیڈرل بی ایریا میں رہتی ہے۔ میں کل وہاں گیا تھا۔ خالہ نے مجھے بتایا کہ مہتاب کا بڑا بیٹا میڈیکل کالج میں زیر تعلیم ہے۔ دو بیٹیاں ہیں جو کالج میں پڑھتی ہیں۔ اس نے تصویروں کا البم بھی دکھایا۔ میں نے اس پرانی تصویر کی فرمائش کی۔ خالہ نے مجھے یہ تصویر دے دی۔ اس نے کہا اگر مہتاب سے ملنا چاہو تو شکیل کی شادی کے موقع پر کراچی آ جانا۔ مہتاب سے اتنی طویل مدت کے بعد ملنے کا تصور مجھے ابھی سے سرشار کیے دے رہا ہے۔ بات کچھ پلے پڑی سرکار کے۔ بھائی میرے زندگی کا صحیح لطف اٹھانا چاہتے ہو تو ایک آدھ عشق ضرور کر ڈالو جوان

ہو جاؤ گے۔"

یہ بات وہ مجھ سے کتنی ہی بار کہہ چکا تھا۔ میں نے پوچھا "تو کیا تمہیں ان تیس برسوں میں مہتاب یاد آتی رہی ہے، تم نے کبھی ذکر نہیں کیا؟"

وہ بولا "کمال کرتے ہو پیارے، مجھے یاد کرنے کی فرصت تھی؟" پھر اس نے نیرو بی سے آیا ہوا اپنی ایک اور محبوبہ سلیمہ کا خط دکھایا۔ ایسے کئی خطوط وہ مجھے پہلے بھی پڑھوا چکا تھا۔ میں نے تحریر پڑھی۔ شروع سے آخر تک جذباتی۔ آخر میں لکھا تھا "تمہاری سلیمہ"۔ وہ چہک کر بولا "جی مولانا، اپنے تو یہی ٹھاٹ ہیں"۔ اس نے مجھے وہ خط بھی دکھایا جو اس نے سلیمہ کو لکھا تھا اور اسی دن پوسٹ کرنے والا تھا۔ نثر پر نظم کا گمان ہو رہا تھا۔ بس ایک رومانی نظم تھی۔ ایک دم اس نے موضوع بدل دیا "لیکن تم کس جہان میں رہتے ہو" اور جب میں نے بتایا کہ ایک سانولی سلونی معمولی سی لڑکی نے میرے دل میں گھر کر لیا ہے تو وہ خوشی سے اچھل پڑا "یہ ہوئی نا بات۔ تو ثابت ہوا کہ بیسویں صدی میں بھی معجزہ رونما ہو سکتا ہے۔ جیو پیارے۔"

دوسرے دن وہ لاہور کے لیے سوار ہو گیا۔

چند ماہ بعد جب وہ مجھ سے ملا تو اس نے بتایا کہ وہ ملک سے باہر جانے کی ایک اور کوشش کرنا چاہتا ہے۔ اس کا ایک دوست نیویارک جا رہا تھا جس سے وہ معاملات طے کرنا چاہتا تھا۔ کہنے لگا "سوچتا ہوں چلا ہی جاؤں تو اچھا ہے کچھ دلدر دور ہو جائیں"۔ میں جانتا تھا اس کا بڑا بھائی بینک میں افسر تھا جو سارے کنبے کی کفالت کر رہا تھا۔ اور تنویر بیکار تھا۔ کبھی کبھار کوئی معقول ٹیوشن مل جاتا تو اس کا کچھ سلسلہ چل جاتا ورنہ بے کاری کا تو شاید وہ عادی ہو چکا تھا۔ جب بھی وہ کراچی آتا دوسرے تیسرے دن مجھ سے ملنے ضرور آتا لیکن اس بار پہلی ملاقات کے بعد وعدے کے باوجود کئی دن غائب رہا۔ مجھے تشویش سی ہو گئی۔ ان دنوں میں اپنی اور اس کی زندگیوں کا ایک تفصیلی جائزہ لے رہا تھا۔ رات کو دیر تک تمام پہلوؤں پر غور و فکر کرتا رہتا تھا۔ میں اس سے دریافت کرنا چاہتا تھا کہ آخر کیا وجہ ہے کہ اتنے زیرک اور تعلیم یافتہ ہونے اور سوجھ بوجھ رکھنے کے باوجود ہماری زندگیاں ناکامیوں اور محرومیوں کے نرغے میں کیوں ہیں اور ان ناکامیوں میں حالات کا زیادہ ہاتھ ہے یا ہماری ideologies کا قصور ہے۔ میں نے تو خیر کچھ نہ کچھ کر ہی دکھایا ہے، میرا مطلب ہے شوہر، باپ اور بھائی کی حیثیت میں اپنی ذمہ داریاں نبھا رہا ہوں۔ مگر اس نے کیا کیا ہے، اس کی زندگی میں کیا ہے اب، وہ تو بس یوں ہی ادھر ادھر ڈولتا پھر رہا ہے۔ میں پوچھنا چاہتا تھا کہ آخر اس نے اس زاویے سے بھی کبھی سوچا ہے۔ میں کئی دن تک بڑی بے چینی کے ساتھ اس کا انتظار کرتا رہا۔ میں اس بار اس سے بہت کچھ کہنا اور بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ ملک چھوڑ کر نہیں جائے گا۔ یوں ہی بس ارادے ہی ارادے میں وقت گزار دے گا۔

ایک شام دفتر سے واپسی پر میں نے دیکھا وہ میرے مکان کے گیٹ کے قریب ایستادہ آم کے گھنے درخت کے تنے سے ٹیک لگائے کھڑا اپنی سوچوں میں گم۔ سگریٹ پی رہا تھا۔ میں نزدیک پہنچا تو میں نے اس کا ستا ہوا ماند چہرہ دیکھا "ارے اوپر کیوں نہیں بیٹھ گئے، یہاں کب سے کھڑے ہو؟"

اس نے دھیمی نحیف سی آواز میں کہا "بس یار ابھی ابھی پہنچا ہوں۔ بھابی نے تو کہلوایا تھا بیٹھنے کو لیکن میں یہاں کچھ بہتر محسوس کر رہا تھا۔ آج تم نہ ملتے تو بہت برا ہوتا۔"

"خیریت تو ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اوپر چلو تو بتاؤں کیا قیامت گزری ہے مجھ پر ان چار پانچ دنوں میں۔"

ہم دونوں اوپر جا کر صوفے پر بیٹھ گئے۔ آج میں نے پہلی بار اسے بے حد رنجیدہ اور کبیدہ خاطر دیکھا تھا۔ جیسے اس کے اندر بہت کچھ ٹوٹ پھوٹ ہو گئی ہو۔ کتنی ہی دیر وہ خاموشی کی زبان میں مجھے اپنی بپتا سناتا رہا۔ میں اس سے کچھ پوچھنے کی جرأت نہ کر پا رہا تھا۔ لگتا تھا ایک ذرا سی ٹھیس لگتے ہی وہ بکھر جائے گا۔ اس نے بڑی بے چارگی کے ساتھ مجھے دیکھا اور رندھی ہوئی آواز میں بولا "شہاب کیا خوشیاں اتنی ظالم بھی ہو سکتی ہیں کہ چین اور آرام کو ملیا میٹ کر ڈالیں۔ چار دن اور چار راتیں گزر چکی ہیں مجھے روتے ہوئے۔ سسکتے ہوئے، جاگتے ہوئے" اس کے اندر کا دکھ آنکھوں کے راستے بہنا شروع ہو گیا۔ ایکا ایکی وہ اٹھا اور دیوار سے ٹیک لگا کر بلک بلک کر رونے لگا۔ "یہ کیسی روشنی ہے شہاب جس میں مجھے کچھ سجھائی نہیں دے رہا، یہ کیسی خوشی ہے جس نے مجھے موم کی طرح پگھلا ڈالا ہے میرا تو ان تین چار دنوں میں سب کچھ ہی تہہ و بالا ہو کر رہ گیا ہے۔"

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کروں۔ کس طرح اس کو تسلی دوں جب کہ ابھی مجھے اس سانحہ کا علم نہیں جس نے اسے گھائل کر ڈالا تھا۔ مجھے تو اس منظر نے ہی حیران اور پریشان کر ڈالا تھا کہ تنویر میرے روبرو گریہ وزاری بھی کر سکتا ہے۔ میں تو ایک خواب کی دہلیز پر سہما سہما بیٹھا تھا۔

چائے آئی۔ وہ منہ موڑے کھڑا رہا۔ اس نے ادھر دیکھا تک نہیں۔ میری بیٹی ٹرے رکھ کر چلی گئی۔ میں نے کہا چائے تو پی لو" اس

نے رومال سے چہرے کو صاف کیا اور مجھے بے چارگی سے دیکھنے لگا۔ میرا دل ڈوب کر رہ گیا۔ میں نے پھر کہا "چائے پی لو ٹھنڈی ہو جائے گی" وہ لڑکھڑاتا ہوا سا آیا اور دھم سے صوفے پر بیٹھ گیا۔ بھاپ اڑاتی چائے میں نہ جانے وہ کیا دیکھ رہا تھا۔ اس نے چائے پلیٹ میں انڈیل کر جلدی جلدی حلق میں انڈیل کر پیالی خالی کر دی۔ ایک بسکٹ تک نہیں کھایا حالانکہ میں نے اس کے پسندیدہ بسکٹ منگوائے تھے۔ میں نے اصرار کیا تو بولا "بھوک ہی مر گئی ہے یار۔ کھانا تک تو کھایا نہیں جا رہا۔" اب مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ "آخر ہوا کیا ہے؟" اس نے آنکھوں اور چہرے کو رومال سے مزید خشک کیا اور بولا "اس دن تم سے ملنے کے بعد میں سیدھا خالہ کے گھر چلا گیا تھا۔ میں اس گھر میں بغیر بیل بجائے چلا جاتا ہوں۔ جب میں آنگن میں پہنچا تو میں نے دیکھا مہتاب پانی کی ٹنکی کے پاس بیٹھی پاؤں دھو رہی تھی۔ اچانک میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ مہتاب نے بھی تیز سانسوں کے ساتھ مسکرانے کی کوشش کی۔ اس کا چہرہ کئی رنگوں کی لپیٹ میں آ گیا۔ اس کے خدوخال پہلے جیسے ہی تھے۔ کوئی خاص تبدیلی رونما نہیں ہوئی تھی۔ البتہ سر کے بالوں میں کچھ کچھ سفیدی آ گئی تھی۔ میں کمرے میں چلا گیا خالہ کے پاس۔ خالہ جو اس گھر میں ہمارے عشق کی واحد رازدار ہے ایک عظیم عورت ہے۔ مہتاب آئی تو خالہ دو چار باتیں کر کے ہم دونوں کو تنہائی میں باتیں کرنے کا موقع دینے کے لیے کام کے بہانے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ ہم دونوں کے پاس کہنے کے بہت کچھ تھا لیکن زبان سے کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ ہمارے درمیان صرف خاموشی کا رابطہ تھا۔ ہم آنکھوں سے، سانسوں کے اتار چڑھاؤ اور چہرے پر آتے جاتے رنگوں کے ذریعے ایک دوسرے سے وہ کچھ کہہ رہے تھے جس کا اظہار الفاظ میں ممکن ہی نہیں۔ پھر اس نے میرے گھر والوں کی خیریت دریافت کی۔ میرے بھائیوں اور بہنوں کے بارے میں کچھ سوالات کیے۔ وہ ٹک کر نہیں بیٹھ پا رہی تھی۔ ایک بوکھلاہٹ سوار تھی اس پر۔ تھوڑی ہی دیر میں اس نے مجھے اپنے ہاتھ سے چائے تیار کر کے تین چار پیالیاں پلا ڈالیں۔ میں اس سے نظریں چرا رہا تھا۔ احساس جرم مجھ پر حاوی تھا۔ میرا خیال تھا وہ مجھے معاف نہیں کرے گی۔ لیکن ایسا نہیں تھا۔ میں نے جب سگریٹ سلگایا تو اس نے تیزی سے جھپٹ کر اسے پھینک دیا۔ بولی آپ سگریٹ ہرگز نہیں پئیں گے۔ اس کا لہجہ تحکمانہ تھا۔ اپنائیت کے جذبے سے معمور جس نے میرا کلیجہ کاٹ کر رکھ دیا۔ پھر وہ مشفقانہ اور ہمدردانہ انداز میں بولی آپ کب تک، ایسی زندگی گزارتے رہیں گے۔ میں نے پوچھا کیسی زندگی۔ بولی، یہی بے مقصد، بے رنگ، ویران زندگی۔ اور میں جو اندر ہی اندر رو رہا تھا باہر مسکرانے کی کوشش کرنے لگا۔ بولا کچھ نہیں۔ بولتا بھی کیا۔ مہتاب نے اپنی یلغار جاری رکھی۔ کہنے لگی اپنا گھر کیوں نہیں بسا لیتے۔ لیکن اب تو ہم آپ کے لیے کچھ کر بھی نہیں سکتے آپ پاکستان سے باہر جا رہے ہیں۔ شہاب مجھے لگا میں زمین میں دھنستا چلا جا رہا ہوں۔ میں کس قدر کنگال تھا شہاب کہنے کے لیے بھی تو میرے پاس کچھ نہ تھا۔ میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ اسی وقت خالہ دروازے میں نمودار ہوئی۔ بولی مہتاب ذرا تنویر کے لیے کھانا تو پکا دے۔ میں بولا۔ کل کھا لوں گا لیکن مہتاب نے کہا کھانا تو اب آپ کھا کر ہی جائیں گے۔ لڑکیاں بھی بازار سے آنے والی ہی ہوں گی۔ میں نے کہا اچھا تو پھر روٹیاں بازار سے آ جائیں گی۔ کہنے لگی تمہیں روٹیاں بازار کی کھلاؤں گی ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ تمہارے لیے اپنے ہاتھوں سے پکاؤں گی۔ ایک خنجر میرے دل میں پیوست ہو گیا۔"

تنویر نہ جانے کس گپھا میں اتر گیا۔ اور چند منٹ یوں ہی گزر گئے۔ بے صدا۔ بے آواز۔

معاً جادۂ خاموشی میں اس کی آواز کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ "شہاب میں نے کھانا کھایا۔ کتنا لذیذ تھا یہ کھانا کیسے بیان کروں۔ مہتاب کی بیٹیاں آ گئیں۔ ان سے تعارف ہوا۔ یہ کرن ہے اور یہ نینا۔ پھر وہ بیٹیوں سے بولی اور یہ تمہارے انکل اور میرے تنویر بھائی... کرن اور نینا مہتاب کی ہدایت پر مجھے بس اسٹاپ تک چھوڑنے آئیں۔ میں اس رات دیر تک جاگتا رہا اور روتا رہا۔ ایک شعلہ سا تھا جو مجھے اندر ہی اندر جھلسائے دے رہا تھا۔" تنویر نے ایک گہرا سانس لیا "کل میں پھر وہاں گیا تھا۔ میں نے کچھ تحفے بھی خریدے تھے کرن اور نینا کے لیے۔ مہتاب کا وہی حال تھا۔ وہی والہانہ رویہ، وہی بے قراری، وہی بدحواسی اور بوکھلاہٹ۔ بیٹیوں کی موجودگی میں بھی اس نے مجھے اپنے ہاتھ سے چائے تیار کر کے پلائی۔ لڑکیوں سے کہنے لگی تم خوش نصیب ہو تمہارے لیے یہ کچھ لائے، تمہیں کچھ دیا انھوں نے۔ سنبھال کر رکھنا ان تحفوں کو۔ بے حد قیمتی ہیں۔ کچھ دیر کی تنہائی میں میں صرف اتنا ہی کہہ سکا مہتاب اپنا پتہ لکھ دو ورنہ شاید تمہیں یاد نہ رہا ہو۔ وہ دھیرے سے بولی کیا کروں گی میں پتے کا۔ میں نے بات بنائی تمہارا بیٹا لاہور میں زیر تعلیم ہے اسے کوئی کام پڑ سکتا ہے۔ اس نے میرا دل رکھنے کے لیے میرا پتہ رکھ لیا" تنویر نے ایک طویل سانس لیا "ایک عجیب صدمہ ہے یار جو میرے دل کو کھائے جا رہا ہے۔ شہاب میں نے محسوس کیا ہے کہ میں اسی شدت سے مہتاب کی محبت میں گرفتار ہوں۔ مجھے وہ اتنی ہی حسین، اتنی ہی پیاری، اتنی ہی اپنی لگی جتنی تیس برس قبل۔ یہ تیس برسوں کا طویل عرصہ میری محبت کا کچھ بھی تو نہ بگاڑ سکا" تنویر کی آواز ایک درد، ایک کرب میں ڈوبی ہوئی تھی۔ "وہ میری ہے، وہ میری نہیں ہے۔ کیا تیس برس بعد بھی محبت نہیں مر سکتی۔ حسن لازوال ہوتا ہے۔ شہاب مجھے تو وہ پہلے سے بھی زیادہ دلآویز اور خوب صورت لگی ہے۔ میں سمجھتا ہوں مرنے کے لیے یہ بہترین موقع ہے۔ شہاب کیسی قیامت کی رات تھی۔ ایک حشر برپا تھا۔ میں کیا کروں شہاب کیا کروں" تنویر نے اپنی پیشانی پر لگاتار مکوں کی کئی ضربیں لگائیں "کسی طرح صبر نہیں آ رہا۔ یہ کیسی بے کلی ہے" ایکا ایکی تنویر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

وہ ردائے غم اوڑھے ہوئے سسک سسک کر گریہ کناں تھا اور اس کے تراشا کے رنگ میں کھنڈے ہوئے چہرے پر دکھوں کی برشگال ہو رہی تھی۔ اور میں اپنے ہمدم دیرینہ کی حالت زار پر دل ہی دل میں افسوس کر رہا تھا۔ وہ جو زندگی کے گہرے سمندر کا شناور تھا آج مجھے ڈوبتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ مجھے جینے کی راہ دکھانے والا، ہر حال میں مگن رہنے والا، رزم گاہ حیات کا ایک بہادر سپاہی، آج میرے روبرو اشکبار تھا اور موت کی خواہش میں مبتلا ہو کر کس قدر بے دست و پا ہو گیا تھا۔ یہ کیسا خواب ہے۔ یہ کیسی حقیقت ہے۔

اچانک اس نے میز پر ایک زوردار مکا مارا" بتاؤ شہاب اب میں کیا کروں۔ کیا کروں۔"

"میرا خیال ہے تم مزید ملاقات سے گریز کرو اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔"

اس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا جیسے اس نے میری بات سنی ہی نہ ہو۔

ایک تیز رفتار بس جھٹکے کے ساتھ میرے قریب رکی تو مجھے پتا چلا کہ میں بس اسٹاپ پر کھڑا ہوں اور تنویر جا چکا ہے۔

اس غبار آلود افسردہ سی شام کو میں گھر آ کر کافی دیر تک تنہا لیٹا رہا اور اپنے بے حد پیارے دوست کے اس عظیم غم کو کچھ اس شدت سے محسوس کرتا رہا گویا یہ سب کچھ مجھ پر بیتا ہو۔

ڈھائی تین ماہ تک مجھے اس کا کوئی خط نہیں ملا۔ اس نے میرے خطوں کا بھی جواب نہیں دیا۔ یوں عالم بے خبری میں میری تشویش روز بروز شدت اختیار کرتی چلی گئی۔ بعض اوقات تو میں یوں سہم کر رہ جاتا جیسے کوئی ٹائم بم بس پھٹنے ہی والا ہو۔ جی چاہتا فوراً اس کے پاس پہنچوں۔ برسوں قبل میرے ایک دوست نے خود کو ریل کی پٹریوں پر لٹا کر اپنے جسم کے دو ٹکڑے کرا لیے تھے۔ تو تنویر بھی... "میں سمجھتا ہوں مرنے کے لیے یہ بہترین موقع ہے۔ بہترین موقعہ ہے۔ بہترین موقعہ ہے" ایک جانی پہچانی آواز کی بازگشت مجھے دہلا کر رکھ دیتی۔ ہراساں کر دیتی۔

لیکن اب جو مجھے اس کا خط ملا ہے تو میرے جذبات و احساسات اس قدر گڈمڈ ہو گئے ہیں کہ سمجھ نہیں پا رہا ہوں کہ اپنا اس وقت کا تاثر کن الفاظ میں بیان کروں۔ بس اتنا ہی بتا سکتا ہوں کہ اس تحریر کو وقفے وقفے کے بعد میں کئی بار پڑھ چکا ہوں۔

شہاب جی!

میں کچھ عرصے خاصی افراتفری کا شکار رہا۔ لیکن وہ جو ایک زبردست ریلا آیا تھا خیریت سے گزر گیا۔ تم جانتے ہو میں نے ہمیشہ مشکل سے مشکل مرحلے پر کس طرح قابو پایا ہے۔

میں نے فی الحال پاکستان سے باہر جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا ہے۔ اپنا ایک دفتر قائم کر لیا ہے۔ پراپرٹی ڈیلنگ کا۔ اسرار صاحب کے مکان کا وہ کمرہ جو سڑک کی جانب کھلتا ہے اس مقصد کے لیے استعمال ہو رہا ہے۔ لیکن اب سوچ رہا ہوں کہ پرانی انار کلی یا اس کے آس پاس کوئی ڈھنگ کا کمرہ یا دوکان کرایہ پر مل جائے تو اچھا رہے گا۔ کوشش بہرحال جاری ہیں۔ دفتر میں یار لوگوں کی خوب بیٹھک رہتی ہے۔ تم بہت یاد آتے ہو۔

کاروباری مصروفیت کے باوجود بازاروں کا طواف بدستور جاری ہے۔ اور صفورا سے ملاقاتوں کا سلسلہ بھی قائم ہے۔ نیروبی سے سلیمہ کا بڑا خوشبودار خط آیا ہے۔ تمہارے پڑھنے کی چیز ہے۔ جب لاہور آؤ گے تو دکھاؤں گا۔ کب تک آ رہے ہو؟ جلد آجاؤ پیارے۔ بھابی کو سلام۔ آفتاب بیٹے اور بیٹی شازیہ کو دعائیں۔

تمہارا —— تنویر

ضدی

علی باقر
۱۹ اردکشنا پورم ،جے۔ این۔ یو۔ نئی دہلی ۶۷ ۱۱۰۰

۵۵۷ الکزینڈرا روڈ۔
لندن ایس ڈبلیو ۲۹ انگلستان
۲۴ راگست ۱۹۸۸ء
پیاری سلمیٰ ، ہلو

معاف کرنا اس بار تمھیں خط لکھنے میں دیر ہوگئی حالانکہ میں نے تم سے وعدہ کر رکھا ہے کہ ہر مہینے تمھیں کم سے کم ایک خط ضرور لکھا کروں گی۔ صرف تم ہی اسکول کی سہیلی رہ گئی ہو جس سے خط و کتابت باقی ہے اور جس کو میں اپنے دل کا حال سنا سکتی ہوں۔ یہ باتیں تو میں آپا جان سے بھی نہیں کہتی۔ تمھاری ان سے ملاقات ہو تو اس خط کا ذکر نہ کرنا سلمیٰ۔

آج خدا خدا کرکے ایک بڑی ذمہ داری پوری ہوگئی۔ شاہد ابھی ابھی ابا کو اپنی کار میں لے کر گئے ہیں۔ میں فوراً ہی تمھیں خط لکھنے بیٹھ گئی۔ دیر کرتی تو بچے اسکول سے آجاتے اور ان کے لیے سینڈوچ بنانے میں لگ جاتی۔ شکر خدا کا کہ ٹی وی پر ڈیلس سیریل بند ہوگیا۔ وہ پروگرام دیکھے بنا تو میں رہ ہی نہیں سکتی تھی سلمیٰ۔ یہ سیریل جو امریکہ میں بنتے ہیں بہت شاندار ہوتے ہیں۔ بڑے بڑے گھر، لمبی لمبی کاریں، خوبصورت مرد اور حسین عورتیں اور ان کے فیشن! آدمی سب کچھ بھول جاتا ہے۔ ہم بھی کہاں لندن میں پھنس گئے۔ امریکہ چلے جاتے تو زندگی کا لطف ہی اور ہوتا۔ کبھی ملو گی تو تمھیں ڈیلس کی کہانی سناؤں گی۔ تم سوچو گی کہ سلطانہ تو ہمیشہ سے فلموں کی دیوانی ہے۔ سچ پوچھو تو سلمیٰ حیدرآباد سے نکلنے کے بعد پتہ چلا کہ زندگی ہے کہاں۔ لو باتوں باتوں میں بھٹک گئی۔

میں تو ابا کی بات سنا رہی تھی۔ کسی صورت شاہد کے ساتھ جانے کو تیار ہی نہ تھے۔ میں اور شاہد سمجھاتے سمجھاتے تھک گئے لیکن ابا کسی کی کہاں سنتے ہیں۔ ہمیشہ کی ضد۔ چلتے وقت اڑ گئے کہ پیچھے کی سیٹ پر نہیں بیٹھیں گے۔ "اس وقت سلطانہ کار میں ساتھ نہیں چل رہی ہے تو میں سامنے کی سیٹ پر کیوں نہ بیٹھوں؟ میں کوئی نوکر ہوں کیا؟" شاہد کو ایسی باتوں پر غصہ آجاتا ہے لیکن ابا سے کچھ نہیں کہتے۔ بعد میں مجھے طعنے سننے پڑتے ہیں۔ بات یہ ہے سلمیٰ کہ شاہد کار چلاتے ہیں اور میں سامنے کی سیٹ پر بیٹھ کر نقشہ دیکھتی رہتی ہوں اور راستہ بتلاتی جاتی ہوں۔ لندن اتنا بڑا شہر ہے بغیر نقشہ دیکھے تو انگریز بھی ایک جگہ سے دوسری جگہ نہیں پہنچ سکتے۔ ابا کو نقشہ دیکھنا کہاں آتا ہے۔ انھیں تو لندن آئے آٹھ برس ہوگئے مگر کسی جگہ کا نام تک یاد نہیں رہتا۔ آکسفورڈ اسٹریٹ کو ہمیشہ آکسفورڈ کہتے ہیں۔ آکسفورڈ لندن سے ساٹھ میل دور ایک شہر ہے اور آکسفورڈ اسٹریٹ لندن کی مشہور سڑک ہے جہاں بڑی بڑی دکانیں ہیں اور خلقت شاپنگ کرنے آتی ہے۔ ایک وہ زمانہ بھی تھا کہ ابا کو اقبال اور غالب، جگر اور فانی کے علاوہ گمنام شعرا کے ہزاروں شعر یاد رہتے۔ رات رات بھر بیت بازی کرتے تھے۔ کیا حافظہ تھا اور اب تو سلمیٰ جیسے انھیں ضد ہوگئی ہے۔ مجال ہے جو کوئی نیا نام، نئی بات، نئی چیز گرہ میں باندھ لیں۔ نتیجہ یہ کہ ہر بات کے لیے دوسروں کے محتاج ہیں، نہ ٹی وی کھول سکتے ہیں نہ بند کرسکتے ہیں، نہ خود کہیں آسکتے ہیں جاسکتے ہیں۔ ہر جگہ ہمارے ساتھ چلنے کو تیار۔ ماشاء اللہ اب بچے بڑے ہوگئے ہیں۔ خدا بری نظر سے بچائے کار کی پچھلی سیٹ ان تینوں سے ہی بھر جاتی ہے تو ابا کو ہم کہاں بٹھائیں۔ ساجد تو لمبا ہی لمبا ہوتا جارہا ہے اپنے نانا کی طرح۔ فاطمہ کا جسم ذرا بھاری ہے۔ ساجد اس کو بہت چھیڑتا ہے اور فیٹی فیٹی کہہ کر چڑاتا ہے۔ یہ بھی ابا کی ضد سے ہوا۔ بیٹی پیدا ہوئی تو اس کا نام فاطمہ رکھ دیا۔ سوچا ہوتا کہ لندن میں لڑکی رہے گی تو دبلی دھان پان ہونے سے رہی سلمیٰ لندن میں ہر چیز اصلی ملتی ہے اور خوراک اچھی ہوگی تو جسم تو ماشاء اللہ بھرا بھرا ہوگا ہی اور لڑکی کا نام فاطمہ ہوگا تو سب ہی فیٹی کہیں گے۔ اسکول میں بھی بچے اسے چھیڑتے ہیں۔ کیا تعجب کی بات ہے کہ فاطمہ کا دل ہی پڑھائی لکھائی سے اچاٹ ہوگیا۔ وہ تو کہتی ہے کہ ادھر سولہ برس کی ہوئی اور ادھر ہیر ڈریسنگ کا کورس کیا اور ابا کہتے ہیں کہ میری نواسی اب حجامت کیا کرے گی۔ ابا کا دقیانوسی پن تو ان کی ضد کی طرح بڑھتا ہی جارہا ہے۔ ہر بات میں خاندان کی ناک سامنے آجاتی ہے۔

یہاں کے بوڑھوں کو دیکھو سلمیٰ تو دل خوش ہوجاتا ہے۔ کیا کیا فیشن نہیں کرتے۔ دور دور کے ملکوں میں چھٹیاں منانے جاتے ہیں ناچ گانے کی محفلوں میں رہتے ہیں، فلم تھیٹر اور تماشے یہ دیکھتے ہیں اور ایک ہمارے ابا ہیں کہ پہلا دانت ٹوٹا اور وظیفے کی درخواست دے کر لندن آگئے۔ ہمارے پاس۔ میں نے تمھیں لکھا تھا نا سلمیٰ کہ چار پانچ برس پہلے جب چھوٹے چچا آئرلینڈ کسی کانفرنس میں شریک ہونے آرہے تھے تو ہمارے گھر بھی رکے تھے۔ گھر کے کسی فرد کے لیے تحفہ لانے کی توفیق نہیں ہوئی لیکن چلتے وقت کہہ گئے "سلطانہ تم نے اپنے بچوں کی دیکھ بھال کے لیے خواہ مخواہ بھائی صاحب کی نوکری چھڑوادی اور انھیں اور بھابی کو لندن بلالیا۔ وہ دونوں حیدرآباد میں کتنے مزے میں تھے۔" ان کی یہ بات سن کر مجھے بڑی تکلیف

ہوئی تھی سلمیٰ اور مرتے دم تک رہے گی۔ ابّا جان کو بھی لکھا تھا مگر ان کا خون تو جیسے سفید ہوگیا ہے۔ سلمیٰ لندن میں کوئی کمی ہے کیا بچوں کی دیکھ بھال کرنے والوں کی۔ چار پیسے پھینکو تو لائن لگ جاتی ہے خوبصورت اور جوان انگریز لڑکیوں کی۔ بچوں کی انگریزی بھی اچھی ہو جاتی ہے اور بچے ناچ واچ بھی سیکھ جاتے ہیں۔ ابا اماں نے بھلا میرے بچوں کو کیا سکھایا۔ اٹھتے بیٹھتے بس ٹوکتے ہی رہتے ہیں۔ یہ نہ کرو اور وہ نہ کرو۔ فاطمہ کے لیے اگر کسی لڑکے کا فون آگیا تو بس قیامت ہی آجاتی ہے۔ اب بچی ناک نقشہ کی اچھی ہے، ملنسار ہے، ہنستی رہتی ہے تو فون بھی آئیں گے اور دوست بھی۔ باہر بھی جائے گی۔ اب گھر میں ہاتھ پاؤں میں مہندی لگا کر بیٹھنے سے رہی۔ ان دنوں میں اور شاہد گھر دیر سے لوٹتے تھے۔ اوور ٹائم کام کرتے تھے نا۔ بس گھر پہنچتے ہی اماں اور ابا بچوں کے خلاف شکایتوں کے دفتر کھول دیتے۔ ہر وقت ہمارے بچوں کا مقابلہ حیدرآباد میں رہنے والے بچوں سے کرتے رہتے۔

اماں جب تک زندہ رہیں ابا کو بڑی شہ ملتی رہتی۔ ہندوستانی عورتیں اپنے شوہروں سے اس قدر دبی کیوں ہیں بھلا؟ دونوں کسی کونے میں بیٹھے کھسر پھسر کرتے رہتے اور کسی نہ کسی کے خلاف سازش کرتے رہتے۔ بیچارے شاہد کے پینے پر نکتہ چینی۔ بھئی اپنا گھر ہے، اپنا پیسہ ہے آپ سے مانگ تو نہیں رہے ہیں لیکن ابا اعتراض کیے بنا کہاں رہتے اور خود دن بھر میں چاہے چالیس سگریٹ پھونک ڈالیں۔ کتنی کھانسی بڑھ گئی مگر سگریٹ کم نہیں کریں گے۔ اب تو ضدی بھی ہوگئے ہیں اور سنکی بھی۔ پیکٹ میں سگریٹ گنتے رہتے ہیں۔ ایک سگریٹ نکالا اور پیکٹ پر دستخط کر دیئے کہتے ہیں کہ ماجد ان کے سگریٹ پی لیتا ہے اور جب وہ انکار کرتا ہے تو اس کو جھوٹا کہتے ہیں اور سب سے کہتے ہیں کہ ماجد کا منہ سونگھو، کپڑے سونگھو۔ چھوٹا والا اپنے نانا کو بہت چاہتا ہے جھٹ سے ماجد کے کپڑے سونگھنے پہنچ جاتا ہے اور پھر بڑے بھائی کے ہاتھ سے پٹتا بھی ہے۔ اب تم ہی کہو سلمیٰ کہ جس کمرے میں ابا دھواں دار سگریٹ پی رہے ہوں وہاں بیٹھنے والوں کے کپڑوں سے سگریٹ کے دھوئیں کی بدبو آئے گی یا نہیں۔ اور پھر اماں اور ابا دونوں کو ہی کھڑکی کھڑکیاں کھولنے سے عداوت تھی کہ سردی بہت ہو جاتی ہے۔ بھئی اب لندن میں سردی نہ ہوگی تو کیا افریقہ میں ہوگی لیکن یہاں کھڑکیاں نہ کھولو تو سالن پکنے کی بو، دال کے بگھار کی بو ہر طرف پھیل جاتی ہے اور خدا جنت نصیب کرے ہماری اماں کو سات سال تک ہمارے ساتھ رہیں اور دن میں دو بار کھانا پکائے بنا کبھی چین نہ آیا۔ ابا کو تازہ پکے ہوئے کھانوں اور گرم گرم پراٹھوں کا شوق تھا۔ ہمارے ملک کی عورتیں عادت بگاڑ دیتی ہیں اپنے مردوں کی۔ یہاں پر ٹیلی ویژن پر کوئی کہہ رہے تھے کہ عورت کو آزادی اسی دن ملتی ہے جب وہ روٹی پکانا چھوڑ دیتی ہے۔ اماں کے انتقال کے بعد سے ہمارے گھر میں چپاتی اور پراٹھے بننا ہی بند ہوگئے۔ میں تو یونانی نان کا پیکٹ لے آتی ہوں اور وہی ٹوسٹر میں گرم کر کے کھلا دیتی ہوں۔ شاہد اور بچے شوق سے کھا لیتے ہیں لیکن سلمیٰ کسی دن تم ہمارے ابا جان کو یہ نان کھاتے ہوئے دیکھو تو سوچو کہ بہت ظلم ہو رہا ہے ان کے اوپر۔ دیر تک نوالے کو سالن میں بھگو کر مسلتے رہتے ہیں۔ کہتے ہیں نان سوکھ کر کھڑ تک ہو جاتی ہے۔ کھانے میں دیر لگائیں گے تو آپ ہی سوکھ جائے گی اور کھاتے وقت ایسی چپ چپ کی آوازیں نکالتے ہیں کہ شرم آتی ہے۔ کوئی مہمان آئے تو اس سے آنکھ ملانا مشکل ہو جاتا ہے۔ بس اسی لیے میں ابا کو اب کسی کے گھر دعوت میں نہیں لے جاتی اور اپنے گھر میں بھی انھیں میز پر شاہد اور بچوں کے بعد ہی بلاتی ہوں بس وہ چھوٹا ساجد ان کے پاس بیٹھا انھیں کھاتے ہوئے دیکھتا اور مسکراتا رہتا ہے۔ شاہد کہتے ہیں کہ بچہ بُری عادتیں ابا سے سیکھے گا مگر کیا کروں سلمیٰ باپ تو آخر میرے ہی ہیں۔ خون کا رشتہ بھی بعض وقت پھانسی بن جاتا ہے۔

ساجد کہتا ہے کہ نانی کے مرنے کے بعد نانا اکیلے ہوگئے ہیں۔ اپنے کمرے میں بیٹھے کھڑکی سے باہر دیکھتے رہتے ہیں اور اپنی گود میں دونوں ہاتھوں سے پلاسٹک کا وہ تھیلا سنبھالے رہتے ہیں جن میں ان کے نام آئے پرانے خط ہیں، پرانی تصویریں ہیں۔ تمھیں تو سلمیٰ اندازہ نہیں لیکن آپا جان جانتی ہیں کہ ابا کو ڈرامہ کرنے کی کتنی پرانی عادت ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ ساجد چھوٹا ہے سب باتیں ہم لوگوں سے کہتا ہوگا تو جذباتی اداکاری کے یہ سب نمونے دکھلاتے ہیں۔ عینک ہٹا کر آنسو پونچھنے کی بھی کوشش ہوتی ہے۔ میں جانتی ہوں اماں یاد آتی ہوں گی آخر چالیس برس کا ساتھ تھا اور بیچاری کنیزوں کی طرح ان کی خدمت کرتی تھیں۔ کبھی زبان سے اُف تک نہیں کرتی تھیں لیکن ایسا بھی کیا صدمہ کہ کل اماں کو گئے پورا ایک برس ہوگیا اور ان کی آنکھ میں آنسو نہیں تھمتے۔ اتنا بے قرار تو شاہ جہاں بھی نہ ہوا ہوگا۔ ہمارے ابا کا دل چاہتا ہے کہ لندن میں اماں کی قبر پر تاج محل بنوا دیں۔ کل چاہتے تھے کہ ہم سب قبر پر فاتحہ پڑھنے چلیں۔ بھلا اس ملک میں برسی منانے کے لیے چھٹی ملتی ہے؟ اتنی دور شام کو کیسے جاتے۔ شاہد نے صاف منع کر دیا تو ان سے تو کچھ نہ بولے لیکن کل رات جب میں ان کے کمرے کے سامنے سے گزری تو روک لیا اور آنکھوں میں آنسو بھر کر کہنے لگے "ایک دور ختم ہوگیا"۔ اب تم ہی بتلاؤ سلمیٰ یہ بھی کوئی ڈائیلاگ ہے اپنی بیٹی کے سامنے بولنے کا جو دن بھر دفتر سے کام کر کے گھر لوٹی ہو۔ کس کے مرنے سے کون سا دور ختم ہو جاتا ہے۔ بڑے سے بڑے لوگ ختم ہو جاتے ہیں اور دوسرے دن ہر چیز اپنی جگہ رہتی ہے ہر کام ہوتا رہتا ہے۔

ابھی جب ابا شاہد کے ساتھ کار میں بیٹھے تو تم جانتی ہو وہ کیا پہنے تھے؟ وہ ہری پھولدار شیروانی جو اماں کے گھر والوں نے ان دونوں کی شادی میں چوتھی کی رسم کے لیے بنوائی تھی۔ ابا جب لندن آرہے تھے تو آپا جان کو یہ شیروانی ان کے سامان میں پیک ہی نہ کرنا چاہیے تھی۔ مگر وہ بیچاری بھی کیا کرتیں ان کی ضد کے آگے کون ٹھہر سکتا ہے۔ بدرنگ ہوگئی ہے۔ کالر پھٹ گیا ہے۔ دو ایک بار میں نے واشنگ مشین میں ڈال کر دوسرے کپڑوں کے ساتھ دھویا بھی مگر استری کرنے کی ہمت مجھ میں نہیں۔ اماں زندہ تھیں تو سب کے کپڑوں پر استری کرد

کرتی تھیں لیکن انھیں ٹھیک طور سے کچھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ فاطمہ تو اپنے کپڑے امّاں کے ہاتھوں سے چھین لیا کرتی تھی جو بے کار مجھ پر اپنا احسان نہ کیا کرو نانی"۔ ابا جو آج چلے تو وہی شیروانی پہنے ہوئے، بٹن کھلے ہوئے، جیبوں میں اپنا اور امّاں کا پاسپورٹ ٹھسا ہوا پوسٹ آفس بک رکھی ہوئی۔ لاکھ منع کیا مگر ضد اتنی بڑھ گئی کہ کوئی بات نہیں سنتے۔ امّاں ابا دونوں کو یہاں وظیفہ ملنے لگا تھا خرچہ تو کچھ تھا نہیں بس جمع کرتے رہتے تھے، میں نے بجلی، پانی اور گیس کے بل کی ادائیگی ان کے ذمّہ کر دی تھی۔ چلتے وقت ساری رسیدیں شیروانی کے اوپر کی جیبوں میں ٹھونس لیں۔ کار میں بیٹھنے سے پہلے شاہد نے ان کی شیروانی اتارنے کی کوشش کی تو ابا ہاتھا پائی کرنے لگے۔ میں تو فوراً گھر کے اندر آ گئی اور دروازہ بند کر لیا۔ اس محلہ میں ہماری کچھ عزت ہے۔ یہ سب دیکھ کر محلہ دار کیا سوچتے ہوں گے لیکن ابا کو تو جیسے ضد ہو گئی تھی کہ ہمیں ذلیل کر کے ہی رہیں گے۔

میں نے تو ابا کے کمرے میں جانا ہی چھوڑ دیا تھا اتنا گندہ رکھتے تھے وہ اس کمرے کو اور پھر تمباکو کی بو اور ان کے پسینے کی بو۔ شاہد کو یقین نہیں آتا جب میں کہتی ہوں کہ ابا روز صبح نہایا کرتے تھے۔ اب یہ حال ہے کہ ہفتوں غسل نہیں کرتے۔ ایک دن میں نے امّاں ابا سے کہہ دیا تھا کہ پانی گرم کرنے میں بجلی بہت خرچ ہو جاتا ہے گرم پانی ذرا احتیاط سے خرچ کرنا چاہیے بس اتنی سی بات کا برا مان گئے۔ برا ماننے میں ابا سے بڑا کوئی ایکسپرٹ نہیں ہو سکتا۔ میں ایک دن ماجد کو سمجھا رہی تھی کہ بال کٹوانے کے لیے بجٹ مقرر ہونا چاہیے بس ابا نے بال کٹوانا بند کر دیا شیو تو عرصہ سے اس لیے نہیں کرتے کہ ہاتھ کانپنے لگے ہیں۔ امّاں مجھ سے چھوٹی سی قینچی لے کر ان کے بال کاٹ دیا کرتی تھیں مگر اب تو ان کو گئے پورا ایک برس ہو گیا۔

شاہد سے ہاتھا پائی کر کے کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ ایک ہاتھ میں پلاسٹک کا وہ زرد رنگ کا تھیلا جس میں خط اور تصویریں بھری رہتی ہیں اور دوسرے ہاتھ میں آئس کریم کا خالی ڈبہ جس میں ابا سب دوائیاں رکھتے ہیں۔ بلڈ پریشر کی دوا، قبض کی دوا، خونی بواسیر کی دوا، آنکھوں میں ڈالنے کی دوا، ہاضمہ کی دوا۔ اب ابا سے کوئی پوچھے کہ کیا کسی ایسے مقام پر جا رہے ہیں جہاں دوا علاج ممکن نہیں، لیکن ابا کی جتنی عمر بڑھتی جا رہی ہے۔ یوں تو اس ملک میں بوڑھوں کی آبادی دواؤں اور علاج معالجے کے سہارے زندہ ہے مگر ان کا معاملہ تو ضد کا ہے۔ منع کرو تو اور زیادہ دوائیں کھائیں گے۔ ہر روز نئے اور شاعرانہ امراض بڑھتے جاتے ہیں۔

پچھلے ہفتے ہماری فاطمہ نے کہا کہ نانا کو ہندوستان کیوں نہیں بھیج دیتے؟ ہندوستان بھیجنے میں کیا دیر لگتی ہے۔ یہاں سے ہوائی جہاز میں سوار کرا دیا، وہاں کسی نے اتار لیا مگر یہاں پر وہ ہم سے اتنے زیادہ ناراض ہیں کہ ڈر ہوتا ہے کہ حیدرآباد پہنچ کر آغا پورہ والا گھر اور شاہ آباد والا باغ وہ آپا جان کے نام کر دیں گے اور میں اور شاہد ہاتھ ملتے ہی رہ جائیں گے۔ اور سلمیٰ تم بتلاؤ وہ حیدرآباد جا کر کریں گے بھی کیا؟ پرانے دوستوں کو پکڑ پکڑ کر پرانے شعر سنائیں گے۔ یا ہر آدمی کے سامنے دواؤں کے لیے ہاتھ پھیلائیں گے۔ ہمارے ملک میں بوڑھے اپنی زندگی جتنی برباد کرتے ہیں شاید دنیا میں اور کہیں نہیں کرتے۔

ساجد آج اسکول سے آئے گا تو اسے بھی ابا کے بارے میں بتلانا پڑے گا۔ فاطمہ اور ماجدہ کو تو پہلے سے پتہ تھا بلکہ ماجد نے ہی تو ابا کے پرانے کپڑے اور دوسری الم غلم چیزوں کو کالے پلاسٹک کے بڑے تھیلے میں ڈال کر صبح ہی گھر کے باہر رکھ دیا تھا کہ آج میونسپلٹی کی کوڑا گاڑی آتی ہے اور ایسے تھیلوں کو اٹھا کر لے جاتی ہے۔ میں نے ماجد کو سمجھایا بھی کہ یہ چیزیں اگلے ہفتہ پھینک دینا مگر وہ، کہنے لگا کہ اب سات دن اس کباڑ کو کیوں گھر میں رکھیں اور پھر ابا والا کمرہ اب ساجد کو مل جائے گا۔ اب جولی آکر اس کمرے میں رہ سکتی ہے۔ سلمیٰ تم جولی سے ملو گی تو بہت خوش ہو گی۔ سنہرے بال، نیلی آنکھیں۔ ماجد اور جولی کی جوڑی اچھی رہے گی۔ میں اور شاہد جب ضعیف لوگوں کے اس گھر کو دیکھنے گئے تھے جہاں ابا کے رہنے کا انتظام کیا ہے تو وارڈن نے کہا تھا کہ ان کے ساتھ کم سے کم سامان بھیجیں، وہاں جگہ ہی نہیں یہ سب رکھنے کی۔ ابا کو یہاں تنہائی سے بڑی الجھن تھی۔ اب مزے میں اپنی عمر کے مرد اور عورتوں کے ساتھ رہیں گے۔ دن بھر گپ کریں گے، ٹی، وی دیکھیں گے، انگریزی کھانے کھائیں گے جو آسانی سے ہضم ہو جاتے ہیں۔ لیکن تم ابا کو شاہد کے ساتھ جاتا ہوا دیکھتیں تو سوچتیں کہ بکرے کو قصائی کے پاس لے جایا جا رہا ہے۔ خدا کرے ابا نے راستے میں شاہد کو پریشان نہ کیا ہو۔ دو ڈھائی گھنٹہ کا سفر ہے اور شاہد کو اتنی دیر تک کار چلانا پسند نہیں مگر کون سا وہاں روز روز جانا ہے۔

ساجد اسکول سے آئے گا تو ابا کو بہت پوچھے گا۔ وہ ان کو بہت چاہنے لگا تھا لیکن سچ پوچھو تو سلمیٰ میں نے بچّوں کی پرورش یہاں لندن میں بھی اس طرح کی ہے کہ اپنے رسم و رواج نہ بھولیں اور ساجد تو ضرورت سے زیادہ جذباتی ہے۔ ابھی نا سمجھ ہے نا!

دولھا بھائی کو میرا آداب کہنا اور بچّوں کو پیار۔ اگلی بار خط لکھنے میں دیر نہیں کروں گی۔ سلمیٰ آپا سے اس خط کا ذکر نہ کرنا، پلیز۔ وہ مجھے ہی خطاوار ٹھہرائیں گی۔ اچھا خدا حافظ

فقط

تمھاری پرانی سہیلی: سلطانہ

نوٹ: کیا تمھیں کہیں مسعود نظر آتا ہے؟۔ وہ جو کالج لال رنگ کی موٹر سائکل پر آیا کرتا تھا۔ ابا اس کو بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ تمھیں تو ساری بات یاد ہو گی۔ ●●

ہاتھ سے اونچا پھل

کرامت اللہ غوری

پاکستان ایمبیسی، پوسٹ بکس ۱۰۲۳، الجیریا

ایسے درخت کا پھل کھانا جس تک پہنچنا مشکل ہو یا ممنوع ہو گئے مزے کی بات ہوتی ہے اس کا لطف وہی جان سکتا ہے جس نے بچپن کی چلچلاتی دوپہر میں، باغوں کی اونچی دیواریں پھاندنے اور باغ کے چوکس رکھوالوں کی نظروں سے بچ کر پھل توڑنے میں گزاری ہو ــــ ممنوعہ شجر کا پھل کھانا تو ویسے بھی انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ اس کے خمیر کا حصہ ہے۔ خصوصاً مرد کے خمیر کا۔ اور یہ وہ فطرت ہے جو اسے باوا آدم سے ملی ہے۔

آدم سے کہا گیا تھا کہ دیکھو اس شجر کی طرف نہ جانا جس کا پھل تمہارے حق میں زہر ہو جائے گا لیکن آدم نے بغاوت کی ٹھان لی۔ پتہ نہیں آدم کے فعل کو بغاوت کہنا درست بھی ہوگا کہ نہیں۔ یا شاید نہیں۔ ایسا کہنا آدم کے ساتھ حق تلفی ہوگی اور ویسے بھی ان کے ایک مثبت فعل کو خواہ مخواہ منفی رنگ دے دیا جائے گا۔ آدم نے تو اپنی اس فطرت کے عین مطابق جو مٹی کے ساتھ ان کے خمیر میں گوندھی گئی تھی، ایک چیلنج کو قبول کیا تھا۔ ہر خطرے اور انجام سے بے نیاز ہو کر چیلنج کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا اور پھر جو انجام ہوا اسے آدم نے بھی جھیلا اور ان کے بعد ان کی نسل در نسل میں ان ہی جیسے حوصلہ اور ارادہ والے مرد جھیلتے آئے ہیں اور شاید رہتی دنیا تک جھیلتے رہیں گے۔

جمیل کو بھی لڑکپن سے ایسے خطرات کا مقابلہ کرنے کا شوق تھا جن میں جان لڑا دینے والی کیفیت شامل ہو جاتی ہے۔ بچپن میں جب چلچلاتی دوپہر میں چیل انڈا چھوڑنے لگتی اور خس کی ٹٹیوں کے پیچھے خوابناک سلگتے اندھیرے اپنے سنگھاسن جما لیتے تھے تو وہ ٹہنی ٹہنی پھرتا تھا۔ اس کی نظر ہمیشہ اس پھل پر ہوتی تھی جو درخت کی سب سے بلند ٹہنی کی پھننگ ہوتا ــــ نیچے کی ٹہنیوں کے پھل وہ بے دلی سے توڑ کر اپنے ان ساتھیوں کی جھولی میں پھینک دیا کرتا تھا جن میں اس کی طرح اونچی ٹہنی تک پہنچنے کی ہمت یا تڑپ نہیں ہوتی تھی۔ ایک دو بار تو وہ اس کوشش میں مرتے مرتے بچا تھا، کتنی ہی بار اس نے اونگھتے ہوئے رکھوالوں کی گالیاں اور لاٹھیاں کھائی تھیں لیکن ہر بار اس کا حوصلہ بلند سے بلند تر ہوتا رہا تھا۔ اونچی شاخ کے پھل کو توڑنے کی امنگ اس کے خون، اس کی فطرت اور اس کی شخصیت کے انگ انگ میں رچ بس گئی تھی۔

طالب علمی کے زمانہ میں وہ اپنے ہم سبقوں کے ساتھ کلاس میں پوزیشن حاصل کرنے کے چیلنج کو ہنسی خوشی قبول کرتا رہا۔ اسے عجیب سی مسرت ہوتی تھی جب وہ اپنے کسی ساتھی کو محنت کرتے دیکھتا تھا، دوسرے کی محنت اس کے اپنے خون میں گرمی پیدا کر دیا کرتی تھی اور پھر وہ اپنی تمام تر ذہانت اور ریاضت کو استعمال کرتے ہوئے اسے نیچا دکھانے کی جستجو میں منہمک ہو جاتا تھا۔ جب وہ اپنے مشن میں کامیاب ہو جاتا تھا تو اسے لگتا جیسے وہ اونچے آسمان تک پرواز کر کے دور، بہت دور کے تارے توڑ لایا ہے۔ اسے اپنی روح میں عجب مسرت بخش بالیدگی کا احساس ہوا کرتا تھا۔ چیلنج کے جواب میں اپنے آپ کو سرخرو دیکھ کر اسے اپنے زندہ ہونے کا یقین ہو جاتا تھا!

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد جب وہ کاروبارِ دنیا میں داخل ہوا تو وہاں بھی اس کی فطری طبع آزمائی کا عمل جاری رہا ــــ وہ ایک کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری نوکری کرتا رہا۔ ایک کام کے بعد دوسرا کام کرنے کی جستجو اور لگن اسے مستقل اکساتی رہی۔ نئی جہتوں کی تلاش اسے مسلسل بے قرار کیے رہی۔ ہر نئی کاوش کو وہ اس سے بہتر میدانِ عمل میں داخل ہونے کے لیے زینہ سمجھتا رہا۔ اس کی بے سکون فطرت کسی بھی منزل کو آخری منزل تسلیم کرنے سے منکر رہی۔ اسے اپنے اوپر اعتماد تھا، اپنی جنگجویانہ فطرت پر اعتماد تھا اور وہ ہر چیلنج کو اپنی فطرت کے لیے تازیانہ سمجھ کر قبول کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا لہٰذا وہ ترقی کرتا رہا۔ کامیابی کے زینے تیزی سے چڑھتا رہا اور کامرانیاں اس کے قدم یوں چومتی رہیں جیسے سمندری سرکش موجیں ساحل پر ثابت قدمی سے جمی ہوئی چٹانوں کو بوسہ دیا کرتی ہیں۔ یا جیسے ان سرکش موجوں کا جھاگ ساحل کی جمی ہوئی ریت کو اور نم کر دینے کے لیے اسے بے قراری سے چوم لیتا ہے۔

بس ایک کام تھا جس میں اسے کسی چیلنج کی بجلی کوندتی ہوئی نظر نہیں آئی اور جسے اس نے اپنے ماں باپ کی مرضی اور رضا

کے ساتھ اس طرح خاموشی سے اور بلا چون و چرا تسلیم کر لیا جیسے وہ ہر صبح طلوع ہونے والے سورج کو نئے دن کی تمہید سمجھ کر قبول کر لیتا تھا یا شاید وہ کارِ جہاں میں ایسا الجھا ہوا تھا کہ اس نے کبھی عورت کو زندگی کے لیے جادۂ جہادِ عشق و آزمائش کے لیے چیلنج سمجھا ہی نہیں تھا۔ اس کے نزدیک عورت، خصوصاً جیون ساتھی کے روپ میں ایک ایسی ہی ناگزیر ضرورت تھی جیسے وجود کے لیے اور دوسرے لوازمات۔ اور چونکہ اسے سب ہی عورتیں ایک جیسی نظر آتی تھیں لہٰذا ان میں کسی چیلنج کا عنصر یا شائبہ اُسے دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اس کے ماں باپ نے اس کی شادی بہت ارمانوں سے بہت دھوم دھام سے کی تھی۔ وہ کامیابی کے جس مقام پر پہنچ چکا تھا اس کا تقاضہ بھی یہی تھا۔ اس نے معاشرہ میں ایک مقام حاصل کر لیا تھا اور ماں باپ اس معاشرہ کو یہ دکھانا چاہتے تھے کہ وہ اپنے بیٹے کی بلند اقبالی میں اور چار چاند لگانے کے اہل تھے۔ اور وہ نمود و نمائش کے اس سارے کھیل میں ایک خاموش تماشائی کی طرح سے شریک رہے۔ شادی کے بعد وہ ایک عرصہ تک عام گھریلو انسانوں کی سی زندگی بسر کرتا رہا۔ ازدواجی زندگی کے بندھنوں میں بندھا ہوا وہ زندگی کے متوازن اور ہموار دھاروں پر یوں بہتا رہا جیسے کٹے ہوئے درختوں کے لٹھے دریا کی سپاٹ سطح پر بہتے اور تیرتے ہوئے منزل کی طرف رواں رہتے ہیں۔ آخر ایک عرصہ گزر گیا اور وہ جوانی کے سنہرے دور سے نکل کے ادھیڑ عمری کے ملگجے سایوں میں داخل ہونے لگا تو اسے یہ احساس ہوا کہ اس کی زندگی واقعتاً لکڑی کے ان لٹھوں کی طرح سے ہو گئی تھی جو منزل سے ناآشنا سپاٹ، بے جان ایک ہی رخ ایک ہی دھارے پہ بہتے جاتے ہیں۔ جن میں سے کئی منزل پر پہنچنے سے پہلے ہی راستے کی کھاڑیوں میں پھنس کر رہ جاتے ہیں اور جو منزل پر پہنچتے بھی ہیں تو وہ پھر کسی بے رحم آرے کا شکار ہو کر چھوٹے چھوٹے تختوں میں کٹ جاتے ہیں۔ اسے اچانک ہی بڑی شدت سے یہ احساس ہوا کہ اس کی زندگی جو آنکھ کھولنے کے بعد سے یکے بعد دیگرے۔ ایک کے بعد ایک چیلنج کا مقابلہ کرتے ہوئے گزری تھی۔ کسی چیلنج کی عدم موجودگی میں بے کیف اور بے مزا ہو کر رہ گئی تھی۔ اور یہ احساس اس کے لیے بہت ہی تکلیف دہ ثابت ہو رہا تھا۔ شاید یہی بے کیفی ہی تھی جواب آہستہ آہستہ اس کی ازدواجی زندگی پہ اثر انداز ہونے لگی تھی۔ نہ چاہنے کے باوجود اس کی بیزاری میں دن بہ دن اضافہ ہونے لگا تھا۔ بیوی سے بلا وجہ، بلا جواز اس کے تعلقات میں ایک عجب طرح کا کھچاؤ، ایک دوری ایک بے نام سا تناؤ رچنے لگا تھا، وہ یہ سب کچھ نہیں جانتا تھا۔ ایک طویل عرصے سے وہ اپنی بیوی کے ساتھ بے داغ زندگی گزارتا آیا تھا، اس نے بیوی سے محبت بھی کی تھی، ویسی ہی محبت جو ہر وفادار شوہر اپنی بیوی سے کر سکتا ہے۔ لیکن وہ اس احساس کو کیا کرتا جو بہت تیزی سے اس کی شخصیت اس کے وجود پر یوں چھایا جا رہا تھا جیسے کہر اپنی دبیز چادر تان رہی ہو۔ کہر کی اس چادر کے سامنے ہر سمت، ہر جہت اور ہر اطراف کو جانے والا راستہ مسدود ہو گیا ہو۔ کہر اتنی گہری تھی کہ اُسے اپنے ہاتھ سے آگے کچھ بھی سجھائی نہیں دیتا تھا!

ایسے عالم میں نوری سے اس کی ملاقات، اور ان کے درمیان پیدا ہونے والے تعلقات اس کے لیے ایسا ہی حادثہ تھا جیسے طوفان زدہ گھپ کی کالی رات میں جنگل میں راستہ کی تلاش میں بھٹکنے والے مسافر کی نظروں کے سامنے آسمان پر بجلی چمکے اور اس کی تیز روشنی میں اسے منزل کی راہ سوجھ جائے۔ اس کے ساتھ بھی بالکل یہی ہوا تھا۔ نوری اسے ان حالات میں ملی تھی جب وہ زندگی میں آنے اور پیدا ہونے والے چیلنجوں سے تقریباً مایوس ہو چکا تھا۔ نوری ساحل کی طرف جاتی ہوئی ایک بڑی اونچی اور تند و تیز موج کی طرح آئی تھی اور راستے بے جان، بے موج پانیوں سے اپنے ہیجانی بہاؤ میں بہا لے گئی تھی۔ نوری اس کے لیے زندگی کا سب سے بڑا چیلنج بن کر آئی تھی۔ سب سے زیادہ مشکل چیلنج۔ بالکل یوں جیسے پانی کی تلاش میں بھٹکنے والے پیاسے صحرا نورد کو ایک مدت کی تلاش کے بعد کوئی نخلستان نظر آیا ہو لیکن نخلستان میں بس ایک تنہا ناریل کا درخت ہو۔ بہت اونچا، سوئی کی طرح کھڑا ہوا سیدھا اونچا درخت جس کی پھننگ پہ ایک سر سبز و تازہ ناریل کا پھل لگا ہوا ہو۔ پانی اور گودے سے بھرا ہوا ناریل جو اس کی پیاس اور بھوک دونوں کو مٹانے کی قدرت رکھتا ہو لیکن جس تک پہنچنے کے لیے اسے سیدھے، بلند اور دشوار درخت کے تنے پر فتح حاصل کرنا ضروری ہو، ناگزیر ہو۔ اس نے بچپن میں پھلوں سے لدے ہوئے جتنے دشوار درخت فتح کیے تھے یہ ان میں سب سے مشکل پیڑ تھا لیکن اس پیڑ کے اوپر لگا ہوا پھل بھی اتنا ہی شیریں، اتنا ہی فرحت بخش اور سکون دینے والا ثابت ہو سکتا تھا۔

نوری شادی شدہ تھی، بچوں کی ماں تھی۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کی ماں۔ اس پہ ذمہ داریاں تھیں۔ بڑی اور چھوٹی بہت سی ذمہ داریاں۔ وہ گلاب کے مہکتے خوش رنگ پھولوں کی ایسی ڈالی تھی جس میں خوشبو اور لطافت اور تازگی کے ساتھ ساتھ کانٹے بھی بہت تھے۔ وہ شہد کا ایک چھتہ تھی جس میں بہت شہد تھا بہت رس تھا بہت مٹھاس تھی لیکن اس چھتہ کو بے شمار مکھیاں اپنے گھیرے میں لیے ہوئی تھیں۔ بھنبھناتی، شور مچاتی ہوئی مکھیاں، جو شہد کے ایک ایک قطرہ کی محافظ بنی ہوئی تھیں۔ جمیل نے زندگی میں اس سے پہلے کبھی ایسے چیلنج کا سامنا نہیں کیا تھا۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ کبھی ایسے چیلنج سے دوچار ہو سکے گا۔ جس کے تانے بانے کسی عورت کی ذات کے گرد بنے گئے ہوں۔ لیکن اب جب کہ وہ چیلنج اپنی تمام تر قوت اور بے باکی کے ساتھ اس کے پورے وجود کو اپنے حصار میں لے چکا تھا تو اسے یوں لگنے لگا تھا جیسے یہ اس کے لیے زندگی اور موت کا سوال ہو۔! نوری کو حاصل کرنا، اسے اپنا بنانا اس کے لیے حیات کا سب سے بڑا مقصد وجود کا سب سے بڑا انعام بن چکا تھا۔ اپنی زندگی میں اس نے بے شمار کارنامے انجام دیے تھے، لاتعداد انعام حاصل کیے تھے۔ اس کے گھر اور دفتر کے شیلف ان انعامات کی چمک دمک سے جگمگاتے رہتے تھے لیکن نوری اب اس کے لیے وہ انعام بن گئی تھی جسے حاصل کیے بغیر اسے یوں لگتا تھا جیسے پوری زندگی ہی اکارت اور رائیگاں چلی گئی ہو۔ جیسے بیا کو اپنے گھونسلے کو جگمگانے اور روشن کرنے کے لیے صرف ایک جگنو کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح جمیل کو اپنی زندگی

کو کامرانی کی خلعت پہنانے کے لیے نوری کی ضرورت تھی۔

وہ جانتا تھا کہ گلاب کی اس ٹہنی میں اتنے کانٹے تھے کہ پھول تک پہنچنے میں اس کے ہاتھ کی ایک ایک پور لہو لہان ہو سکتی تھی۔ لیکن وہ یہ خون بہانے کے لیے آمادہ تھا۔ اسے علم تھا کہ شہد کے اس چھتے سے شہد کی ایک بوند حاصل کرنے کی کوشش میں اس کا حلیہ بگڑ سکتا تھا لیکن اس آزمایش کے لیے بھی تیار تھا۔ زندگی میں پہلی بار اسے آگ کے دریا کا سامنا تھا۔ لیکن وہ مطمئن تھا کہ دریا کے دوسرے کنارے پر آباد اس کے لیے سکون کی جنت منتظر تھی۔

ان دونوں کے ملاپ کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ، سب سے بڑا روڑا نوری کا شوہر تھا جس سے نوری کو کبھی کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی لیکن آخر کو وہ اس کے بچوں کا باپ تھا اور اس رشتے نے اسے نوری کی زندگی پر ایسا اختیار دے دیا تھا جس سے انکار نہ نوری کر سکتی تھی نہ جمیل۔ یہ اختیار نوری کے شوہر کو ان بچوں کے توسط سے حاصل ہوا تھا جو اس کے نطفے سے پیدا ہوئے تھے اور جن کا وہ بلا خوف تردید ولی اور وارث تھا۔ نوری کے لیے وہ لاکھ ایسی ہستی رہا ہو جس میں نہ کوئی رومانیت کا پہلو تھا اور نہ ہی اس میں کوئی ایسی اپیل تھی جو نوری جیسی رومان پسند اور جذباتی شخصیت کو متاثر کر سکتی لیکن اپنے بچوں کے لیے تو وہ باپ تھا، چاہے جلنے والی ہستی اور اس مستحکم اختیار کو وہ نوری اور جمیل کے مستقبل کے منصوبوں کو خاک میں ملا دینے کے لیے بے دردی کے ساتھ استعمال کر رہا تھا۔

نوری اس سے چھٹکارا چاہتی تھی، طلاق چاہتی تھی لیکن وہ طلاق دینے کے لیے تیار نہیں تھا اور اگر کبھی نوری کے بے حد اصرار پر اور اس کے چھوڑ کر چلے جانے کی دھمکیوں کے جواب میں طلاق دینے کا وعدہ بھی کر لیتا تو پھر وہ اپنا آخری حربہ آخری مہلک ہتھیار استعمال کرنے کی دھونس جماتا بچے میرے ہیں اور میرے پاس ہی رہیں گے۔ تم مجھے چھوڑ کر جا سکتی ہو، مجھ سے طلاق لے سکتی ہو لیکن میں اپنے بچوں پر تمھارا اور تمھارے عاشق کا سایہ نہیں پڑنے دوں گا۔ اور یہ وہ دھمکی تھی جسے سن کر نوری کانپ جاتی تھی۔

نوری نے جمیل کو جس طرح ٹوٹ کے چاہا تھا اس کا تقاضہ تو یہی تھا کہ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے، ہر رشتہ ناطہ اور تعلق کو تج کے جمیل کے پاس آجاتی اور اس نے ایک دو بار جمیل سے اپنے اس عزم کا اظہار بھی کیا تھا کہ وہ اس کی خاطر سب کچھ قربان کرنے کے لیے آمادہ تھی۔ لیکن جمیل جانتا تھا کہ جذبات کے امڈتے دھارے میں بہ کر آنے والی تند و تیز موج ساحل تک جتنی تیزی سے آتی ہے اس سے زیادہ شدت سے پلٹ کر بھی جاتی ہے۔ اپنے بچوں کے بغیر نوری جمیل کے ساتھ رہ تو جاتی لیکن اس کا دل بچوں میں اٹکا رہتا۔ جمیل کو وہ مل تو جاتی لیکن ادھوری، تشنہ، نامکمل اور جمیل اپنی زندگی کے سب سے بڑے انعام کو ادھورا حاصل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے بہت صاف اور واضح الفاظ میں نوری کو بتا دیا تھا کہ وہ اسے اس کی ذات کے تمام تر واسطوں سمتوں اور زاویوں کے ساتھ اپنانا چاہتا تھا۔ بھرپور، مکمل، کسی بھی خلا یا کمی کے بغیر۔ بچپن سے لے کر آج تک اس نے پیڑ کی اونچی شاخوں سے جتنے بھی پھل توڑے تھے کسی میں کسی اور کو شریک نہیں کیا تھا۔

نوری اس کے طرز استدلال سے زچ ہو جاتی لیکن مجبور تھی وہ جمیل سے ضد نہیں کر سکتی تھی اسے معلوم تھا کہ جمیل جذباتی تھا اتنا ہی ضدی بھی تھا اور اس کی مرضی کے خلاف وہ اسے کسی کام پر مجبور نہیں کر سکتی تھی۔ ہاں یہ ضرور ہوتا کہ یاس اور ناامیدی کے اکثر گمبھیر لمحوں میں وہ یہ سوچا کرتی کہ کاش وہ شخص مر جائے، کسی حادثے کا شکار ہو جائے جو اس کی خوشیوں اور تمناؤں کی تکمیل کے راستے میں رکاوٹ بنا ہوا تھا۔ اور پھر اپنی شکست خوردہ خواہش کی نامرادی پہ خود ہی شرمندہ سی ہوتی، کانپ کے رہ جاتی البتہ جمیل کے سامنے کبھی اس کے لبوں سے یہ خواہش الفاظ میں ڈھل کر نہ نکل سکی۔ وہ جانتی تھی کہ جمیل کو کوسنے اور گالیوں سے کتنی چڑ تھی، چاہے وہ اس آدمی کے خلاف ہی کیوں نہ ہو جو دنیا میں اس کا سب سے بڑا حریف تھا!

نوری کو بخوبی احساس ہو چکا تھا کہ اسے جمیل تک پہنچنے کے لیے اپنے شوہر سے ایک آخری جنگ لڑنی پڑے گی۔ بچے ابھی چھوٹے تھے اور انھیں باپ سے زیادہ ماں کی ضرورت تھی۔ لہٰذا نوری نے جمیل کے مشورہ سے اپنے شوہر سے طلاق لینے اور بچوں کو حاصل کرنے کے لیے عدالت میں مقدمہ کر دیا۔ اسے یقین تھا کہ اخلاقی اور معاشرتی طور پر چاہے دنیا اس کا ساتھ نہ دے لیکن قانون ضرور اس کا ساتھ دے گا۔ اور اسے یہ حق دینے پر آمادہ ہو جائے گا کہ وہ اپنے بچوں کے ساتھ اس شخص کی ہو کر رہ سکے جو اس کی محبت، آرزو اور تمنا کا محور تھا۔ واحد مرکز تھا،

طلاق کا مقدمہ شروع ہو گیا، پیشیاں ہونے لگیں۔ جمیل مطمئن تھا، خوش تھا کہ وہ بہت عرصہ کے بعد ایک بڑی جنگ لڑ رہا تھا، اور اس بار وہ تنہا بھی نہیں نوری اس کے ساتھ تھی، اس کی آرزوؤں اور تمناؤں کی رفیق اس کی سب سے اہم اور فیصلہ کن لڑائی میں شریک تھی۔ اسے جذبات اور قانون کی یہ جنگ لڑتے ہوئے بہت سکون مل رہا تھا، اسے اپنی ذات کے ساتھ ساتھ اب نوری کی محبت اور اس کی ذات پر بھی اتنا ہی بھرپور اعتماد اور یقین تھا۔ اس کا دل کہتا تھا کہ وہ جنگ میں بھی اسی طرح فتحیاب اور کامران رہے گا جیسے اس سے پہلے کی تمام لڑائیوں میں۔

مقدمہ تیزی سے مختلف مراحل طے کرتا ہوا اپنے اختتام تک پہنچنے والا تھا، شاید دو چار پیشیاں اور بچی تھیں۔ جمیل کا انہماک اور اشتیاق بھی اس کے ساتھ ساتھ بڑھتا جا رہا تھا کہ ایک رات نصف شب کے بعد اس کے ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف نوری تھی جس کی آواز فرطِ جذبات سے کپکپا رہی تھی۔ ایک لمحہ تک تو نیند میں ڈوبا ہوا جمیل یہ سمجھ ہی نہ پایا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہی ہے۔ ویسے بھی انوکھی بات تھی کہ نوری نے اس کے گھر پر فون کیا تھا ورنہ وہ ہمیشہ خود ہی اسے فون کیا کرتا تھا۔ لیکن نوری کی آواز اور اس کے لہجہ میں تنی شدت تھی کہ وہ چند لمحوں سے زیادہ خواب آلود

نہ رہ سکا۔

"سنو۔ ہاں سن رہے ہو نا چندو" نورانی کانپتی ہوئی آواز میں کہہ رہی تھی۔ "وہ مر گیا۔ ہمارے راستے کا کانٹا نکل گیا۔"

"کون مر گیا۔ کیسے مر گیا"۔ جمیل نیند کے غوطے سے نکلتے ہوئے زور سے چلایا۔

"وہی میرے بچوں کا باپ۔ جو ہماری راہ میں دیوار بنا ہوا تھا۔ وہ دیوار آج شام خود ہی گر گئی"۔ نوری بیحد جذباتی ہو رہی تھی۔

"کیسے؟"

"اوہ ہنہ تم نے رات کی خبریں نہیں سنیں کیا؟ وہ اس جہاز میں آ رہا تھا جو آج ہوائی اڈہ پر اترنے سے چند منٹ پہلے گر کر تباہ ہو گیا۔ ہم آزاد ہو گئے چندو۔ ہماری زنجیریں کٹ گئیں۔"

لیکن جمیل کو یوں لگ رہا تھا جیسے ہاتھ سے بہت اونچے پھل کو توڑنے کے لیے جست لگانے سے پہلے ہی کسی نے اس کی ٹانگوں میں بیڑیاں پہنا دی ہوں۔ اور پھل شاخ سے خود ہی ٹوٹ کے اس کی گود میں آ گرا ہو۔ یہ اس کے لیے ناممکن تھا کہ وہ شاخ سے ٹوٹ کر گرے ہوئے پھل کو اٹھا لے۔ بچپن سے اس نے کبھی اس پھل کو نہیں کھایا تھا جو خود سے اس کی جھولی میں آ گیا ہو۔ یا زمین پر گر گیا ہو۔ دل تو ہمیشہ خود ہی پھل توڑ کے کھانے کا عادی تھا۔

"چندو تم جاگ رہے ہو یا سو رہے ہو؟" نوری کی آواز ٹیلیفون کے تاروں کو پھلانگتی ہوئی آئی۔

"نہیں نوری۔ پہلے سو رہا تھا اب جاگ گیا ہوں۔ سنو تمہارے شوہر کی بے وقت موت نے میرے چیلنج کو بھی مار دیا ہے۔ موت کی نیند سلا دیا ہے، ختم کر دیا ہے۔ اس کشمکش کو جس میں میرے لیے زندہ رہنے کا سب سے بڑا جواز تھا۔ میری لڑائی کی آگ یوں سرد ہو گئی ہے جیسے وہ برف کے طوفان کی زد میں آ گئی ہو۔ میں تمہیں لڑ کر جیتنا چاہتا تھا نوری۔ یوں مجھے تقدیر سے بھیک نہیں چاہیے۔"

"تم پاگل تو نہیں ہو گئے جمیل؟" نوری بہت زور سے چلائی۔

"نہیں نوری۔ میری جان۔ میں بالکل ہوش و حواس میں ہوں۔ لیکن میں کیا کروں کہ میں جھولی میں خود ہی آ گرنے والے پھل نہیں کھاتا۔ میں صرف ہاتھ سے اونچا پھل توڑتا ہوں۔ صرف ہاتھ سے اونچا پھل ——— خدا حافظ" جمیل نے فون بند کر دیا:

●●

افسانہ ادب کی دوسری اصناف کے رویوں سے علیحدہ کوئی چیز نہیں۔ ادب میں داخلی عوامل اپنے خارجی سیاق و سباق کا نتیجہ ہوتے ہیں اور یہ خارجی اسباب قدرتی اور سماجی دونوں قسم کے محرکات پر مشتمل ہوتے ہیں۔ کوئی شاعر یا ادیب ان محرکات سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کا جدید ادب پورے کا پورا ان محرکات کا رد عمل ہے بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ دنیا کا ہر ادب زمانی اور مکانی تاریخ کے عمل اور رد عمل کا نتیجہ ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ اسی لیے ادب کا مطالعہ تاریخی علم کے بغیر ناقص ہوتا ہے۔ ہمارا ادب وہ شعری ہو یا نثری، برصغیر کی انقلاب آفریں تاریخ کا آئینہ دار ہے۔ کیوں کہ ادب کی بنیاد تاریخ کے ہاتھوں رکھی جاتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو سلطنتوں اور حکومتوں کے زوال کے ساتھ ادب اپنا روپ نہ بدلتا۔ نثری ادب کی شکل نہ بدلتی اور شاعری اپنا چولا نہ تبدیل کرتی۔ محمد شاہی دور کی سیاسی تبدیلی ادب کا ایک نیا آہنگ پیدا نہ کرتی۔ اسی طرح ایک صدی پر محیط سیاسی انتشار کی بازگشت غالب کی شاعری میں نہ سنائی دیتی۔ اور اردو نثر داستانوں کی دنیا میں نہ بھٹکتی پھرتی۔ پھر ۱۸۵۷ کا عہد آفریں انقلاب ادبی انقلاب کے لیے ڈنکے کی چوٹ نہ بن جاتا۔ اس انقلاب نے جہاں مسلمانوں کو فرار اور ذہنی انحطاط میں گرفتار کیا وہیں سرسید اور حالی کو بھی پیدا کیا۔ یہ وقت کی ٹکسال تھی۔ جس میں کامل العیار سکے خود بہ خود ڈھل رہے تھے۔ اس کے محرک لاشعوری عوامل تھے۔ اس میں ارادہ اور اختیار کا کوئی دخل نہ تھا۔ کہانی کی دنیا میں بھی انقلاب نے انگڑائی لی اور نذیر احمد کے ہاتھوں میں نئی کہانی نے جنم لیا۔ اس کے بعد سیدھے سادے رومان کی جگہ اس میں فنی باریکیوں کا احساس اور زندگی کے پیچیدہ مسائل پر گرفت اور پر معنی تصور اور تخیل آفرینی کے ساتھ تفکر کی گہرائی پیدا ہوئی۔ جس میں انسانی ذہن نے مادی زندگی کی آویزشوں سے تنگ آ کر راہ فرار اختیار نہ کی۔ بلکہ ان الجھنوں سے دو چار ہونے کی بالیدگی حاصل کی۔

(میمونہ انصاری)

جمیل نے پوچھا ہے؟

شکیلہ رفیق

۱۷۵ سی پی برار سوسائٹی بلاک ۳ کراچی ۵

بظاہر وہ سب اس کے دوست تھے۔

مگر پھر بھی اسے گاہک بنانے میں دقت پیش آ رہی تھی۔ جینے کے تمام راستے اُن سب نے بند کر دیے تھے۔ طرح طرح سے اُسے تنگ کرنے، اس کے مال کو نقلی بتا کر اُس کے گاہکوں کو اس سے بدگمان کر دیتے اور یوں .... وہ روز بروز تنگ ہوتا جا رہا تھا۔

اب سے پہلے وہ کسی اور محلے میں رہتا تھا۔ جہاں اس کی چھوٹی سی کریانے کی دوکان تھی۔ آبادی بھی چھوٹی تھی لیکن کاروباری مسائل پھر بھی موجود تھے۔ اُس پر بیوی کی روزانہ کی جھک جھک سے تنگ آ کر اُس نے نارتھ ناظم آباد کی ایک بلڈنگ میں فلیٹ کرائے پر لیا اور اسی بلڈنگ کے نچلے حصے میں بنائی گئی دوکانوں میں سے ایک دوکان بھی۔

تمام جمع پونجی، پگڑی اور دوکان کا معیار برقرار رکھنے میں صرف ہو گئی۔ اُدھر سکینہ ــــ اس سب سے بے خبر کہہ رہی تھی۔

"تھوڑے سے بھی پیسے ہو جاتے تو اور کچھ نہیں تو چھوٹے کا سوئٹر (سویٹر) تو بن ہی جاتا۔"

اُس نے سن تو لیا مگر ظاہر یوں کیا جیسے سُنا ہی نہ ہو۔ اب کے وہ قدرے بلند آواز میں بولی۔

"اجی سُنتے ہو؟"

"سب سُن رہا ہوں۔" وہ بدن کو اینٹھاتے ہوئے بولا۔ "گھر میں داخل ہوتے ہی بک بک نہ شروع کر دیا کرو، ایک تو تمام دن دوکان کا تناؤ، بکری کچھ نہیں، اوپر سے تمہاری بک بک۔"

"بچے سردی میں ٹھٹھرتے رہیں اور تمھیں ذرا احساس نہ ہو یہ بک بک ہے۔ تو پھر ٹھیک ہے۔" سکینہ نے کروٹ لے لی۔

"ارے اُدھر منہ کیا موڑ لیا .... کھانا دو جلدی سے، بھوک سے دم نکل رہا ہے۔" سکینہ نے اس کی جانب ناگواری سے دیکھا (اللہ کرے نکل ہی جائے تمھارا دم) پھر وہ اٹھی، دال اور لوکی کی بھجیا گرم کی اور اس کے سامنے لا کر رکھ دی اس نے ایک نظر ڈالی اور پھر زہر مار کرنے لگا۔

یہ روز کا معمول تھا۔

پریشانی، مسائل، تنگی اور مسابقت کی دوڑ، یہ تمام سلسلے جاری تھے کہ شہر میں ہنگامے شروع ہو گئے۔ مسلمان نے مسلمان کو چاقو مار کر یہ تسلیم کرایا کہ وہ دونوں مومن ہیں اور ان کا فرضِ اوّلین ہے کہ ایک دوسرے کی املاک کو تباہ کریں اور خون بہائیں۔

شاہراہوں پر بہتے ہوئے خون کو سمیٹنا ممکن نہ تھا۔

تخریبی عناصر ذہنوں کو درست راستہ دکھانا اس بھی مشکل تھا کہ وہ اسی راستے کو منزل اور رہائی سمجھ رہے تھے۔

اس صورتِ حال سے نمٹنے کا ایک راستہ 'کرفیو' تھا۔

لہٰذا کرفیو نافذ کر دیا گیا۔

"اب تو بھجیا اور دال سے بھی گئے۔" سکینہ نے کہا اور اس کا چہرہ پگھلی موم کی لہروں جیسا ہو گیا۔

"ہوں۔" اس ایک لفظ کے سوا اس کے پاس کہنے کو رہ بھی کیا گیا تھا۔

کرفیو کے وقفے میں دوکانیں دو گھنٹے کے لیے کھلتی تھیں۔ اب اس دوران وہ یا تو اشیاء فروخت کرلیتا یا انھیں خریدنے کے لیے شہر چلا جاتا۔

فروخت پہلے سے بھی کم!

لڑائی پہلے سے بھی زیادہ ــــ!

اور ان دونوں میں توازن پیدا کرنے کی صورت محال۔

اس نے سوچا ــــ بڑا غور کیا، مسئلے کا حل کیا ہونا چاہیے؟ مسئلے کا کیا حل ہو سکتا ہے؟ مسئلے کا حل ہو گیا؟

"اے جی کیا کرو گے اب؟"

ایک رات سکینہ کا سوال پتھر بن کر دماغ پر لگا اور پھر... ایک دم ہی ذہن کے در وا ہو گئے۔

سب دوکانیں صرف کرفیو کے وقفے کے دوران کھلتی تھیں، دوسری صورت میں خطرہ تھا کہ تخریب پسند عناصر آکر توڑ پھوڑ نہ کریں...

... اور... رہا سہا دال دلیا بھی جاتے۔

لیکن اب ــــ؟ سکینہ کا یہ جملہ' اے جی، کیا کرو گے اب؟ کچھ اتنے زناٹے سے آکر ٹکرایا تھا کہ 'کیوں' کے سارے قفل کھل گئے تھے اس نے سر سے کفن باندھا اور فیصلہ کر لیا کہ حالات کچھ بھی ہوں دوکان پورا دن کھلے گی۔ اس فیصلے میں مددگار بلڈنگ کا وہ پچھلا حصہ بھی بنا جس کے باعث دوکان مین روڈ سے نظر نہ آتی تھی۔

پھر ــــ اگلے روز کرفیو کا وقفہ ختم ہوا، تمام دوکانیں بند ہو گئیں تنہا وہ دوکان کھولے بیٹھا تھا۔

کچھ دیر بعد سامنے والے مکان کے بیرونی گیٹ سے ایک عورت کا سر نکلا اور دوکان کھلی پا کر اس کی آنکھیں چمک اٹھیں اس نے گردن موڑ کر کسی کو آواز دی چند منٹ بعد لڑکا ہاتھ میں سو کا نوٹ لیے آیا اور پوچھا۔ "ڈالڈا ہے؟"

نہ صرف چھوٹے کا بلکہ سب بچوں کے سویٹر بن گئے تھے، اسکول کی فیس ادا کر دی گئی تھیں، کتابیں و کاپیاں خریدی گئی تھیں اور عید کے کپڑے بھی پہلے ہی سے بنا کر رکھ دیے گئے تھے۔

شہر کے حالات میں بہتری پیدا ہو گئی تھی کہ....

شہر کے حالات میں بھی بہتری پیدا ہو گئی اور کرفیو ہٹا لیا گیا

تمام دوکانیں دوبارہ پورا دن کھلی رہنے لگیں، ساتھ کے دوکان دار جیسے کے راستے پھر بند کرنے لگے، گاہک بھی کم ہو گئے اور خرید و فروخت بھی... کاروبار پھر سے نقصان میں جانے لگا۔

"اے جی! کچھ پیسے دے دو تو جمیل کے لیے جوتا خرید لوں۔" ایک دن سکینہ نے کہا تو وہ بیزاری سے بولا۔

"کیا مطلب؟ جوتا نہیں خریدا تھا جمیل کا؟"

"اسکول کے لیے مانگتا ہے۔ کل اسکول سے واپسی میں پھٹ گیا ہے اس کا جوتا۔"

"نہیں ہیں اب پیسے۔"

"کیوں؟"

"سب ختم!"

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔"

"کیا بات نہ ہوئی؟" سمجھتی ہو نہیں بات کو اور بڑبڑ شروع کر دیتی ہو؟ بھئی اب بکری پہلے جیسی نہیں۔

"کیوں؟"

"اری کم عقل! وہ تو کرفیو لگا تو اتنا فائدہ بھی ہو گیا ورنہ...."

"اچھا بس بس۔ زیادہ بہانے بنانے کی ضرورت نہیں۔" سکینہ نے بات کاٹ دی۔

"کیا ــ؟ کیا کہا؟ بہانے بنا رہا ہوں میں؟" اس نے آنکھیں نکالیں۔ بہری ہو گیا؟ ابھی بتایا تو ہے کہ کیا حالات ہیں، پھر بھی بکواس کیے جا رہی ہو؟"

"ہاں، میں تو ہمیشہ بکواس ہی کرتی ہوں۔"

"بالکل۔"

"مجھے کیا ہے۔ جانے سچ تھا جوتا پہن کر اسکول۔"

"ہاں ہاں جائے۔"

"کیسے باپ ہو تم؟" اس کی آواز رُندھ گئی۔

"میں کہتا ہوں چپ ہو جاؤ!" وہ دہاڑا مگر وہ بولتی رہی اسے ہی قصور وار ٹھہراتی رہی، تو تو میں میں اتنی بڑھی کہ... جھگڑا انتہا پر پہنچ گیا ـــ وہ پوری قوت سے چیخا تو سکینہ ایک دم ہی چپ ہو گئی ــــ جمیل، جو بڑی دیر سے دور بیٹھا سہمی نگاہوں سے دونوں کو لڑتے دیکھ رہا تھا، ماں کی آنکھوں میں آئے پانی کو نہ دیکھ سکا ــــ آہستہ قدموں سے چلتا ہوا باپ کے پاس آیا اور پوچھا: ابو جی! کرفیو پھر کب لگے گا؟ ●●

ریزہ ریزہ دِل

شاکر کریمی

محلہ گنج نمبر ۱۔ بتیا۔ ۸۴۵۴۳۸ (بہار)

دوپہر کے بعد مشرق سے سیاہ گھنے بادل اٹھے اور اس قدر پھیلے کہ آسمان ڈھک گیا۔ تیز ہوائیں رکیں تو بارش ہونے لگی۔ بارش رُکی تو ہوائیں پھر چلنے لگیں۔ بادل منتشر ہو گئے۔ مطلع صاف ہو گیا۔ ہر شے دُھل کر نکھر گئی تھی۔ گھروں میں دبکے ہوئے لوگ سڑکوں پہ نکل آئے۔ ہر طرف چہل پہل تھی۔ آفتاب مغرب کی طرف اور جھکا تو اس کی چھپی کرنوں میں شام کی سیاہی گھلنے لگی۔ سردیوں کی آمد کا پتہ دیتی ہوئی خنک ہوائیں فرحت بخش معلوم ہو رہی تھیں۔

اُروشی ریستوراں میں شام کی چائے پی کر وہ اسٹیشن روڈ پر موسم کی خوشگوار تبدیلی سے لطف اندوز ہوتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا سامنے سے آتی ہوئی تیز رفتار فی ایٹ (F/A.T) دائیں طرف لہرائی اور تیز ہارن کے ساتھ ایک جھٹکے سے اُس کے قریب رک گئی۔ اس کے قدم لڑکھڑا گئے۔ ابھی سنبھل بھی نہ پایا تھا کہ جلترنگ سا بج اٹھا۔ مترنم قہقہے تھے تو پتھر سے بھی زیادہ شدید ضرب لگانے والا ایک لفظ کار کے اندر سے اچھل کر اُس کی سماعت کو لہولہان کر گیا ——— بزدل!

اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا کار بائیں طرف مڑی اور سیدھی ہو کر ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ خنک ہواؤں کے باوجود وہ پسینہ میں تر ہونے لگا اسے محسوس ہوا جیسے ذہن کچھ سوچنے، کچھ سمجھنے اور قدم آگے بڑھنے سے معذور ہوں۔ لمحہ بہ لمحہ بے جان ہوتے ہوئے اپنے جسم کو رکشا پر رکھ کر اپنے فلیٹ میں واپس لوٹ آیا۔ گھنٹوں پلنگ پر پڑا رہا۔ جیسے اس ایک لفظ 'بزدل' نے اس کے جسم کا سارا لہو نچوڑ لیا ہو۔ ٹھنڈے پانی سے لبریز دو گلاسوں نے کچھ سکون پہنچایا تو کچھ سوچنے کچھ سمجھنے کی صلاحیت عود کر آئی۔ مگر اضطراب ——— ابھی باقی تھا۔

جو کچھ ہوا تھا اتنی سرعت سے ہوا تھا کہ وہ سنبھل بھی نہ پایا تھا اور وہ چلی گئی تھی۔ اضطراب اور بڑھا تو اُس کے لب تھرتھرائے۔ کاش کار مجھے کچل دیتی۔ وہ مجھے تڑپتا چھوڑ کر چلی جاتی، لیکن ——— موردِ الزام صرف میں ہی تو نہیں؟ منفی خیالوں نے ڈھارس بندھائی تو اُسے تاریکی کا خیال ہوا کہ کمرہ روشن کیا۔ باہر کی خنکی کے باوجود جسم کی نمی کا احساس ہوا تو سیلنگ فین کے ریگولیٹر نمبر بڑھا کر پانچ کر دیا۔ سگریٹ جلا کر لمبے لمبے کش لینے لگا۔ دھوئیں کے پس منظر سے اُبھرتی ہوئی تصویریں متحرک ہوئیں تو ماضی کی یادیں ذہن کو کریدنے لگیں۔ متحرک تصویریں اور واضح ہونے لگیں۔

اُسے پروموشن سے خوشی ہوئی تھی۔ لیکن جب اپنے پُر رونق شہر، دوستوں کی بھیڑ اور گھر کے آسودہ ماحول سے نکل کر ہری نگر گرامین بینک میں آیا تو دو چار ہی دنوں میں اُوب گیا۔ پہاڑوں اور جنگلوں کے کنارے تھاروؤں کی بستیوں سے قریب یہ قصبہ اُسے اچھا نہ لگا۔ شوگر فیکٹری، راور سینما ہال، بے ترتیب بازار اور ہری راجہ کی دو تین پُر شکوہ عمارتوں کے علاوہ اور تھا بھی کیا؟ ہر طرف سناٹا، ویرانی۔ کہاں جائے؟ کس سے ملے؟

ایک دن مترنم آواز اُس کی سماعت سے ٹکرائی۔

"پلیز! میرا اکاؤنٹ درست کرا دیجیے!"

اُس نے اپنے سامنے کھلے ہوئے رجسٹر سے سر اٹھا کر دیکھا۔ لڑکی خوبصورت اور پُرکشش تھی۔ اُس کے آگے بڑھے ہوئے ہاتھ میں پاس بک تھی اس نے پاس بک لے لی اور سامنے کی خالی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بیٹھنے کو کہا وہ شکریہ ادا کرتی ہوئی بیٹھ گئی۔ لڑکی نے معذرت طلب نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"آج مجھے نہیں آنا چاہیے تھا۔ دوشنبہ ہونے کی وجہ سے کاؤنٹر پر کافی بھیڑ ہے ورنہ آپ کو تکلیف نہ دیتی!"

"کوئی بات نہیں۔ اطمینان سے بیٹھیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا!" اُس نے قریب سے گذرتے ہوئے چپراسی کو اشارہ کیا۔ چند لمحوں بعد چپراسی آیا تو اُس کے ہاتھوں میں چائے کے دو گلاس تھے۔

سندھ حلتے یہ اُس کی پہلی ملاقات تھی۔ اور پھر وہ بینک آتی رہی۔ اُس سے ملتی رہی۔ ملاقاتوں کا سلسلہ دراز ہوتا گیا۔ اور اسے یہ ویران

دستان قصبہ جنت نشان معلوم ہونے لگا۔

آسمان پر سیاہ و سفید بادلوں کے ٹکڑے بکھرے تھے۔ ڈھلتا ہوا آفتاب بادلوں میں روپوش تھا۔ ہر سمت ہلکی روشنی اچھی لگ رہی تھی۔ وہ بازار سے چند چیزیں لے کر لوٹ رہا تھا کہ ایک کار اس کے قریب رُک گئی۔ مانوس مترنم آواز کانوں میں رس گھول گئی۔ موسم اور سہانا ہو گیا۔

"تم تو یوں خراماں خراماں چل رہے ہو جیسے کچھ ہونے والا نہ ہو۔ جب کہ راستہ چلنے والوں کی رفتار تیز ہے!"

"کیوں، کیا ہوا؟" وہ چونک گیا۔

"پیچھے مڑ کر تو دیکھو، پچھم سے کتنی بھیانک گھٹائیں اٹھی ہیں!"

اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو سدھا کی بات کی تصدیق ہو گئی۔ "شکریہ مس سدھا۔ تم نے مجھے طوفاں کی آمد سے باخبر کر دیا!"

"آؤ آج اپنے گھر لے چلوں!"

"تم کیوں تکلیف کرو۔ میری کمین گاہ زیادہ دور نہیں!"

"تو پھر میں تم کو تمہارے گھر چھوڑ دوں!" سدھا نے بائیں طرف جھک کر کار کا دروازہ کھول دیا۔

اُس نے سدھا کے برابر میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ "گھر، پردیس میں گھر کہاں۔ ایک کمرہ کرایہ پر لے رکھا ہے!"

وہ کچھ نہ بولی۔ گیئر بدلا۔ کار چل پڑی۔ کچھ دور آگے جا کر اس نے کہا۔

"بائیں موڑ لو!"

لیکن کار بائیں نہیں مڑی۔ سیدھی چلتی رہی۔ وہ سمجھ گیا سدھا اسے اپنے گھر لے جا رہی ہے۔

چہار دیواری اور پھولوں کے چھوٹے بڑے پودوں کے درمیان دو منزلہ عمارت اسے اچھی لگی۔ سدھا اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر اندر گئی، اور فوراً ہی لوٹ آئی۔ اس کے سامنے بیٹھتی ہوئی بولی۔

"کیسا لگا میرا گھر؟"

"مکین اچھے ہوں تو مکان بھی اچھا لگتا ہے!"

سدھا نے سر جھکا لیا۔ تھوڑے توقف سے بولی: "تمہاری ایک بات مجھے اچھی نہیں لگی!"

"کیا؟"

"وہ یہ کہ، پردیس میں گھر کہاں!"

"ٹھیک ہی تو کہا میں نے!"

وہ تھوڑی دیر خاموش رہی۔ پھر بولی۔ "ایسا کیوں نہ ہو تم یہاں آ جاؤ۔ میں اوپر رہتی ہوں، تم نیچے رہنا۔ یہاں ضرورت کی ہر چیز ملے گی تمہیں!"

"ضرورت کی ہر چیز کی وضاحت کر سکتی ہو؟" اس کے لہجے میں شوخی تھی۔

وہ سٹپٹا گئی۔ نظریں نیچی کرتی ہوئی بولی۔ "مطلب یہ کہ ضروریاتِ زندگی کی ہر چیز۔ رہنا سہنا، کھانا پینا!"

دونوں خاموش تھے۔ اور باہر طوفان تیز ہوتا جا رہا تھا۔ اور جب تیز ہواؤں کے ساتھ ہونے والی بارش کے چھینٹے ڈرائنگ روم میں آنے لگے تو وہ کھڑی ہوئی۔ کھڑکیوں کو بند کر کے پھر اپنی جگہ آ کر بیٹھ گئی۔ ملازمہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ گرم گرم سموسوں اور بیسن کے پکوڑوں کی پلیٹ دونوں کے درمیان رکھ کر چلی گئی۔

"سدھا! میں تمہاری اس پیش کش کو قبول نہیں کر سکتا۔ میرا تمہارے یہاں آ کر رہنا مناسب نہ ہوگا۔ لوگ خواہ مخواہ تمہیں ۔۔۔!"

سدھا نے اس کی بات کاٹ دی۔ "یہ بزدلانہ باتیں ہیں۔ میں ایسی باتوں کی پرواہ نہیں کرتی۔ تم یہاں آ کر رہو گے تو مجھے بھی تقویت ملے گی!"

اسی وقت دروازے کا پردہ ہٹا۔ اور ڈاکٹر منوج آندھی طوفان کی طرح ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔

سدھا کا چہرہ تمتما اٹھا۔ اسے ڈاکٹر منوج کی آمد ناگوار گزری تھی۔ سدھا نے اسے بیٹھنے تک کو نہ کہا۔ ڈاکٹر منوج نے سدھا سے قطع نظر اسے دیکھا۔ آگے بڑھ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"تو آپ یہاں تک آ گئے، مسٹر نریندر!" ڈاکٹر منوج کا لہجہ تضحیک آمیز بھی تھا اور طنز آمیز بھی۔

وہ کچھ نہ بولا۔ سدھا کو ڈاکٹر منوج کی بات اچھی نہ لگی، تنک کر بولی۔

"ڈاکٹر، انھیں میں لائی ہوں۔ اپنا گھر دکھانے۔ اب یہ یہیں رہیں گے!"

"بہت اچھا۔ تب تو۔ خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو!" ڈاکٹر منوج ہنسنے لگا۔

وہ خاموش ہی رہا۔ سدھا بھی اپنی جگہ بیٹھی پیچ و تاب کھاتی رہی۔ ڈاکٹر منوج بلا اجازت سموسے اور پکوڑے کھانے لگا۔

ڈرائنگ روم میں ایک خاموش طوفان تھا۔ اور باہر کا طوفان پر شور تھا۔ اور جب تیز ہواؤں اور بارش کا زور کم ہوا تو ڈاکٹر منوج اٹھ کھڑا ہوا۔
"اچھا تو مسٹر نریندر، میں چلتا ہوں۔ گرم گرم سموسوں اور پکوڑوں کا شکریہ!" اور دروازے پر جا کر مڑتے ہوئے بولا۔
"سدھا، آج رات میرے بارے میں خوب سوچ لینا۔ میں پھر ملوں گا!" اور وہ چلا گیا۔
"یہ ڈاکٹر ہے لیکن بے ہودہ اور بدتمیز!" نفرت کے سارے جذبے اس کے ہونٹوں تک آ گئے۔
"اور مجرم بھی۔ اپنی بیوی کا قاتل۔ مغربی چپارن کا یہ علاقہ جن ڈاکوؤں کی وجہ سے منی چنبل مشہور ہے ان ڈاکوؤں کی پناہ گاہیں بھی جنگل اور تھاروؤں کی بستیاں ہیں۔ اور ان ڈاکوؤں سے اس کی سازباز ہے۔ ڈکیتی کے درمیان یا پولیس کی گولیوں سے زخمی ہونے والے ڈاکوؤں کا علاج بھی کرتا ہے یہ ڈرتا ہے تو صرف کمل سے!"
کمل ۔۔ کمل کون؟" اس نے دریافت کیا۔
"اس قصبہ کا واحد دلیر اور ہردل عزیز نوجوان۔ دو ڈھائی سال قبل، ایک رات کمل سکنڈ شو سینما دیکھ کر گھر جا رہا تھا کہ اس ڈاکٹر نے اس پر حملہ کرا دیا۔ ڈاکوؤں کی ایک گولی کمل کی بائیں ٹانگ میں ایسی لگی کہ بیچارے کی ٹانگ ضائع ہو گئی۔ ایک ٹانگ کے کمل سے یہ آج بھی خوف زدہ رہتا ہے!"
"اور جاتے جاتے اس نے کہا تھا۔ آج رات میرے بارے میں خوب سوچ لینا!" اس کا لہجہ پُر تشویش تھا۔
ایک بار پھر سدھا کا چہرہ تمتما گیا۔ پہلو بدلتے ہوئے بولی۔ "یہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ کہتا ہے اپنی پتنی کو اس لیے اپنے راستے سے ہٹایا ہے کہ تم سے بیاہ کر سکوں!" اور سدھا چیخ پڑی۔ "موسی!"
ملازمہ بھاگتی ہوئی ڈرائنگ روم میں آئی۔ "کیا ہے بیٹی؟"
"موسی، ان سموسوں اور پکوڑوں کو کوڑے میں پھینک دو!" غصہ سے سدھا کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

۔۔ دوسرے ہی دن ۔۔
وہ بینک میں اپنی جگہ بیٹھا ہی تھا کہ ڈاکٹر منوج دندناتا ہوا اس کے قریب آیا۔ اجازت طلب کرنے کی ضرورت محسوس نہ کرتے ہوئے اس کے سامنے کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ دونوں ہاتھ میز پر پھیلا کر اس کی طرف جھکتے ہوئے کہنے لگا۔
"مسٹر نریندر! میں تم سے صرف تین باتیں کہنے آیا ہوں۔ پہلی بات یہ کہ تم یہاں دو ڈھائی ہزار روپے ماہانہ کی نوکری کرنے آئے ہو۔ تمہارے گھر والوں کی بہت ساری امیدیں تمہاری ذات سے وابستہ ہیں۔ دوسری بات یہ کہ سدھا کے پیار پا کر رہنے کی غلطی نہ کرنا۔ اور تیسری بات یہ کہ تم یہاں سے اپنا تبادلہ کرا لو۔ اس کام میں، میں بھی تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔ بہت دور تک رسائی ہے میری!"
"آپ مجھے دھمکی دے رہے ہیں مسٹر منوج!" اس کی مٹھیاں کس گئی تھیں۔
ڈاکٹر منوج ہنسنے لگا۔ "نا، نا، مائی ڈیر نریندر، میں دھمکی نہیں مشورے دے رہا ہوں، مخلصانہ مشورے!" ڈاکٹر منوج اٹھ کھڑا ہوا اور بینک سے باہر جانے لگا۔
وہ جاتے ہوئے ڈاکٹر منوج کو نفرت سے دیکھتا رہا۔ گھنٹوں بعد حواس درست ہوئے تو سوچنے لگا۔ "ڈاکٹر منوج نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ میرے گھر والوں کی بہت ساری امیدیں میری ذات سے وابستہ ہیں۔ اور پھر یہ کہ ۔۔ ڈاکٹر منوج خطرناک بھی ہے اور با اثر بھی۔ اگر واقعی مجھے کچھ ہو گیا تو ... تو؟" اور اس 'تو' کا جواب ڈھونڈتے ہوئے اسے دو ہفتے بھی نہیں گزرے تھے کہ ایک دن ہیڈ آفس سے ایک لفافہ آ گیا۔ اسے فوری ہیڈ آفس طلب کیا گیا تھا۔ اب اس میں شک کی کوئی گنجائش نہ تھی کہ ڈاکٹر منوج با اثر ہے۔ اس نے سدھا سے ڈاکٹر منوج کی بات نہیں بتائی تھی۔ وہ سدھا کو ذہنی طور پر پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ہیڈ آفس جاتے ہوئے اس نے سدھا سے کہا تھا "میں بہت جلد واپس آ جاؤں گا۔ اور سدھا نے نمناک آنکھوں اور بجھے ہوئے دل سے اسے رخصت کیا تھا۔
لیکن وہ پھر کبھی واپس نہ جا سکا۔ ہیڈ آفس سے اس کا تبادلہ موتی پور کر دیا گیا۔ اور وہ قریب چھ ماہ سے موتی پور میں رہ رہا تھا۔ اور آج سدھا سے اس کا سامنا اس طرح ہوا تھا کہ وہ گرتے گرتے بچا تھا۔ کار کے اندر سے اچھل کر اس کی سماعت کو لہولہان کر دینے والے اس ایک لفظ نے اس کے وجود کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔
عالم اضطراب میں کئی دن گزر گئے۔
اور پھر ایک شام ۔۔ وہ بینک سے نکل کر اپنے قریبی فلیٹ کی طرف جا رہا تھا کہ سامنے سے آتی ہوئی کار اس کے سامنے رک گئی۔
"ہیلو، مسٹر نریندر!"
آواز کی سمت اس کی نظر اٹھی تو وہ لڑکھڑا گیا۔ سدھا کے دونوں ہاتھ اسٹیرنگ پر تھے۔ وہ مسکراتی ہوئی اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ اکیلی نہ تھی۔ اس کے ساتھ ایک بارعب جوان شخص بھی تھا۔ وہ اپنے ساتھ بیٹھے اس بارعب شخص سے بولی۔
"ان سے ملو، یہی ہیں مسٹر نریندر!"

(باقی ۲۰۱ پر)

تنہا تنہا

شہباز صدیقی

پوسٹ آفس بکس ۴۰۰ ظہران ائرپورٹ ظہران ۳۱۹۳۲ سعودی عرب

لفٹ سے نکل کر وہ جیسے ہی باہر آیا کئی آوازوں نے اس کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

"ہائے ہیرو ـــــ مبارک ہو۔ آج تو تم نے کمال کر دیا۔"

"ہیلو رومیو ـــــ آج کی شام تمہارے نام۔"

"عامر صاحب۔ پہلا انعام مبارک۔"

یہ سب اس کے دوست اس کے کولیگ اور ہم جماعت تھے۔ آج مہاراشٹر کالج کے ٹاپ فلور پر واقع لائبریری میں افسانہ ریڈنگ کا انٹر اسٹیٹ مقابلہ تھا۔ اور پچھلے دو سالوں کی طرح اس سال بھی عامر کو اس کے افسانے "بیر بہوٹی" پر پہلا انعام ملا تھا۔ وہ ہمیشہ رومانی افسانے لکھتا تھا اس لیے اس کے ساتھی لڑکے اور لڑکیاں اس کو اکثر ہیرو، رومیو وغیرہ کے نام سے بلاتے تھے۔

اس نے مسکرا کر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور پھر جیسے اس کی نگاہیں ٹھٹھک کر رہ گئیں۔ وہ گراؤنڈ ہال کے دوسرے سرے پر سب سے الگ، سب سے دور کھڑی تھی۔ اس کے نازک ہاتھوں میں اک فائل دبی ہوئی تھی اور وہ ہال کے باہر تاریک آسمان کو اک ٹک گھورے جا رہی تھی کسی تصویر کی مانند۔ درمیانے قد کی وہ خاموش خاموش سی لڑکی اس لمحہ عامر کو بہت اچھی لگی۔ سب لوگ ایک دوسرے سے خوش فعلیوں میں مصروف تھے مگر وہ بالکل تنہا سب سے دور کھڑی تھی۔ عامر کے قدم خود بخود اس کی جانب بڑھ گئے۔

"سنیے۔!" وہ اس کے قریب پہونچ کر بولا۔

"ج... جی ـــ اوہ آپ" وہ ایکدم چونک کر اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"میں عامر ہوں ـــــ!"

"میں جانتی ہوں ـــ" اس نے تیزی سے اس کی بات کاٹ دی "آپ اس کالج کے بہت اچھے افسانہ نگار ہیں۔ آج کی کامیابی مبارک ہو۔"

عامر حیران رہ گیا۔ وہ خوبصورت سی لڑکی اس کو پہچانتی تھی اور وہ اس کو آج پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ اس نے غور سے اس کی جانب دیکھا اور پھر جیسے اس کا دل دھک سے اڈٹ کر رہ گیا۔ لڑکی کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔

"آپ.... آپ شاید رو رہی تھیں ۔ ابھی کچھ دیر پہلے تک" وہ آہستہ سے بولا۔

"جی ہاں۔ وہ ایسی ہی خوبصورت شام تھی۔ فرق صرف جگہ کا ہے اس شام میں کسی کالج میں نہیں بلکہ ہاسپٹل میں تھی۔ جہاں میری سب سے عزیز سب سے پیاری سہیلی نے دم توڑا تھا" ۔ اس کی آواز لرز گئی۔

"اوہ۔ آئی ایم سوری ۔" عامر نے آہستہ سے کہا "کیا ہوا تھا اس کو" اس نے رساً پوچھا۔

"کینسر" اس نے مختصر سا جواب دیا۔

"آپ کی بہت گہری دوست تھی؟"

"وہ میری دوست نہیں تھی ـــ وہ" میں "تھی"۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا اک اور ریلا امڈ آیا۔

"آپ صبر کریں۔ بہادر بنیں" عامر نے اسے دلاسہ دیا تو اس نے اک لمحہ کے لیے اپنی اداس نظروں سے عامر کو دیکھا اور وہ اسی لمحے میں اداسیوں، ویرانیوں اور زخموں سمیت عامر کے دل میں اتر گئی۔

"آپ اپنا نام بتائیں گی؟" عامر نے پوچھا۔ "ارمانہ" اس نے آہستہ سے کہا۔

"پڑھتی ہیں؟"

"جی تھرڈ ائیر فائن آرٹس میں" وہ بھی میری کلاس فیلو تھی۔ بہت اچھی تصویریں بناتی تھی"۔ اس کی آواز میں یاد اور دکھ کی چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔

"مجھے آپ سے ہمدردی ہے" عامر نے عام استعمال ہونے والے فقرے کہے۔

"شکریہ" ارمانہ پہلی بار، بہت آہستہ سے مسکرائی۔ عامر شرمندہ ہوگیا۔

"مجھے واقعی آپ سے ہمدردی ہے۔" اس نے خفت مٹانے کے لیے کہا۔

"واقعی ۔۔۔؟" ارمانہ نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں۔ "واقعی شکریہ" وہ چھوٹے سے رومال سے آنکھیں صاف کرتی ہوئی گیٹ کی طرف بڑھ گئی اور عامر اس کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر وہ باہر برقی روشنیوں سے گزرتی ہوئی کہیں گم ہوگئی۔

وہ عامر کے دل کے حساس تاروں کو چھیڑ کر خود بمبئی کے ہجوم میں غائب ہوگئی۔ وہ اس کو تلاش کرتا رہا مگر وہ نہ جانے کہاں کھو گئی تھی۔ مہاراشٹر کالج میں اپنی جان پہچان والی لڑکیوں سے بھی اس نے ارمانہ کے بارے میں پوچھا مگر کوئی بھی اس کے بارے میں نہ بتا سکی۔ عامر ایک حساس افسانہ نگار تھا۔ اُس نے ارمانہ کے سراپا پر کئی افسانوں کے خاکے تخلیق کیے مگر وہ کسی بھی کہانی کو انجام تک نہ پہونچا سکا۔ اُس کے افسانوں کی طرح اس کی زندگی بھی تشنہ ہوگئی تھی۔ اکثر شام کے سائے گہرے ہونے لگتے تو وہ بھیگی بھیگی سی آنکھوں والی لڑکی اس کو یاد آجاتی تب اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے اس نے ارمانہ کو دور کہیں خوابوں کے جزیروں پر دیکھا ہو۔ کبھی وہ اس کو مدھم مدھم برستی رم جھم پھواروں کے اُس پار نظر آتی اور پھر غائب ہوجاتی۔ اس درمیان اس کو کتنے لوگ ملے، مگر لوگوں کے ہجوم میں وہ کہیں دکھائی نہ دی۔ وقت گزر رہا تھا اور ارمانہ سے پہلی ملاقات والی شام کے سائے دھندلے پڑنے لگے تھے مگر وہ بھیگی آنکھوں والی اجنبی لڑکی اب بھی اس کے دل پر نقش تھی۔

ایسے ہی گزرتے ہوئے بوجھل وقت میں عامر نے سنا کہ نیشنل کالج آف آرٹس میں اسٹوڈنٹس اپنی تصویروں کی نمائش کر رہے ہیں۔ تب اسے بے ساختہ ارمانہ یاد آگئی۔ ممکن ہے کہ اس کالج میں اس نمائش میں ارمانہ بھی موجود ہو۔ نمائش کے روز عامر بھی وہاں پہونچا۔ گیلری کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک خوبصورت تصویریں آویزاں تھیں۔ لیکن اُسے ارمانہ کہیں نظر نہ آئی۔ وہ تصویروں کو دیکھتا رہا اور دل ہی دل میں سراہتا رہا۔ اک تصویر پر اس کی نظریں جم کر رہ گئیں۔ یہ رخصت ہوتی ہوئی ڈولی میں بیٹھی اک لڑکی کی تصویر تھی۔ ڈولی سے اس کا نصف چہرہ جھانک رہا تھا۔ ڈولی کے سامنے اُس کا غریب باپ آنکھوں میں آنسو اور چہرے پر بے بسی لئے کھڑا تھا۔ پس منظر میں دوسرے بہت سے لوگوں کے سائے دکھائے گئے تھے۔ لڑکی کی روتی ہوئی نظریں بوڑھے باپ کے چہرے پر ٹکی ہوئی تھیں۔ ڈولی کے سامنے والے حصے میں دو تین لوگ شہنائیاں بجا رہے تھے۔ بڑا ہی تاثر انگیز منظر تھا۔

"ویری فائن" بے اختیار عامر کے ہونٹوں سے نکل گیا۔ اُس نے آئل پینٹ کی ہوئی تصویر کے آخری کنارے پر نظر ڈالی وہاں آرٹسٹ کا چھوٹا سا باریک سا نام لکھا تھا "ارمانہ"۔

"ارمانہ۔ کیا یہ تم ہو ارمانہ یا کوئی اور ۔۔۔؟" وہ بے ساختہ آہستہ سے بڑبڑانے لگا۔

"جی ۔۔۔" سامنے کھڑی ہوئی لڑکی نے مڑ کر دیکھا۔ وہ سچ مچ ارمانہ ہی تھی۔ ارمانہ اس کو دیکھتے ہی بول پڑی۔

"اوہ۔ رائٹر ۔۔۔ کیا کسی نئی کہانی کی تلاش میں ہیں آپ؟"

"ہاں سچ مچ اک ادھوری کہانی کی تلاش میں ہوں ۔۔۔" وہ بڑی طمانیت سے مسکرا پڑا۔

"ادھوری کہانی ۔۔؟"

"ہاں ادھوری کہانی ۔۔۔ اُس کا مرکزی کردار اک شام خاموشی سے اپنے بارے میں بغیر کچھ بتائے لوگوں کے اس سمندر میں گم ہوگیا تھا اسی کی تلاش اور جستجو مجھے یہاں تک لے آئی ہے۔" وہ اس کی آنکھوں میں جھانک کر بولا۔

"پھر وہ کردار یہاں کہیں ملا آپ کو؟" وہ مسکرا رہی تھی۔

"جی ہاں ۔۔۔ خدا اس طرح بھی مہربان ہوتا ہے۔ مرا کھویا ہوا کردار مرے سامنے ہے۔" عامر نے کہا تو وہ اک دم ہنس پڑی۔

"یہ تصویر آپ نے بنائی ہے؟" اُس نے تصویر کی طرف اشارہ کیا۔

"جی ۔۔۔" وہ پھر مسکرا دی۔ آج وہ قطعی مختلف لڑکی نظر آرہی تھی۔ مگر اس کی آنکھیں آج بھی اُداس اُداس سی تھیں۔ "یہ ساتھ والی تصویر میری دوست فریدہ کی ہے۔" اس کے چہرے پر اداسی کے سائے لرزنے لگے۔

"فریدہ بہت خوش نصیب لڑکی تھی جسے آپ اس قدر عزیز رکھتی ہیں۔" عامر نے گہرا سانس لیا۔ اسے واقعی فریدہ کی قسمت پر رشک آرہا تھا۔ یہ پیاری سی لڑکی ہر جگہ اپنی دوست کی یادوں کو ساتھ ساتھ لیے پھر رہی تھی۔ اس بھری دنیا میں بھلا کون کسے یاد رکھتا ہے۔

وہ سوچ میں گم تھا اور ارمانہ اس کو بڑی گہری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"سب لوگ گروپس کی صورت میں پھر رہے ہیں۔ آپ تنہا کیوں ہیں رائٹر ۔۔۔؟ آپ کا کوئی دوست نہیں ہے؟" ارمانہ نے عجیب سا سوال کیا۔

"ایسی بات تو نہیں ۔۔۔ مرے تو سینکڑوں دوست ہیں" وہ چونک کر بولا۔

"تب ہی آپ اس قدر اکیلے ہیں؟" ارمانہ ہنس دی۔

"میں آپ کو تنہا نظر آرہا ہوں؟ آپ میرے ہمراہ نہیں ہیں؟" وہ مسکرا دیا۔ "آپ تو بہت خوبصورت باتیں کرتی ہیں۔"

"آپ سچ مچ کے رائٹر ہیں۔ میں باتوں میں آپ سے نہیں جیت سکتی۔" وہ ہنس کر بولی۔

"ہارنے کو اب میرے پاس بچا بھی کیا ہے۔" وہ اس کو دز دیدہ نگاہوں سے دیکھ کر بولا "اور میرا نام عامر ہے۔ رائٹر نہیں۔"

"اک ہی بات ہے، عامر بھی آپ کی پہچان ہے اور رائٹر بھی۔ یہ آپ کی شخصیت کے دو سائے ہیں۔" وہ بہت اچھی باتیں کرتی تھی۔

اس طرح وہ دونوں اک دوسرے کے اور بھی قریب ہو گئے۔ عامر نے ارمانہ کے لیے اپنے دل کا دروازہ کھول دیا تھا۔ اگلے ہفتے وہ ارمانہ کے کالج پہونچ گیا وہ اس کو گیٹ پر ہی مل گئی۔

"ارے رائٹر ــــ آپ؟" وہ ایک دم سے خوش ہو گئی۔

"گھر جا رہی ہو ــــ چلو میں چھوڑ آؤں" وہ فٹ پاتھ کے کنارے کھڑی اک خالی ٹیکسی کی طرف اشارہ کرتا ہوا بولا۔

"آجاؤں ــــ!" اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں خوشی کی کرنیں جگمگا رہی تھیں۔

"آجاؤ ــــ" وہ جواباً ہنس پڑا۔ وہ دونوں ٹیکسی میں بیٹھ گئے اور ٹیکسی چل پڑی۔

"اسے کہتے ہیں جان بوجھ کر جنگل میں کھو جانا اور پھر تمام عمر جنگل سے نکلنے کے لئے ترستے رہنا۔" وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے عجیب سے انداز میں بولی "بعض بھول انسان خوشی کے سبب کر جاتا ہے مگر..." بات ادھوری چھوڑ کر وہ سامنے دیکھنے لگی۔

ارمان ــــ مجھے اک بات بتاؤ ــــ تم اس قدر اداس کیوں رہتی ہو۔ خوش رہا کرو ــــ" عامر نے کہا۔

"کسی چیز کی محرومی انسان کو بہت تنہا تنہا اور اداس کر دیتی ہے رائٹر۔" اس نے کہا "میں چاہتی ہوں کہ زندگی کا ہر ہر لمحہ خوشیوں کے لیے وقف کر دوں۔ لیکن یہ اداسیاں میرے دل میں رچ بس چکی ہیں۔ بات یہ ہے عامر کہ میں اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد ہوں اور بس اکلوتے اکیلے ہی ہوا کرتے ہیں۔ بچپن میں بھی جوانی میں بھی اور بڑھاپے میں بھی۔ پھر مجھے فریدہ مل گئی میں اس کو اپنا ہی وجود سمجھتی تھی مگر موت نے اس کو بھی مجھ سے چھین لیا۔ انہی محرومیوں نے میری روح میں تنہائیوں کے سائے بھر دیئے ہیں۔ میں اپنے آپ کو ہر جگہ ہر لمحہ اکیلا ہی محسوس کرتی ہوں۔"

"اب بھی اکیلی ہو ــــ اب تو میں تمہارے ساتھ ہوں ــــ" عامر مسکرا پڑا۔

"آپ نے تو آ کر مجھے اور بھی اکیلا، اور بھی تنہا کر دیا ہے عامر ــــ" وہ گہری نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"وہ کیسے؟" عامر حیرت زدہ رہ گیا۔

"یہ بھی بتاؤں؟" ارمانہ کی سیاہ آنکھیں بدستور اس کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ جن میں اک شکایت تھی۔ تشنگی اور محرومی تھی عامر کا دل تڑپ گیا۔ "انسان سڑکوں پر نہیں بکتے کہ جسے جب جی چاہا خرید لیا۔ یہ تو سب تقدیر کے کام ہیں۔" وہ پلٹ کر سامنے سڑک کی طرف دیکھنے لگی

اس دن گھر آیا تو اس کا جی بہت بھاری تھا۔ وہ اس پیاری سی لڑکی کے دکھ درد بانٹ لینا چاہتا تھا۔ وہ اس کو محرومیوں اور تنہائیوں

"عامر — جس کہانی کا کوئی انجام نہ ہو اسے لکھنے کا فائدہ؟" ارمانہ نے پھر اپنی خوبصورت آنکھوں سے اسے دیکھا اور عامر کا دل بجھنے لگا۔ اس نے اپنے بارے میں ارمانہ کو سب کچھ بتا دیا تھا۔

"تم تو ارمانہ سچ مچ دیوانی ہو۔"

"نہیں عامر — میں دیوانی نہیں، سچی ہوں۔ میں فریدہ کے بعد بہت تنہا ہو گئی تھی۔ وہ میری بہن کی طرح تھی۔" اس کی آنکھیں پھر نم ہونے لگیں۔ "اور آپ عامر..... آپ نے مجھے جیتے جی....."

"ارے ارے ......" عامر نے اس کی بات کاٹ کر موضوع بدلا۔ "جب تمہارا بیاہ ہو جائے گا نا۔۔۔ اصل میں تمہاری تنہائی تب دور ہو گی۔ تمہارا ساتھی تمہیں اتنی محبت دے گا کہ تم سب دکھ، سارے غم بھول جاؤ گی۔ اور تو اور تم رائٹر عامر کو بھی بھول جاؤ گی۔" عامر نے دل پہ پتھر رکھ کر ہنسنے کی کوشش کی۔

ارمانہ نے اس کی بات سن کر بری طرح اپنے ہونٹ کاٹے۔ وہ بات بدل کر بولی "سنو عامر۔ یہ سورج کتنا بوڑھا ہو گیا ہے لیکن پھر بھی روز نکلتا ہے۔ اور ڈوب جاتا ہے۔ تھک گیا ہو گا بے چارہ۔" وہ دونوں سورج کو دیکھنے لگے جو دور سمندر کے اس کنارے پر تھکے ہارے مسافروں کی طرح ٹکا ہوا تھا۔ اور عامر سوچ رہا تھا۔ یہ لڑکی گم صم۔ کھوئی کھوئی سی کس قدر پرکشش لگتی ہے جب یہ ہنسا کرے گی۔ اس کے ہونٹوں پر کھلتی ہوئی مسکراہٹ ہو گی تب یہ کتنی حسین لگے گی۔ کاش تب میں بھی اسے دیکھ سکوں۔

"کیا سوچنے لگے عامر —؟" اس کو سوچوں میں گم دیکھ کر وہ بول پڑی۔

"تمہاری باتیں ارمان، اک گھنے جنگل کی مانند ہیں۔ جس دن تم اس جنگل سے نکل آؤ گی، بہت خوش رہو گی۔" وہ اس کو پیار سے دیکھنے لگا۔

"عامر لگتا ہے۔ میں اس گاؤں کی طرف جا رہی ہوں، جہاں میرا کوئی خیر خواہ کوئی ہمدرد نہیں ہے۔" اس کی آنکھوں کی اداسی اور بڑھ گئی۔

"ارمانہ! خدا نے تمہیں کتنی اداس آنکھیں دی ہیں" عامر نے بے پناہ ہمدردی سے سوچا "یا تم نے خود ان کو اداس بنا لیا ہے۔ ارمان۔ کاش تمہاری آنکھوں میں خوشیاں ہوتیں، تم مجھے ہر لمحہ مسکرا کر دیکھتیں۔"

"تم نے اپنے آپ کو بھول بھلیوں میں ڈال رکھا ہے۔ دیکھو میری اک بات مانو۔ تمہیں میری قسم، سدا خوش رہا کرو۔ اداس مت رہا کرو۔ زندگی خدا کا سب سے پہلا اور آخری تحفہ ہے۔ یہ قیمتی تحفہ انسان کو صرف ایک بار ملتا ہے۔ اسے یوں مت گنواؤ! تم خوش رہو گی تو میرا دل بھی خوش ہو گا۔" وہ نہایت خلوص اور محبت سے کہہ رہا تھا۔

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں عامر — لیکن مجھے ایسا کام کہو جو مرے بس میں ہو۔ جو میں کر سکوں۔ اگر کسی کو کوئی مرض ہو جائے تو وہ کیا کرے؟"

"کیا کرے؟ اس مرض کا علاج کرے۔" عامر ہنس دیا۔

"اور اگر علاج بھی نہ ہو — تو؟" ارمانہ نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر کہا۔ فرض کرو مجھے عامر سے محبت ہے یا اس سے بھی بڑھ کر کوئی شے ہے جس کے بغیر میں جی نہ سکوں۔ اس کا حصول میرے لیے بہت لازمی بہت ضروری ہے۔ اور عامر مرا نہیں ہے وہ کسی بھی لمحے مجھ سے چھن سکتا ہے۔ زندگی کی طرح۔ روح کی مانند یہ خوف مجھے دیمک کی طرح کھا رہا ہے۔ میں پھر بھی زندہ ہوں بتاؤ ان المیوں کا ہے کوئی علاج؟" ارمانہ بول رہی تھی۔ عامر لاجواب تھا۔ ارمانہ کی آواز میں صدیوں کے دکھ اور زخم تھے۔

"تم واقعی دیوانی ہو، پاگل، جھلی ہو —" وہ پیار بھرے غصے سے بول پڑا۔

"عامر میں یہ جانتے ہوتے بھی کہ آپ مرا مقدر نہیں ہیں۔ خدا سے آپ کی بھیک مانگوں تو ..... تو بھی آپ مجھے محض دیوانی کہیں گے۔ جھلی کہیں گے۔" ارمانہ نے مایوسی سے سر جھکا۔

"ارے ارمانہ بیگم۔ خدا سے جو سچے دل سے مانگا جائے ناں' وہ ضرور ملتا ہے، سمجھیں۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر مسکرایا۔

"اچھا —" وہ حیرت سے مسکرا پڑی اور عامر سر ہلا کر اسے دیکھنے لگا۔

پھر اک روز ارمانہ جامراشٹر کالج میں چلی آئی۔ بغیر کسی اطلاع کے۔ وہ عامر سے ملنے کے لئے بے چین تھی۔ اور پریشان لگ رہی تھی۔ عامر اسے دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔

"ارے ارمان۔ تم —؟"

"آپ یہاں سے چلئے — کہیں بیٹھ کر اطمینان سے باتیں کریں گے۔" ارمانہ بولی۔

"وہ دونوں کالج کے کینٹین میں آ کر بیٹھ گئے۔" عامر بولا۔

"کیسی ہو تم؟"

"ٹھیک تھی —" ارمانہ کی آواز بکھری ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور ان میں بے شمار آنسو مچل رہے تھے۔

"کیا ہوا —؟" عامر نے گھبرا کر پوچھا۔

"کچھ نہیں — آپ کے لیے اک اچھی خبر ہے۔" ارمانہ نے جواب دیا اور بازوؤں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔

"کچھ بتاؤ بھی ناں! پلیز — کیا ہوا؟" عامر نے اس کا چہرہ بازوؤں سے الگ کرتے ہوئے پوچھا۔

"میں .... میں آپ سے بچھڑ رہی ہوں عامر۔ زندگی میں آنے والے تمام دنوں کے لیے۔ لوگ مجھ سے آپ کا تصور بھی چھین لیں گے۔ آپ نہیں جانتے۔ میں آپ کے بغیر مر جاؤں گی۔" وہ پھر رو پڑی۔ "پپا میری شادی کر رہے ہیں۔ میں مر جاؤں گی عامر۔"

"سنو ارمان۔" وہ ایکدم اداس ہو گیا۔ اس کا جی چاہا ارمانہ کے سارے دکھ سمیٹ لے۔ "حوصلہ رکھو۔ اس طرح مت روؤ ارمان۔"

"میرا دم گھٹ رہا ہے عامر۔ مجھے بچا لو۔" ارمانہ نے آنسو بھری آنکھوں سے اس کو دیکھا۔

"میں بچا لوں — ؟ یہ میرے اختیار میں ہے — ؟ پھر ابھی میں ہوں کیا ارمان۔ تین ماہ کی تعلیم اور ہے پھر اس کے بعد ہی کچھ کر سکتا ہوں۔ پھر سوچو تو۔ مری امی۔ مرے ابو، سارا خاندان مجھ سے ناراض ہو جائے گا۔ وہ لوگ مجھے خاندان سے باہر نکال پھینکیں گے۔ ارمانہ مجھے تم سے بے حد محبت ہے مگر ہمارے راستے بہت جدا ہیں بتاؤ میں کیا کروں؟" وہ پریشان ہو گیا۔

"مجھے اس اندھیرے سے بچا لو۔ میں مرنا نہیں چاہتی۔" وہ بچوں کی طرح مچل کر بولی اور سر جھکا کر رونے لگی۔

"ارمان — گھبراؤ نہیں سب ٹھیک ہو جائے گا۔" عامر نے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیے۔

"عامر —" ارمانہ کی آنکھوں میں زندگی کی چمک لہرائی۔ "میں اپنی ممی اور پاپا سے کہہ دوں گی کہ میں عامر کے علاوہ کسی اور کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔"

"ارمانہ — یہ ناممکن نہیں ہے۔ تم میرا انتظار کرنا۔" اس نے پورے خلوص سے کہا۔

"آپ آئیں گے؟" ارمانہ نے پوچھا۔

"میں پوری کوشش کروں گا۔"

"وعدہ — ؟"

"میں پوری کوشش کروں گا۔" اس نے دوبارہ کہا۔ "میں آؤں گا۔ خوشیاں لے کر۔"

"اچھا عامر — ! میں اب چلتی ہوں۔ خدا حافظ۔" ارمانہ نے کہا اور کینٹین سے باہر چلی گئی۔

ارمانہ کے جانے کے بعد اک سناٹا رہ گیا۔ اک خاموشی۔ اک چپ، اک تنہائی رہ گئی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے بے آواز آندھی چل رہی ہو اور سب کچھ بکھر رہا ہو۔

تعلیم ختم کر کے وہ ہانگ کانگ چلا گیا۔ اُسے اک بہت اچھا جاب مل گیا تھا۔ دوسرے وہ اس طرح گھر والوں کے دباؤ سے بھی محفوظ رہ سکتا تھا۔ ہانگ کانگ جا کر اس نے اپنے دو تین اچھے دوستوں کو خط لکھے اور ارمانہ کا حال جاننے کی کوشش کی مگر ان میں سے کوئی بھی ارمانہ کے بارے میں نہ جان سکا۔ تقریباً آٹھ ماہ بعد گھر سے امی کا خط آیا۔ انھوں نے عامر کا رشتہ عامر کے ابو کے دوست کی بیٹی سے ختم کر دیا تھا۔ دونوں کے درمیان کوئی سخت رنجش پیدا ہو گئی تھی اور اس کی وجہ سے برسوں پرانا رشتہ بھی منسوخ ہو گیا۔ عامر کا دل خوشی سے مچل اٹھا۔ اب وہ آزاد تھا۔ اب وہ ارمانہ کو خوشیاں ہی خوشیاں دے سکتا تھا۔ ٹھیک اک سال بعد وہ بمبئی آ گیا۔ اس نے ارمانہ کو تلاش کیا مگر ارمانہ اسے نہ ملی۔ ارمانہ کی جن جن سہیلیوں کو وہ جانتا تھا اس نے سب سے اس کے بارے میں پوچھا مگر کوئی بھی اسے ارمانہ کے بارے میں نہ بتا سکا۔ دو ماہ کی مسلسل تلاش کے بعد وہ پھر ہانگ کانگ واپس آ گیا۔

ہانگ کانگ میں پورے چار سال گزار کر وہ ہمیشہ کے لئے بمبئی آ گیا۔ بمبئی میں ہی اُس نے اک شپنگ کمپنی میں سروس کر لی۔ گھر والے شادی کے لیے دباؤ ڈال رہے تھے مگر وہ ٹالتا جا رہا تھا۔ اس کو ارمانہ کی تلاش تھی۔ کمپنی کے کام سے وہ اکثر مدراس، دہلی، کلکتہ وغیرہ جاتا رہتا تھا۔ اس بار بھی وہ دو روز قبل کچھ ضروری ڈاکومنٹس کلیئر کرانے کے لیے دہلی آیا ہوا تھا۔ دو دنوں میں اس نے اپنا کام نمٹا لیا تھا اور مزید دو تین دن رک کر دہلی کی سیر کرنا چاہتا تھا۔ اس وقت شام ڈھل رہی تھی۔ بازاروں میں برقی قمقمے جگمگا اٹھے تھے۔ وہ ٹیکسی کے انتظار میں کھڑا تھا۔ ذرا فاصلے پر سڑک کے پار شوروم اور دکانیں جگمگا رہی تھیں۔ فٹ پاتھ پر کھڑے کھڑے اس کی نگاہیں دکانوں کا سرسری جائزہ لے رہی تھیں۔ اک دکان کے شیشے کے دروازے کے پیچھے اچانک اس کو اک جانا پہچانا چہرہ نظر آیا۔ یہ خوبصورت چہرہ ارمانہ سے ملتا جلتا تھا۔ عامر کا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ اور وہ بے وجہ دھڑکنا نہیں بھولا تھا۔ گہرے سبز رنگ کے لباس میں ملبوس وہ ارمانہ ہی تھی۔ سڑک پر اس لمحے ٹریفک کا سمندر رواں دواں تھا۔ وہ کوشش کے باوجود سڑک پار نہیں کر سکا۔ ٹریفک ذرا کم ہوا تو وہ بھاگ کر سڑک کے اس طرف پہنچ گیا۔ ارمانہ اُسے واضح طور پر نظر آ رہی تھی کیونکہ وہ روشنیوں کے نیچے تھی۔ اُس نے دیکھا ارمانہ کسی سے ہنس ہنس کر گفتگو کر رہی تھی۔ اس کی بڑی بڑی روشن آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔ آج اس کی حیران اور اداس آنکھوں میں بڑا سکون تھا۔ اس کے چہرے پر زندہ دلی تھی۔ لگتا تھا اداسی کبھی چھو کر بھی نہیں گزری۔ اس کے دہکتے ہوئے گلابی رخساروں پر خوشیوں کا سونا چمک رہا تھا۔ وہ ہنس رہی تھی۔ مسکرا رہی تھی۔ عامر کی اک خواہش کی تکمیل ہو رہی تھی۔ لیکن آج وہ پہلے والی ارمانہ نہیں لگ رہی تھی۔ وہ کوئی اور ہی ارمانہ تھی۔ عامر کے دل میں شور سا اٹھنے لگا۔ اس کا جی چاہا وہ ارمانہ کو پکڑ کر پوچھے تم کہاں چلی گئی تھیں۔ کہاں غائب ہو گئی تھیں؟ اب میں آ گیا ہوں۔ تمہارا انتظار ختم ہو گیا ہے۔ تم ہمیشہ

(باقی ۱۹۶ پر)

اسٹینڈرڈ

شمع خالد

۲۳ ۸، سیٹلائٹ ٹاؤن راولپنڈی (پاکستان)

اس کا آفس شہر کے خوبصورت دفاتر میں سے ایک تھا۔ میں جب اُسے آفس کی باتیں کرتے سُنتا۔ تو سوچتا کہ شاہجہاں کو اپنے تاج محل سے بھی اتنا ہی پیار ہوگا جتنا سیمی کو اپنے آفس سے۔ وہ اکثر بڑے فخر سے کہا کرتی کہ "میری خواہش ہے میرا دم بھی اسی آفس میں نکلے"۔ وہ کبھی اپنے آفس ٹیبل کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملاتی۔ تو کبھی ہم رنگ پردوں، دیواروں اور قالین کی تعریف میں رطب اللسّان رہتی۔ میں اُسے ٹھہرانے کے لیے کہا کرتا ابھی سوز بزنس کے لیے آفس ہے۔ بس ٹی۔ وی کے ایڈ کی طرح جہاں تک کیمرے کی آنکھ پہنچے۔ مشین بی مشین اور اس کے آگے پیچھے اندھیرا کاٹھ کباڑ"۔ کبھی کبھی وہ میری بات پر بھڑک اٹھتی۔ اور جب اچھے موڈ میں ہوتی تو کہتی" ہاں۔ آفس کیمرے کی آنکھ کی RANGE کے اندر کے لیے ہی ہے۔ آخر میرا کام بھی تو ماڈلنگ۔ اور ایڈورٹائزنگ کا ہے نا۔ وہ اپنے نئے ٹیلیفون سیٹ کو دیکھ کر خوشی سے پاگل ہو رہی تھی۔ اور بچوں جیسے اشتیاق سے بتا رہی تھی کہ اس کی غیر موجودگی میں کال ریکارڈ بھی ہو جاتی ہے۔ ایک دفعہ نمبر فیڈ کر دو۔ تو خود بخود فون اُس نمبر کو ملا دیتا ہے۔ اب دیکھو نا۔ بار بار ڈائل جیسے بچے کھلونا پاتے ہوتے ہیں۔ چہرے پر معصوم سی مسکراہٹ گال خوشی سے تمتا رہے۔ اور میں دیکھ کر سوچتا سیمی واقعی معصوم ہے۔ یا بے تماشہ خرانٹ۔ اور خود ہی جواب دیتا کہ خرانٹ ہے وہ اپنے معاملات میں، لیکن اس کے اندر کا معصوم لالچی حریص بچہ آج بھی زندہ ہے۔ شاید اسی لیے زندگی کے تمام رنگ اس عمر میں بھی اس کے چہرے پر دمک رہے ہیں۔ میں سوچ میں گم تھا۔ لیکن وہ اپنی رَو میں فون کی تعریفیں کیے جا رہی تھی۔ بھئی اس فون کو ایک دفعہ نمبر فیڈ کر دو تو وہ نمبر جونہی خالی ہوگا۔ یہ وہ مطلوبہ نمبر ملا دے گا۔ بار بار ڈائل کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ میری غیر موجودگی میں کال بھی ریکارڈ ہو جائے گی۔ وہ اور جانے کیا کیا کہتی رہی۔ لیکن میں اس کے چہرے پر پھیلی خوشی کے رنگ دیکھتا رہا۔ وہ اس ننھی بچی کی طرح لگ رہی تھی جو تتلی کے پیچھے بھاگتی بھاگتی جائے۔ اور بے خیالی میں تتلی خود ہی اس کے ہاتھ پر آ بیٹھے۔ آخر میں نے اُسے کہہ ہی دیا۔ سیمی تم کتنی معصوم ہو، بالکل ننھی سی بچی۔ میری بات سن کر وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔ اُس کی ہنسی میں حقائق کی تلخی اتنی زیادہ تھی۔ کہ میں شرمندہ سا ہو گیا۔

سیمی سے میری پہلی ملاقات ریڈیو کے ایک پروڈیوسر کے کمرے میں ہوئی تھی۔ اُسے وہاں دیکھ کر مجھے نہ جانے کیوں بُرا لگا۔ اور میرا جی چاہا اُسے وہاں سے لے کر بھاگ جاؤں۔ سٹوڈیوز سے وہ آڈیشن دے کر نکلی۔ تو یہ سن کر مجھے بے حد خوشی ہوئی، کہ وہ فیل ہو گئی ہے۔ لیکن کچھ دنوں بعد اُسے ڈرامے کی ریہرسل کرتے سن کر میں حیران رہ گیا۔ کہ آڈیشن میں فیل ہونے کے بعد ڈرامے میں کام۔ ریڈیو کا سہارا ملتے ہی وہ اسٹیج پر آ گئی۔ اور اپنی پہلی پرفارمنس پر کامیاب ٹھہری۔ یہ کامیابی اس کے خوبصورت چہرے اور جسم کی مرہونِ منت تھی۔

ایک دن میں کینٹین میں چائے پی رہا تھا کہ وہ چلی آئی اور آتے ہی میری ٹیبل پر آ بیٹھی۔ ساتھ ہی اس نے چائے اور کیک پیس کا آڈر دے دیا میں چاہتا تھا کہ اسے کہہ دوں کہ وہ اچھے گھر کی لڑکی ہے۔ ان چکروں سے نکل آئے لیکن میں کہہ نہ سکا۔

اُس نے جب باتیں شروع کیں۔ تو میں بھول ہی گیا۔ کہ میں ریڈیو سے اپنا چیک وصول کرنے آیا تھا۔ باتوں کے فن میں وہ ماہر تھی۔ اور اُس نے مجھے باور کروا دیا، کہ ابھی تک اس کا انٹرویو نہ کر کے میں نے صحافتی بد دیانتی کی ہے۔ دوسرے دن میں اس کا انٹرویو لینے اس کے ڈرائنگ روم میں موجود تھا۔

تصاویر بناتے وقت میں نے اسے ذرا سا نیوڈ ایکشن بنانے کے لیے کہا۔ اور یہ کہہ کر میں ڈر گیا۔ کہ کہیں اس نے بُرا نہ مان لیا ہو۔ لیکن اس نے مسکراتے ہوئے میرے بتائے پوز میں کچھ اور اضافہ کر دیا۔

جب تک تصاویر پروسیس ہو کر آئیں انٹرویو تیار ہو گیا۔ وہ میرے اتنے قریب آ گئی کہ میں ہواؤں میں اُڑنے لگا۔ دفتر میں اور دفتر کے باہر اس کے قرب کی خوشبو مجھے اپنے حصار میں لیے رکھتی۔

جس دن اُس کا انٹرویو چھپا۔ میں بے حد خوش تھا۔ مجھے دفتر اور باہر سراہا گیا، جتنی محنت سے میں نے انٹرویو لکھا تھا کیمرہ اس سے بھی کئی ہاتھ آگے نکل گیا تھا۔ شاید کیمرے کی حساس آنکھ وہ ہی کچھ دیکھتی ہے۔ وہ ہی کچھ محسوس کرتی ہے۔ جو تصویر بنانے والے کے

من میں کیا ہوتا ہے کیمرے نے میرے دل میں چھپی یمی کو سلولائیڈ پر منتقل کر دیا تھا۔ میں سارا دن اسی نشے اور سرور میں رہا۔ میں نشے میں مونا لیزا کا خالق رہا ہو گا۔

یار دوستوں سے داد پانے کے بعد میں یمی کے ہاں چل دیا۔ یہ سوچے بغیر کہ اسے فون پر میرا شکریہ ادا کرنا چاہیے تھا۔ اس کے گھر میں داخل ہوتے ہی مجھے جھٹکا سا لگا۔ وہاں باقاعدہ پارٹی چل رہی تھی۔ جس میں ریڈیو۔ ٹی۔ وی اور اسٹیج کے پروڈیوسرز اور آرٹسٹ جمع تھے۔ مجھے لگا جیسے میں وہاں بن بلایا مہمان ہوں۔ میں یہ دیکھ کر واپس مڑنے لگا تو یمی نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ”بھئی یہ سب تو انٹرویو چھپنے کا ٹریٹ لینے آئے ہیں۔ تمھیں سب کے ساتھ تھوڑا اشاال کرنا تھا۔ ہم اور تم۔“ اس کا ادھورا جملہ اس کی آنکھوں کی شوخی نے مکمل کر دیا۔ اور میں اسی نشے میں گم واپس چلا آیا۔ کتنے ہی دن ’ہم اور تم‘ والی دعوت کا انتظار کرتا رہا۔ لیکن کبھی اسے کسی پارٹی میں جانا ہوتا۔ اور کبھی ریہرسل کے لیے۔ میں دل میں ہزاروں گلے لیے ملتا۔ وہ اتنی وارفتگی سے ملتی کہ دل میں اس کی بے وفائی کا بوجھ کم ہو جاتا۔ سارے گلے ڈھل جاتے۔ اور ساتھ ہی وہ مجھے کسی نئے کانٹریکٹ کسی نئے ایڈس کا کام دلوانے کے لیے کہہ دیتی۔ اور میں اس کے حکم پر کبھی چاپلوسی سے۔ کبھی سفارش سے۔ کبھی بلیک میلنگ کے ہتھکنڈے سے اس کے لیے کام لے کر ہی واپس آتا۔

اس کے اس رویّے کے باوجود میں پیچھے نہ ہٹ سکتا۔ اس کو خوش کرنے کے لیے۔ میں ٹی۔ وی۔ ریڈیو کے پروڈیوسرز کے پیچھے پیچھے پھرتا ایڈورٹائزنگ ایجنسی سے کانٹریکٹ لے کر آتا ہر پراجکٹ کے ملنے پر اس کا رویّہ مختلف ہوتا۔ کبھی بڑے سے بڑے کام کا سن کر وہ صرف مسکرا دیتی۔ اور کبھی چھوٹے سے ایڈ میں کام ملنے پر خوشی سے نہال ہو جاتی۔ اور خود ہی کہتی ”تم بھی میرے بارے میں کیا سوچتے ہوگے میں بھی عجیب ہوں۔ خوش ہوں تو ایک پھول پا کر مہک اٹھتی ہوں۔ اور کبھی کائنات کی ساری دولت بھی مجھے خوش نہیں کرتی“۔

میں اس کے اس پاگل پن کو بھی اپنے اندر سمونے کی کوشش کرتا۔ کبھی وہ وارفتگی میں مجھ سے یوں لپٹ جاتی، جیسے میرے بغیر ایک پل نہیں رہ سکتی۔ وہ میری پسلی سے برآمد ہوتی ہے۔ میرے وجود کا حصّہ ہے۔ اور کبھی یوں بیگانہ ہو جاتی جیسے ہمارے درمیان صدیوں کا زمانہ حائل رہا ہو۔

میری سالگرہ کا دن وہ بے حد اہتمام سے مناتی۔ اپنے ہاتھوں سے میرے لیے کھانا تیار کرتی۔ میری پسند کا لباس پہنتی اور مجھے اس کی پسند کا سوٹ پہننا پڑتا۔ آج میں بھی اس کے پسندیدہ براؤن سوٹ میں ملبوس کیک کاٹ رہا تھا۔ وہ میرے شانوں پر جھکی تھی۔ اس کے قرب کی خوشبو مجھے پاگل بنا رہی تھی۔ کہ میرے ہونٹوں پر جھکتے ہوئے وہ کہنے لگی۔ آج اسے سیٹھ عارف کے ساتھ رات گزارنی ہے۔ کیونکہ وہ اسے لاکھوں کا بزنس دلا رہا ہے۔ میں نے اسے لعن طعن کیا۔ اسے گھٹیا پست اور جانے کیا کیا کہہ دیا۔ لیکن وہ چلی گئی۔

اس دن میں نے عہد کر لیا۔ کہ اب اسے کبھی نہیں ملوں گا۔ لیکن صبح جب وہ مجھ سے وارفتگی سے ملی تو میں رات کا غصّہ بھول گیا۔ مجھے اس کی مجبوری سے سمجھوتہ کرنا پڑتا۔

سیٹھ عارف سے اس کی ملاقاتیں بڑھتیں گئیں۔ اور مجھ سے ملنے کا سلسلہ تقریباً ختم ہو گیا۔ کئی کئی روز اس کو دیکھے بغیر گزر جاتے پھر اچانک وہ آن ٹپکتی۔ اور میں اس کی بے اعتنائی اور بے نیازی کو بھول کر اس کی راہ میں بچھ جاتا۔ اسے جب بھی کسی کام میں ضرورت محسوس ہوتی۔ بغیر تکلف کے یوں کہہ دیتی۔ جیسے اسے یقین ہو۔ کہ میں صرف اور صرف اس کے حکم کا منتظر ہوں۔ بغاوت کی لہر میرے سینے میں اٹھتی لیکن مجھے اس کا کام کرنا پڑتا۔

یوں ہی دن گزرتے گئے۔ اب ہم زندگی کے اس دور میں داخل ہو چکے تھے جہاں جوانی اور بڑھاپے کی سرحدیں ملتی ہیں۔ بالوں میں سپیدی آتے ہی جذبات و احساسات میں برف اور آگ کا سنگم ہونے لگتا ہے۔ جوانی کی شوریدہ سری کے ختم ہوتے ہی من پسند چیزوں کے پانے اور اپنانے کی خواہش جنون بن جاتی ہے۔ جسم کی آگ بھجانے کے لیے گرائی ہین کی نہیں بلکہ من پسند ساتھی کی ضرورت رہ جاتی ہے۔ جسم کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے خوبصورت چہرہ اور خوبصورت ذہن ضرورت بن جاتا ہے۔ اور میں تو بہت پہلے سے اس کے در پر ماتھا ٹیک چکا تھا۔ وہ میری اور میں اس کی ضرورت بن چکا تھا۔

یمی کا کاروبار پھیلتا جا رہا تھا۔ اب وہ کسی ایسی لڑکی کی تلاش میں تھی جو اسی کے انداز میں اس کی بزنس پارٹنر بن سکے۔ بہت سوچ بچار کے بعد شمائلہ کا نام ہم دونوں نے مل کر منتخب کیا۔ شمائلہ آجکل اس کے بہت سے ADDS میں ماڈل کے طور پر آ رہی تھی۔ وہ جس چیز کے ایڈ میں بھی کام کرتی وہ چیز راتوں رات مقبول ہو جاتی۔ ابھی تک وہ یمی کے پاس کانٹریکٹ پر کام کر رہی تھی۔ جب میں نے یمی سے کہا کہ وہ اسے ماہانہ تنخواہ پر یا بزنس پارٹنر کے طور پر رکھ لے۔ تو یمی کو یہ آئیڈیا اچھا لگا۔ وہ بتانے لگی۔ تم شمائلہ کی ماں کو جانتے ہو۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا بھئی میں صحافی ہوں۔ تم سے زیادہ اس کے بارے میں معلومات رکھتا ہوں۔ ہیرا منڈی میں کوئی بھی طوائف اس کے حکم کے بغیر گا نہیں سکتی۔ بہت نکھتے دار طوائف ہے۔ شمائلہ کو اس نے بی۔ اے تک تعلیم دلوائی، تاکہ نئے انداز سیکھ سکے۔ لیکن اس نے ماں کی گدی پر بیٹھنے کی بجائے ڈگری کو فوقیت دی۔ اور جب اس نے ماڈلنگ کی طرف دھیان دیا تو ماں نے اس کی ضد مان ہی لی۔

یمی شمائلہ کے کام کرنے کے انداز سے بے حد مطمئن تھی۔ وہ آفس میں بے حد محنت سے کام کرنے لگی۔ شمائلہ میں خاندانی نفاست کے طور و انداز کے ساتھ ساتھ فنکارانہ ذہن بھی موجود تھا۔ اس کا ذوق اور محنت یمی کے لیے بے حد فائدہ مند ثابت ہوئے۔ شمائلہ نے اخبارات کے لیے

(باقی ۱۹۶ پر)

فلسفۂ اخلاق

احمد صغیر صدیقی

۴/۲۰۔ایچ ، ملیر کالونی۔ کراچی (پاکستان)

بس میں کچھ اتنا زیادہ ہجوم نہ تھا جس وقت وہ نوجوان آدمی اندر داخل ہوا جس کے ہاتھ میں ایک موٹی سی کتاب دبی ہوئی تھی۔ اس نے اندر پہنچ کر اِدھر اُدھر نظریں ڈالیں۔ بس کی تمام نشستیں بھری ہوئی تھیں اور درمیانی راستے میں کئی ایک اسٹینڈنگ پسنجر کھڑے ہوئے تھے۔ آدمی نے دروازے سے ذرا پیچھے ہٹ کر بس کے عقبی حصے میں لگی ہوئی ایک سائڈ سیٹ کو تاکا اور پھر اسی سے جڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اپنی کتاب اس نے بغل میں دبالی تھی۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے بس کی چھت سے لگی ہوئی راڈ کو پکڑ لیا۔

جس سیٹ سے اس نے اپنی دائیں ران اور کولھے کو ٹکا رکھا تھا اس پر بیٹھا مسافر کچھ دیر تک تو خاموش رہا پھر اس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ اور قدرے آگے کی جانب جھک گیا کھڑے ہوئے مسافر نے موقع غنیمت دیکھ کر اپنے جسم کو مزید سہولت کے ساتھ سیٹ کے کونے سے قریب کر لیا۔ سیٹ پر بیٹھا ہوا شخص کچھ دیر اپنی جھکی ہوئی پوزیشن میں رہا پھر اس نے ناگواری سے سر اٹھا کر اپنے بالکل قریب کھڑے جوان آدمی کو گھورا اور بولا۔

"جناب۔ آپ تھوڑا سا سیدھے ہو کر کھڑے ہوں۔ مجھے بیٹھنے میں خاصی دشواری ہو رہی ہے۔" یہ ایک ادھیڑ عمر کا، گنجے سر والا کاروباری سا آدمی تھا۔ اس کے ماتھے پر پسینہ پھیلا ہوا تھا۔

کھڑے ہوئے مسافر نے جواباً چند لمحوں تک اپنے مخاطب کی سمت دیکھا پھر بولا۔

"کمال کرتے ہو۔ میں کھڑا ہوا ہوں اور تم بیٹھے ہو۔ پھر بھی دشواری میرے بجائے تمھیں ہو رہی ہے۔"

بیٹھے ہوئے مسافر نے نرم لہجے میں کہا۔ "آپ کی سائڈ میں خاصی جگہ خالی ہے۔ پھر آپ نے سارا بوجھ میری سیٹ کے بیک پر ڈال رکھا ہے۔"

"میرا بوجھ سیٹ کی بیک پر ہے۔ تمھارے اوپر تو نہیں ہے۔" کھڑے ہوئے آدمی نے تلخی سے کہا۔

"لیکن۔ ذرا سا ہٹنے میں حرج کیا ہے آخر؟"

"کیا۔ معاملہ کیا ہے؟" سیٹ والے کے پہلو والے آدمی نے دریافت کیا۔

"دیکھیے نا" سیٹ والے نے شکایتاً کہا۔ "بالکل میرے اوپر ہی کھڑے ہوئے ہیں میں تو سیدھا ہو کر بیٹھ ہی نہیں سکتا۔"

"بیٹھے ہو ہو نا۔ اس لیے دوسرے کی تکلیف کا کوئی احساس نہیں تمھیں،" جوان آدمی نے طنز کیا۔

"احساس تم کو نہیں۔ سر پر چڑھے رہے ہو اور پھر بحث بھی کر رہے ہو۔" بھنّا کر بیٹھے ہوئے مسافر نے کہا۔

"اچھا بس بک بک بند کرو۔" کھڑا ہوا آدمی یکایک غصّے میں آنے لگا۔

"ٹھیک ہے تم ذرا ہٹ کر کھڑے ہو۔" بیٹھے ہوئے شخص نے جان بوجھ کر کرسی سے پشت نکالنے کی سعی کرتے ہوئے بولا۔

"میں تو نہیں ہٹوں گا" کھڑے ہوئے مسافر نے ڈھٹائی سے کہا۔

"جو کچھ کرنا ہو کر لو"

"یار تم عجیب آدمی ہو"

"عجیب تم ہو۔ تمھارا باپ ہے" کھڑے ہوئے آدمی نے آنکھیں نکال کر اسے گھورا۔ وہ متوسط قد و قامت کا آدمی تھا۔ ستائیس اٹھائیس سال کا۔ اس کے بال قدرے سنہرے تھے اور ہونٹوں پر گنجان مونچھیں تھیں اب یہ مونچھیں بری طرح پھڑک رہی تھیں۔

"دیکھو زبان سنبھال کر بات کرو مجھے"

"ورنہ کیا کر لو گے؟"

"معلوم ہوتا ہے تمھارا دماغ خراب ہے" بیٹھے ہوئے شخص نے مایوسی سے کہا۔

"کیا ہے۔ کیا کہتا ہے... ؟" کھڑے ہوئے آدمی نے چیخ کر کہا۔ اس سے قبل کہ دوسرے متوجہ لوگ معاملے میں کچھ حصہ لے سکیں، پھر اچانک ہی اُس نے اپنے ہاتھ میں دبی ہوئی مجلد کتاب کو سیٹ پر بیٹھے ہوئے آدمی کے سر پر کسی ہتھوڑے کی طرح دے مارا۔۔۔

بس میں دوسرے لمحے ایک طوفانِ بدتمیزی برپا ہو گیا۔

تھانے میں ڈیوٹی کانسٹبل نے فساد کے ملزم کو حوالات میں ڈالنے کے بعد انچارج کے آفس کا رخ کیا۔

"تم نے زخمی مسافر کو ہسپتال بھجوا دیا؟"

"جی جناب"

"اور ملزم؟"

"وہ حوالات میں ہے"

"تلاشی لی اُس کی؟" انچارج نے دریافت کیا۔

"جی سر۔ اُس کے پاس کچھ نہیں۔"

"کوئی ہتھیار وغیرہ؟"

"جی نہیں۔" کانسٹبل نے سوچتے ہوئے کہا۔ "اس کے پاس البتہ ایک موٹی سی کتاب ضرور ہے"

"کتاب؟"

"جی ہاں" کانسٹبل نے کہا۔ "ملزم نے اسی کتاب سے ساتھی مسافر کے سر پر ضرب لگائی تھی۔ اس کتاب کا نام "فلسفۂ اخلاق" ہے" ●●

(۱۹۲ سے آگے "تنہا تنہا" افسانے کا بقیہ)

خوش رہا کرو گی۔ مجھے تمہاری ویران آنکھیں یہاں کھینچ لائی ہیں۔ اب ہم اک ہو جائیں گے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔

وہ لمبے لمبے قدم اٹھاتا ہوا دوکان کے دروازے تک پہونچ گیا۔ اس لمحے ارمانہ ہاتھ ہلاتے ہوئے کسی کو کچھ بتا رہی تھی۔ دروازے سے نکلتے ہوئے وہ عامر سے بری طرح ٹکرا گئی۔

"اوہ ــــ" اس نے جھنجھلا کر اوپر کی طرف دیکھا۔

"رائٹر ـــ" اس نے حیرت سے عامر کو دیکھا اور تھوڑا سا مسکرا دی۔

عامر کا جی چاہا وہ چیخے۔ "دیکھو ارمانہ۔ کیسا اتفاق ہے۔ ہم کتنی مدت بعد ملے ہیں۔"

"رائٹر... سو... سوری" ارمانہ نے معذرت کی "خوش رہو۔ جہاں بھی رہو" اس نے بے تاثر لہجے میں کہا اور باہر نکل گئی۔

عامر کا دل چاہا وہ اپنا دامن ارمانہ کے سامنے پھیلا دے کشکول کی طرح اور التجا کرے "خدا کے لیے ارمانہ بیگم مجھے مری بھولی بھالی اداس، دیوانی، جھلّی ارمانہ لوٹا دو۔ میں نہ جانتے اسے کہاں بھول آیا ہوں۔ مجھے اس لڑکی سے کس قدر محبت ہے تم اس کا اندازہ نہیں کر سکتیں۔

لیکن ارمانہ اپنی مسکراہٹیں اور خوشیاں سمیٹے سرخ رنگ کی ماروتی کی طرف بڑھ گئی تھی۔ جہاں فرنٹ سیٹ پر اک معصوم بچہ اور اسٹیرنگ پر اک ہینڈسم سا نوجوان بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ ●●

(۱۹۴ سے آگے "اسٹینڈرڈ" افسانے کا بقیہ)

جس انداز کے اشتہارات بنانے شروع کیے، وہ اسٹائل بے حد پسند کیا جانے لگا۔ جلد ہی شمائلہ یمی کی ضرورت بن گئی، وہ کوئی کام بھی اس کی مدد کے بغیر پورا نہ کر سکتی۔

"گروپ آف کمپنیز نے جب شہر میں نیا دفتر کھولا۔ تو یمی کو امید تھی کہ اس کمپنی کا بزنس بھی اُسے ہی ملے گا۔ کہ یہ ادارہ بھی شیخ آصف کا ہی ذیلی دفتر تھا۔ لیکن جب اس نے سنا کہ سیٹھ عارف کا بیٹا یہ کانٹریکٹ کسی اور کو دینے والا ہے۔ تو وہ بے حد ہراساں ہوئی۔ ہم دونوں نے مل کر بے حد بھاگ دوڑ کی لیکن نتیجہ صفر رہا۔ آخر بہت کوشش کے بعد معلوم ہوا کہ سیٹھ عارف کا بیٹا ارسلان کسی زمانے میں شمائلہ کا بے حد گرویدہ رہا ہے۔ اور بہت عرصے تک اس کی ماں کے پاس چکر لگاتا رہا ہے۔

یہ خبر سن کر میں اور یمی بے حد خوش ہوئے کہ شمائلہ کے ذریعے یہ کانٹریکٹ مل کر ہی رہے گا۔ یمی کہنے لگی کہ اب تو یہ کانٹریکٹ اپنی جیب ہی میں سمجھو۔

اس دن شمائلہ جب نئے اشتہار کی ڈمی دکھلانے کے لیے لائی تو یمی نے اسے کافی پینے کے لیے بٹھا لیا۔ کافی پینے کے دوران یمی نے تفصیل سے سارا معاملہ شمائلہ کے سامنے پیش کیا۔ اور کہنے لگی، کہ تم آج رات ارسلان کو دعوت پر مدعو کر لو۔

شمائلہ نے یہ سن کر کافی کا مگ رکھا، اور بیگ اٹھاتے ہوئے کہنے لگی۔ "میڈم مجھے معاف رکھیے۔ بے شک میں طوائف زادی ہوں۔ لیکن میرا اپنا ایک اسٹینڈرڈ ہے۔" یہ کہہ کر وہ آفس سے نکل گئی۔ ●●

اجازت

نیلم صدیقی

۳۰-ای-I گلبرگ ۳ لاہور، پاکستان

دونوں میں دوستی ناگزیر تھی۔
دونوں جوان تھے خوبرو تھے۔ بلا کے ذہین اور ایک سی سوچ رکھنے والے۔ گھنٹوں گپ شپ کرنے، بحثیں کرتے اور فلسفے جھاڑتے رہتے تھے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ ایک دوسرے کی ذات سے Threatened نہیں محسوس کرتے تھے بلکہ ایک دوسرے کو جگہ دیتے تھے۔ اکاموڈیٹ کرتے تھے۔ سانس لینے دیتے تھے۔ ایک دوسرے کو انجوائے کرتے تھے وہ آج کی نوجوان نسل کے دو نمائندے تھے۔
چائنیز رستوران میں چکن کارن سوپ کے دو پیالے ان کے سامنے رکھے تھے۔ لڑکی گرم گرم سوپ میں سرکہ اور ہری مرچیں ملانے لگی۔
"تم نے ایک بات پہ غور کیا کبھی؟" لڑکے نے سوپ کے پیالے سے اٹھتے ہوئے دھوئیں کی اوٹ سے لڑکی کو دیکھتے ہوئے پوچھا!
"کیا؟" لڑکی نے سوپ پینا شروع کر دیا۔
"ہماری بہت سی عادتیں اور خیالات ملتے ہیں؟"
"شاید ہم پچھلے جنم میں ہمسائے رہے ہوں گے؟" لڑکی نے ہنس کر جواب دیا۔
"ہاں ہم یقیناً پچھلے جنم میں "ہم سایہ" رہے ہوں گے۔
لڑکے نے ذو معنی انداز میں کر کے فقرہ اسی کی طرف اچھال دیا۔
"ارے!" لڑکی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ وہ اس کی لفظوں والی اس ذو معنی بنا دینے کی قابلیت سے بہت متاثر ہوئی تھی دراصل وہ اکثر ایسا ہی کیا کرتا تھا۔
"کمال کرتے ہو تم۔ بھئی میرا مطلب ہے ہمسائے یعنی جو ایک دوسرے سے ادھار چیزیں مانگا کرتے ہیں؟" وہ اس کی بات کو مذاق میں اڑانے پہ تلی ہوئی تھی۔
"ہاں۔ ہم۔ سائے۔ جن کا ساتھ ساتھ قدم ملا کر چلنا ہوتا ہے۔ آئی ایگری"۔
لڑکی شرمائے سی لگی حالانکہ وہ ہرگز شرمیلی نہیں تھی۔ بہت پر اعتماد اور اسٹریٹ فارورڈ صاف صاف کھل کر بات کرتی تھی۔ روایات سے بغاوت کرتی تھی۔ اپنے کو بہت ماڈرن سمجھتی تھی۔
"یہ تم مجھے ایسی لال لال آنکھوں سے کیوں دیکھ رہے ہو۔ ہٹاؤ اپنی آنکھیں۔ مجھے نروس کر رہی ہیں" اس نے لڑکے کو ڈانٹا۔
وہ خاموش بیٹھا مسکراتا رہا۔ اسے دیکھتا رہا۔ اس کا سوپ اس کے سامنے رکھا ٹھنڈا ہوتا رہا۔
"ارے کہیں تم مجھ پہ عاشق تو نہیں ہو گئے" لڑکی نے شوخ ہو کر اسے مذاقاً چھیڑا۔
"ہاں!" لڑکے نے بڑے آرام سے جواب دیا۔ اور اس کے متحیر چہرے پہ سے نظریں نہ ہٹانے کا فیصلہ قائم رکھا۔ اس نے جس طریقے سے ہاں کہا تھا، اس کی گمبھیرتا کا احساس لڑکی کو فوراً ہو گیا تھا۔ یوں لگنے لگا جیسے چاروں طرف سے "ہاں"۔ ہاں۔ ہاں، کی آوازیں آنا شروع ہو گئی ہوں۔ جیسے وہ پرسکون جھیل کے کنارے بیٹھی ہو اور "ہاں" کا ایک بڑا سا کنکر بھنور میں گرداب بنا کر غائب ہو گیا ہو۔ نیچے تہہ میں جا کر بیٹھ گیا ہو۔ اس کی ہاں سینے میں کھب گئی تھی۔
"نہیں نہیں!" یہ غلط بات ہے۔ یہ نہیں ہوگا۔ یہ عشق وشق بیچ میں کہاں سے آگیا۔ مجھے تو تمہاری دوستی بہت عزیز ہے۔ میں اس کی بلی نہیں چڑھا سکتی مجھے تم بہت عزیز ہو" وہ تقریر کرنے لگی۔ اس کو تقریر کرنے کی بہت عادت تھی۔
"تم جو چاہتی ہو کرو۔ مجھے کیا۔ تم نہ کرو عشق۔ میں تم سے کرتا ہوں۔ یہ میرا مسئلہ ہے!" لڑکے نے یوں تحمل سے بات کی جیسے وہ دونوں کورس کے نوٹس کا تبادلہ کر رہے ہوں۔
لیکن پھر یہ کیسے چلے گا۔ کیا ہوگا۔ مجھے بھی محبت ہو جائے گی نا۔ میں اس اولڈ فیشن۔ آؤٹ ڈیٹیڈ جذبے کا روگ نہیں پال سکتی۔ مجھے اور

کئی بہت سے کام ہیں۔ تم سمجھتے کیوں نہیں"۔ لڑکی بے بسی سے بولی۔

"دیکھو روپ۔ گھبراؤ مت۔ قدرت کے راستے میں مت آؤ جو ہونا ہے ہو کر رہے گا"۔

"ارے اس نے تو مجھے پیار سے روپ کہہ ڈالا۔ روپی دل میں ڈر سی گئی یہ تو سچ مچ مجھ سے محبت کرنے لگا ہے۔ اب کیا ہوگا"۔

"میرا ایک مسئلہ ہے رضی"۔ اب وہ خود حیران ہو گئی کیونکہ اس نے آج پہلی بار رضا کو رضی کہہ ڈالا تھا۔

"دیکھا یہی میرا مسئلہ ہے۔ میں اسی بات سے ڈرتی تھی!"

"کیا؟ کس بات سے؟"

میرا جذبہ بہت شدید ہوتا ہے۔ ایک بار مجھے پہلے عشق ہوا تھا۔ میں ہیڈ اوور ہیلز Head over heels عشق میں گرفتار ہو جاتی ہوں۔ نکمی، بیکار، فضول، پاگل، احمق، لوز لیسوا اور نہ جانے کیا کیا بن جاتی ہوں۔ میں اپنے آپ سے ڈرتی ہوں۔ مجھے جب محبت ہوتی ہے تو میں اس پہ نہیں بلکہ محبت مجھ پہ غلبہ پالیتی ہے مجھے ہضم کر لیتی ہے۔ میں کسی کے آگے اور کسی جذبہ کے آگے کمزور نہیں پڑنا چاہتی۔ جھکنا نہیں چاہتی"۔ محکوم نہیں بننا چاہتی۔ لیکن محبت مجھے مفلوج کر دیتی ہے"۔ روپی کی تقریر جاری تھی۔

رضا نے روپی کی خوبصورت نیل پالش لگی چھوٹی انگلی کو ٹیبل کے نیچے سے ہاتھ لگا کر چھولیا۔ وہ دم بخود رہ گئی۔ سن ہو گئی۔ خاموش ہو گئی۔ اسے اچھا لگا تھا۔

اب دونوں میں محبت ناگزیر تھی۔

دونوں محبت کی پھوار میں بھیگتے رہتے زیادہ تر وقت ساتھ گذارتے تھے۔ ہنستے کھیلتے سیر کرتے خوش خوش رہتے تھے۔ کبھی کبھار روپی رضا سے لڑ پڑتی روٹھ جاتی اور وہ اسے اگر منانے میں دیر لگاتا تو خود ہی سامنے آکر چوکڑی مار کے بیٹھ جاتی اور اسے آرڈر دیتی کہ مجھے مناؤ مگر روپی محسوس کر رہی تھی کہ اس کی پیشین گوئی درست ثابت ہو رہی تھی۔ وہ رضا کی ذات میں گم ہوتی چلی جا رہی تھی۔ اسے اور کچھ سوجھتا ہی نہ تھا۔

ہر سمے رضا کے بارے میں سوچتی رہتی۔ تصورات میں کھوئی رہتی۔ اس کے کام ادھورے رہنے لگے تھے وہ کئی قسم کی سوشل ورکر اور عورتوں کے حقوق کے بارے میں جدوجہد کرنے والی تنظیموں کی رکن تھی۔ بہت سرگرم تھی میٹنگوں میں جاتی تھی۔ اب وہ بہ مشکل اپنے کالج کی اسائنمنٹس ہی ختم کر سکتی تھی۔

راتوں کو نیند بھی مشکل سے ہی آتی تھی۔

بڑی مصیبت ہو گئی تھی اور اسی مصیبت سے وہ ڈرتی تھی۔

کبھی سوچتی۔

نہ جانے وہ اس وقت کیا کر رہا ہوگا۔ شاید کلاس اٹینڈ کر رہا ہو۔ شاید کسی دوست کے ساتھ فلم دیکھنے چلا گیا ہو۔ اچھا مجھے بغیر بتائے۔ نہیں شاید سو رہا ہو۔ یا شاید بارش کے پہلے قطروں میں بھیگنے کیلئے اکیلا سڑک پہ چلتا چلا جا رہا ہو۔ اسے بارش بہت فینسی نیٹ کرتی تھی اور رضا کو بھی بارش سے عشق تھا۔

پارک میں شام گہری ہو چکی تھی۔ وہ دونوں بنچ پہ بیٹھے تھے۔ ہلکی ہلکی ٹھنڈ سی محسوس ہو رہی تھی۔ دونوں قریب ہو گئے۔ روپی نے رضا کے ہاتھ حسب عادت اپنے ہاتھوں میں لے رکھے تھے۔ اسے ہاتھ پکڑنا بہت اچھا لگتا تھا۔ چودھویں پندرھویں کا چاند پوری آب و تاب کے ساتھ طلوع ہو چکا تھا۔ لیکن اس کے آگے ایک بڑے سے گھنے درخت نے بازو پھیلا رکھے تھے۔ جیسے چاند سے حسن کی بھیک مانگ رہا ہو تاحول کے جادو میں وہ دونوں نہائے چلے جا رہے تھے خوش تھے۔

رضا نے حسب عادت جیب سے دو جوس کے چھوٹے چھوٹے ڈبے نکالے۔ وہ ہمیشہ دونوں کے پینے کے لیے جوس لایا کرتا تھا۔ لیکن وہ پیتے ایک ہی ڈبے اور ایک ہی سٹرا سے تھے۔ پہلے ایک ڈبہ باری باری چسکے لے کر ختم کرتے پھر دوسرا۔ یہ بھی ان کی اپنی ہی تخلیق کردہ ذاتی روایات میں سے ایک روایت تھی۔ جب سے ان کے درمیان محبت کا تناور جذبہ اور رشتہ قائم ہوا تھا انہوں نے ایک پلیٹ میں کھایا اور ایک گلاس سے پیا تھا۔

یہ بات دونوں کو اچھی لگتی تھی۔

"روپ! سردی لگ رہی ہے"۔ رضا نے پیار سے سرگوشی کی۔

روپی نے اس کا ہاتھ زور سے پکڑ لیا یوں جیسے کبھی نہ چھوڑنے کا ارادہ ہو۔

"روپ! ہم دوست ہیں نا۔ ہم ہر بات کھل کر ایک دوسرے سے کہ سکتے ہیں نا؟" رضا نے روپی کی کمر میں ہاتھ ڈال دیے۔

"ہاں" روپی کچھ سہمی سی بیٹھی تھی۔

"تمہیں مجھ پہ۔ میری محبت پہ اعتماد ہے نا، یہ پتہ ہے نا کہ میں صرف تمہیں چاہتا ہوں۔ پچھلی ساری دوستیاں، چاہتیں میں نے تمہاری خاطر چھوڑ دی ہیں۔ ہیں نا؟ پتہ ہے نا؟"

"دوستیاں یا دوستنیاں؟" روبی نے اس کی بغل میں گدگدی کر دی۔

"ہاں ہاں دوستنیاں۔ مانتا ہوں کہ میری تھیں۔ لیکن وہ تو قبول اسلام سے پہلے کا زمانہ تھا روپ چند۔ اب تو میں صرف تمہارا ہوں۔ تم بھی میری ہو نا؟"

"وہ تو ہوں تمہیں پتہ ہے جاناں! کیا شک ہے، اگر کہتے ہو تو چیخ چیخ کر اعلان کردوں کہ مجھے رضی احمد سے عشق ہے لوگو سن لو۔ درختو، پارک کے کوتر۔ چڑیو۔"

روبی اٹھ کر کھڑی ہوگئی اور ہنس ہنس کر سرگوشیوں میں جھوٹ موٹ اعلان کرنے لگی۔

"تم بالکل پگلی ہو۔ بیٹھو ادھر، تمہاری انہی اداؤں پہ تو ہم مرتے ہیں ظالم۔" اب رضی بھی شوخ ہو چلا تھا۔

"اچھا دیکھو میں نے تم سے سنجیدگی سے ایک بات کرنی ہے۔ ہم دونوں بالغ ہیں۔ ذہین ہیں۔ سمجھدار ہیں اپنا اچھا برا خود سوچ سمجھ سکتے ہیں نا۔ اپنے فیصلے خود کرنے کے مختار ہیں نا۔ جدید سوچ رکھتے ہیں نا۔ فرسودہ خیالات کے حامی تو نہیں ہیں نا؟" رضی دلائل دینے لگا۔

"نہیں تو!" روبی نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے سر ہلایا۔

"تو پھر؟"

پھر کیا؟

"سمجھو نا۔ میں تمہیں حاصل کرنا چاہتا ہوں" رضا نے اس لہجے میں کبھی بات نہیں کی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک نیا جذبہ نظر آ رہا تھا۔ شراب سی جھلک رہی تھی۔

"میں چاہتا ہوں، ہم میں کوئی فاصلہ بھی نہ رہے۔"

روبی خود بخود رضا سے چپٹ گئی تھی۔ ہاتھ گیلے سے ہو رہے تھے۔

یکدم وہ اس سے بجلی کے جھٹکے کی طرح علیحدہ ہو گئی۔

"نہیں نہیں جاناں! ایسا نہیں ہو سکتا۔"

"کیوں؟ کیوں نہیں؟ کیا تم اس کی اہمیت سے انکار کر سکتی ہو کیا جسمانی ملاپ کے بغیر عورت مرد کا رشتہ مکمل ہو سکتا ہے کیا کنول کے بغیر تالاب خوبصورت رہ سکتا ہے؟"

رضی بپھر سا گیا تھا۔

"اچھا اچھا چپ ہو جاؤ۔ اس مسئلے پر ہم آرام سے بیٹھ کر Logically, ڈسکس کر لیتے ہیں۔ ہر مسئلے کا حل موجود ہے اس کے مختلف پہلوؤں پہ غور کر لیتے ہیں فوائد و نقصانات پر روشنی ڈال سکتے ہیں۔ اس کو Analise کر لیتے ہیں۔"

"بکواس بند کرو روپ!" رضی نے روبی کے ہونٹوں پہ اپنے ہونٹوں سے کس کر مہر لگا دی۔

روپ کے تن بدن میں انگیٹھیاں سی دہکنے لگیں۔ وہ مٹی کی طرح بھربھری سی ہو کر بھرنے ہی والی تھی کہ اس نے اپنا پرس کھولا۔ اپنا ہیر برش نکالا اور اپنے بکھرے بکھرے بالوں میں کنگھی کرنے لگی۔ وہ اپنی گھبراہٹ ہمیشہ اسی طرح دور کیا کرتی تھی۔

"دیکھو رضی Let is not behave teen ages, مجھے پتہ ہے تم ایک جوان مرد ہو اور تمہاری کچھ Needs, ہیں۔ مگر میں ان کو پورا نہیں کر سکتی۔ مجھے یہ بھی پتہ ہے کہ مجھ سے پہلے تمہارے کچھ لڑکیوں سے جسمانی تعلقات تھے اور تم نے میری وجہ سے ان سب کو چھوڑ رکھا ہے۔ مگر سوری یہ میرا پرابلم نہیں۔ تمہارا ہے۔ تمہاری چوائس ہے۔ میں اس بات کو appreciate, ضرور کرتی ہوں لیکن اس سلسلے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتی۔ میں اس تعلق کے لیے تیار نہیں کیوں کہ میں اس کو اپنے لیے ضروری نہیں سمجھتی۔"

تم صاف صاف کیوں نہیں کہتیں کہ تم اندر سے وہی ڈرپوک روایتی مشرقی سہمی ہوئی لڑکی ہو جو معاشرے مذہب اور روایات کی زنجیریں توڑ نہیں سکتی۔ جو جتنی مرضی ڈگریاں لے لے۔ جتنا مرضی آزادی کے گیت گاتے محکوم اور مظلوم ہی رہی ہے کیوں کہ اسی میں secure محسوس کر سکتی ہے۔ اپنے جذبات کو جھٹلانا، انسانی محسوسات، خواہشات کو دبانا کہاں کا انصاف ہے۔ تم اپنے آپ کو دھوکہ دے رہی ہو۔ تم بھی یہی چاہتی ہو، لیکن تسلیم کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتی۔"

رضی نے مصنوعی غصے سے ہاتھ چھڑانا چاہا لیکن روبی اتنے زور سے پکڑتی تھی کہ اس سے ہاتھ چھڑانا مشکل ہو جاتا تھا۔

"آخر وجہ کیا ہے انکار کی؟" رضا جواب لینے پہ تلا ہوا تھا۔ وجہ۔ بس جو بھی ہے میرے نزدیک اصل محبت جسمانی تعلق نہیں بلکہ Sharing. اور کیمونیکیشن کی ہے۔ اور جنس ایک کھیل نہیں بلکہ گہری کمٹ منٹ ہے دل لگی نہیں دو دلوں کے درمیان کا پل صراط ہے۔ میں اس کی اہمیت سے انکار نہیں کرتی مگر شادی کے بغیر...

روبی کی آدھی بات نے اس کے لبوں پہ ہی دم توڑ دیا۔

"شادی! یہ شادی بیچ میں کہاں سے آ گئی۔ ہم نے تو کبھی شادی وادی کو ڈسکس نہیں کیا۔ شادی تو دو انسانوں کی نہیں بلکہ خوابوں کی خوابوں سے شادی ہوتی ہے۔" رضی بھی کھل کر ہی بات کر رہا تھا۔

میں جانتی ہوں۔ مجھے پتہ ہے۔ میں خود شادی جیسے ناکام institution, کو ریجیکٹ کرتی ہوں۔ جو عورت کو غلام اور مرد کو حاکم بنا دیتا ہے۔ مجھے ابھی اپنے لیے بہت کچھ کرنا ہے۔ اپنے قدموں پہ کھڑا ہونا ہے۔ ابھی زندگی بنانا ہے۔ اپنی self worth, کو ثابت کرنا ہے۔ میں خود شادی وادی کے چکر میں نہیں پڑوں گی۔ اینڈ آف روبی خان نہیں ہونے دوں گی۔" وہ پھر تقریر شروع کر چکی تھی۔

"اچھا دیکھو ایک کام کرتے ہیں۔" اس نے پیار سے رضا کے گھونگھریالے بالوں کا ماتھے پہ آیا ہوا چھلا ہٹاتے ہوئے کہا۔

"میں تمہاری دوست ہوں نا۔ مجھے تم سے پیار ہے نا۔ مجھے تمہارا خیال ہے نا تو ایسا کرتے ہیں۔ ایک سمجھوتہ کرتے ہیں۔ محبت ہم آپس میں کریں گے بدستور۔ عشق تم مجھ سے ہی کرو۔ لیکن اپنی جسمانی ضرورت پورا کرنے کے لیے تم کسی دوسری لڑکی سے وابستہ ہو جاؤ۔ مگر شرط یہ ہوگی کہ وہ رشتہ خالص جسمانی ہوگا۔

اس میں کسی قسم کی جذباتی وابستگی کو دخل نہیں ہوگا۔ روبی نے فیصلہ سنا دیا۔

"لو۔ یہ کیا بات ہوئی"۔ رضا کسی چھوٹے بچے کی طرح پھسپھسانے لگا۔ منہ بسورنے لگا یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔ محبت کسی سے کرو اور وہ، کسی اور سے۔ دیکھو تم ہی مان جاؤ نا۔ مجھے بس تم چاہیے ہو۔ اور کوئی نہیں۔

"میرا جواب نفی میں ہے کتنے الّو ہو تم۔ میری اس سنہری آفر سے فائدہ نہیں اٹھا رہے۔ ارے بے وقوف اتنی انڈر اسٹینڈنگ معشوقہ، عاشقہ اور دوست کہاں ملے گی تمہیں؟

رضی روبی کو بہت دن اپنی بات منوانے کی کوشش کرتا رہا لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ دونوں کے فائنل نزدیک تھے۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ روبی کو ویسے دل میں سو فیصد یقین تھا کہ رضا اس کے پیار کے میٹھے گاڑھے شیرے میں اتنا ڈوب چکا ہے کہ وہ اس کے سوا کسی اور کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ نہیں کر سکتا۔ رسیاں نہیں تڑوا سکتا۔ کسی اور کے نزدیک نہیں جا سکتا۔ اسے رضا پر بہت اعتماد تھا۔ اتنا ہی جتنا اپنے اوپر۔

رضا اپنے دوست شکیل کے آفس اس سے ملنے گیا تو اسے یہ دیکھ کر بہت حیرت ہوئی کہ زبیدہ فائلیں اٹھائے ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جا رہی تھی۔ وہ وہاں ایک سیکریٹری کے فرائض انجام دے رہی تھی۔ زبیدہ اس کی کسی زمانے میں قریبی دوست رہ چکی تھی۔ لیکن پھر سننے میں آیا تھا کہ اس کی شادی ہو گئی اور وہ کراچی جا بسی ہے۔

"زبیدہ تم یہاں اس آفس میں؟" رضا نے اس سے ہیلو کرنے کے بعد پوچھا۔

"میں بس دوبارہ اس شہر میں واپس آ گئی ہوں۔ گھریلو مصائب کی وجہ سے مجھے دوبارہ نوکری کرنا پڑ گئی ہے۔"

"اچھا۔ بہت خوشی ہوئی تم سے مل کر۔ اگر کبھی فارغ ہو تو ملنے آؤ گھر پر۔۔؟" رضا نے ہوا میں تیر چلایا۔

میں تو ابھی فارغ ہونے ہی والی تھی۔ چلیں ابھی چلتے ہیں۔" وہ بھی شاید تنہائی کا شکار تھی رضی کو اس کے ساتھ اپنا پرانا تعلق یاد آ گیا۔ اور پھر روبی کی پیش کردہ آفر اور خوش دلی سے دی ہوئی اجازت بھی۔

گھر پہنچتے ہی زبیدہ نے اپنے جانے پہچانے کمرے کی طرف رخ کیا اور پنکھا چلا کر دوپٹہ اتار پھینکا۔ گرمی سی ہو رہی تھی۔

رضا نے فرج میں سے دو چھوٹے ڈبے جوس کے نکالے۔ ایک زبیدہ کو تھما دیا اور دوسرا خود پینے لگا۔

زبیدہ اپنی شادی کی ناکامی کی دکھ بھری داستان رضا کو سنانے لگی۔ کس طرح اس پہ مصیبتیں ٹوٹیں کیا کیا اس کے ساتھ بیتی وغیرہ وغیرہ۔ وہ بول رہی تھی لیکن وہ سن نہیں رہا تھا۔ اس کو جھروکوں میں سے روپ کی دو بڑی بڑی خوب صورت بھوری آنکھیں تاک جھانک کرتی نظر آ رہی تھیں۔ اس کا بھرا بھرا جسم جسے اس نے صرف محسوس کیا تھا۔ دیکھا نہیں تھا۔ نظر آنے لگا تھا۔ اس کی پتلی پتلی مخروطی انگلیوں والے ہاتھوں کا لمس اپنے ہاتھوں پہ محسوس ہو رہا تھا۔ اس کا کبھی بڑی بوڑھیوں جیسی سیانی باتیں کرنا کبھی بچوں کی طرح روٹھ جانا اور ضد کر کے خود کو منوانا یاد آنے لگا۔ اسے روپ اپنے ارد گرد ایک ہار کی طرح چھائی نظر آنے لگی۔ وہ اس ہار کو توڑنے کی سکت سے محروم تھا۔ وہ ایک انجانے سحر میں قید سا ہوتا چلا جا رہا تھا۔ زبیدہ خاموش ہو چکی تھی اور رضا کو علم بھی نہیں ہو سکا تھا۔ زبیدہ نے اپنے ڈبے سے جوس ختم کر لیا تھا۔ اور اس کی طرف طالب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"چلو تمہیں گھر چھوڑ آؤں' رضا نے کرسی سے اٹھتے ہوئے یک لخت فیصلہ کر لیا۔ زبیدہ حیران حیران سی بستر سے اٹھ گئی۔

روبی کو ڈھونڈنا چنداں مشکل نہ تھا۔ وہ اپنے ڈیپارٹمنٹ کی لائبریری میں اپنے مخصوص گوشے میں کتابوں میں چھپی بیٹھی تھی۔ فائنل میں بہت تھوڑا ٹائم رہ گیا تھا۔ رضا اسے بتانے کے لیے بے تاب تھا۔ احسان جتانے کو بے چین تھا کہ اس نے کتنے سیلف کنٹرول

کا مظاہرہ کیا تھا۔ ایک جوان خوب صورت لڑکی کو چھوئے بغیر گھر سے جانے دیا تھا۔ وہ یہ بھی بتا دینا چاہتا تھا کہ اسے اب یقین ہوگیا ہے کہ وہ روپ کے ساتھ ہی اپنا ہر تعلق ہر بندھن قائم رکھنا چاہتا تھا۔ اسے کسی اور کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ روپ کے لیے انتظار کرنے کا تہیہ کر چکا تھا۔ وہ اس سے کبھی جلدی نہیں کرے گا۔ وہ محبت اور جنس کو الگ الگ خانوں میں نہیں بانٹ سکتا اس کے نزدیک محبت کی تکمیل ہی جنس ہے۔ وہ کسی دوسری کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ اسے روپ ہی ہر صورت میں درکار تھی۔ وہ ایک لمبی تقریر دل ہی دل میں تیار کر چکا تھا۔

ارے جاناں، تم اس وقت!" روپی نے اسے کھڑے دیکھ کر کرسی آفر کی "پڑھ نہیں رہے کیا۔ کہاں پھر رہے ہو مارے مارے۔ شام تک کا انتظار نہیں کر سکے تم"۔ وہ اسے دیکھ کر کھل اٹھی تھی۔ لپک کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"کیا ہوا ایسے کیوں گھور رہے ہو مجھے؟" اس نے بھولپن سے پوچھا۔

"روپ تم نے کہا تھا نا۔ کسی اور کے ساتھ ... تم نے ہی اجازت دی تھی نا..." رضا اٹک اٹک کر بول رہا تھا۔

"اوہ مائی گاڈ! روبی کے دل پہ گھونسا لگا۔ تو یہ خبیث انسان اپنی ہوس پوری کر آیا ہے آج اور مجھ سے شاباش مانگتا ہے شاید۔ روپ کا ہاتھ رضی کے ہاتھ میں سرد ہوگیا بے جان ہوگیا۔ لیکن اس نے بناوٹی تجسس سے Casually پوچھا۔

"اوہ تو پھر کیسا رہا تجربہ؟" جیسے پوچھ رہی ہو ڈارون کے ارتقا کی تھیوری سے تمہیں اتفاق ہے یا اختلاف۔

"سنو تو۔ تمہیں یقین نہیں آئے گا۔" رضی بہت ایکسائیڈ تھا۔

سنا دو یا نہ سناؤ تمہاری مرضی ہے۔" روبی نے کندھے اچکائے۔

میں اسے گھر لے گیا۔ باتیں واتیں کرتے رہے۔ گرمی بہت لگ رہی تھی۔ ویسے بھی وہ مہمان تھی میں نے اسے جوس کا ڈبہ دیا۔ پھر کیا کہا۔ روبی نے بات کاٹ دی۔ تم نے اسے جوس پلایا؟

"ہاں۔ کچھ تو پلانا تھا آخر گرمی تھی۔ کیوں کیا ہوا؟

کتنے دیئے تھے۔؟

دو۔

اور کتنے سٹرا تھے۔

"دو بھئی یہ کیا بکواس ہے۔"

تم دونوں نے کس طرح پیا؟

جوس کو مارو گولی یہ نہیں پوچھو گی کہ آگے کیا ہوا؟

"کس طرح پیا؟" میں پوچھتی ہوں جوس کیسے پیا گیا؟

کیا فضول باتیں کر رہی ہو۔ جوس کا اس قصے سے کیا تعلق ہے؟ رضی جھنجلا گیا۔ عجیب پاگل لڑکی ہو۔ یہ نہیں پوچھتی کہ ہم نے کچھ کیا یا نہیں۔

کیا ہو یا نہ کیا ہو، مجھے اس سے کوئی غرض نہیں"۔ روپ بھی غصے میں تھی"۔ اچھا۔ کوئی غرض نہیں۔ تو سن لو۔ جوس ہم نے ایک ہی ڈبے اور اپنی ہی سٹرا سے پیا تھا۔ بس یہی جاننا چاہتی تھی نا تم"۔ رضی نے خواہ مخواہ ہی جھوٹ بول دیا۔ وہ اس کے لیے اتنی بڑی قربانی دے کر آیا تھا اور اس جھلی لڑکی کو جوس کی پڑی ہوئی تھی۔

روپ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

میں نے تمہیں کسی اور چیز کی اجازت دی تھی۔ intimacy اور Sharing کی اجازت تو نہیں دی تھی۔

●●

صفحہ ۱۸۷ سے آگے افسانہ "ریزہ ریزہ دل" کا بقیہ

اور پھر وہ اس سے مخاطب ہوئی۔

"مسٹر نریندر، ان سے ملیے۔ یہی ہیں مسٹر کمل۔ کمل ناتھ۔ میرے ناتھ! ایک ٹانگ نہ ہونے کے باوجود بزدل نہیں ہیں!"

اسے محسوس ہونے لگا جیسے ایک بار پھر اس ایک لفظ 'بزدل' نے اس کے جسم کا سارا لہو نچوڑ لیا ہو۔ اور اب وہ لڑکھڑا کر گرنے ہی والا ہو۔ وہ خود کو سنبھال بھی نہ پایا تھا کہ کار آگے بڑھ گئی۔

اس کے لاشعور میں وہ ایک لفظ گونجتا رہا۔ بزدل۔ بزدل۔ بزدل!!

●●